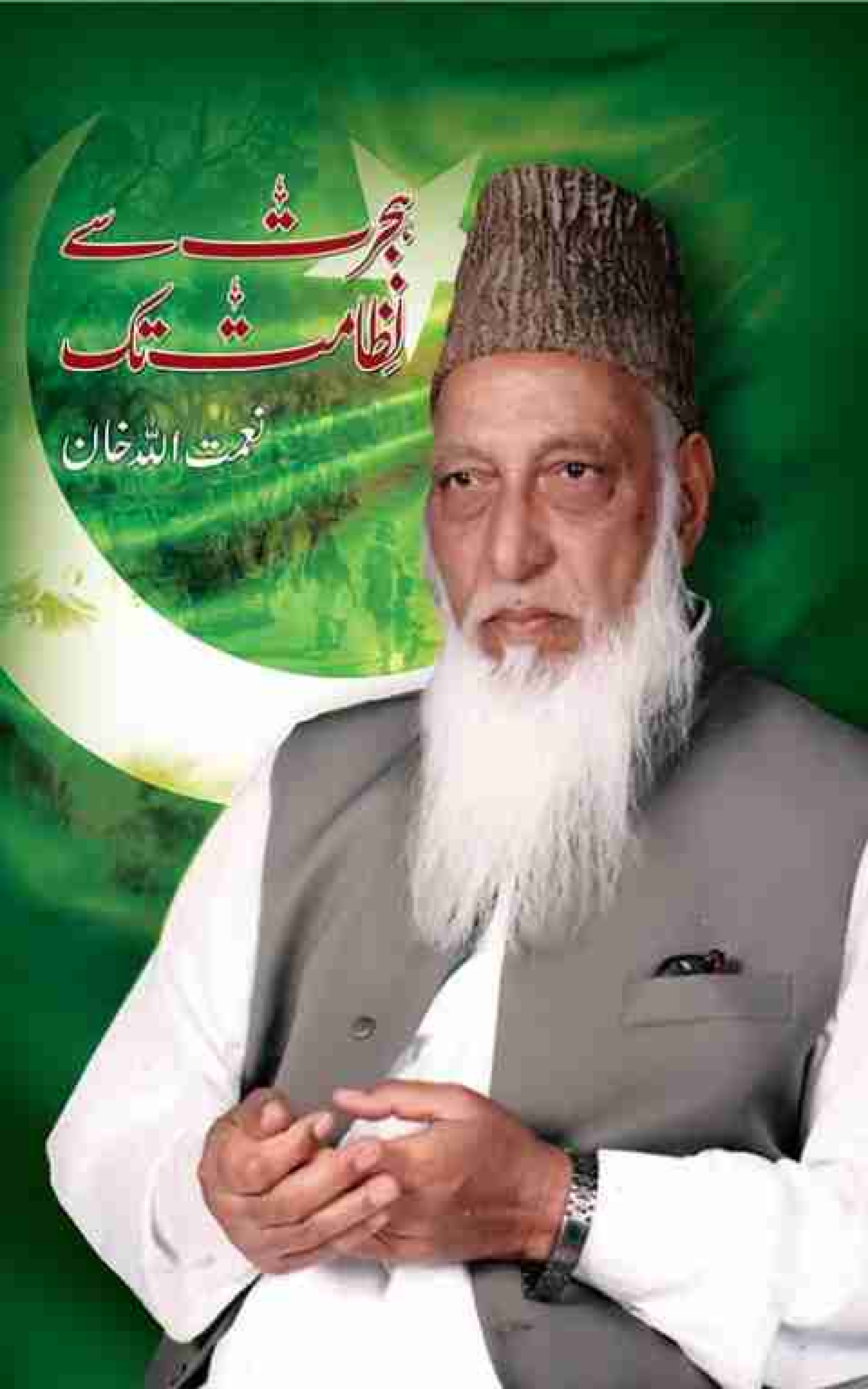

ہجرت سے
نظامت تک
نعمت اللہ خان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

کہو، میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے

سورۃ الانعام ۱۶۲

جماعت اسلامی کا نصب العین

جماعت اسلامی کا نصب العین اور اس کی تمام سعی و جہد کا مقصود عملاً اقامت دین (حکومت الٰہیہ یا اسلامی نظام زندگی کا قیام) اور حقیقتاً رضائے الٰہی اور فلاح اخروی کا حصول ہوگا۔

https://naimatullahkhan.com/

ہجرت سے
نظامت تک

نعمت اللہ خان

فہرست

پیش لفظ	1	نعمت اللہ خان۔۔۔ایک بے مثال انسان!	4
شجر ہائے سایہ دار	7	ہجرت ناگزیر تھی	10
زندگی جد وجہد کا نام ہے	18	وکالت کا پیشہ اپنایا	30
خانہ کعبہ اور مسجد نبوی میں حلف کا اعزاز	36	قفس کی سمت گئے بھی تو اپنی مرضی سے	45
بڑے قد کے اچھے لوگ	51	وہ حادثہ نہیں سانحہ تھا	58
یہ خون خاک نشیناں تھا، رزق خاک ہوا	67	پاکستان اسلامک فرنٹ نئی سوچ کا عنوان تھا	78
آپ ملین مارچ کر سکتے ہیں؟	86	خدمت، رضائے الٰہی کے حصول کے لیے	90
اہل کراچی کا جذبہ اتفاق قابل رشک ہے	98	صحرائے تھر۔ دعوت وخدمت کا استعارہ	108
صلہ شہید کیا ہے تب و تاب جاودانہ	118	دو نئے فلاحی ہسپتالوں کا اضافہ	120
مقامی حکومتوں کا نیا نظام	124	ناظم شہر بحیثیت خادم شہر	132
شہر کو پانی کی فراہمی کا منصوبہ۔ کے تھری	149	تعمیر کراچی پروگرام	161
12 مئی 2004۔ ایک خون آشام دن	180	لائبریری کی تعمیر کی۔ سپورٹس کمپلیکس بن گیا	183
نئی آبادیاں، فنڈز، اسکول اور پبلک ٹرانسپورٹ	186	ماس ٹرانزٹ منصوبہ	197
تعلیم۔ میرٹ پر کوئی سمجھوتا نہیں	202	کراچی انسٹی ٹیوٹ آف ہارٹ ڈیزیز	212
میڈیکل کالج اور ہسپتال، طبی و صحت عامہ کی سہولیات	223	پارک بنائے۔ پارکوں پر قبضہ ختم کیا	228
سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ کراچی	240		

نوٹ: فہرست پر کلک کر کے ابواب تک براہ راست پہنچا جا سکتا ہے، جبکہ ہر صفحے سے فہرست پر جانے کی سہولت موجود ہے۔

پیش لفظ

اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر بجالاتا ہوں جس نے یہ توفیق بخشی کہ والد محترم نعمت اللہ خان صاحب کی یادداشتوں کو کتابی شکل میں آپ کے سامنے پیش کرسکوں۔ معروف صحافی دوستوں نعمان لاری، شبیر سومرو، حیدر شیخ، اسد احمد اور راسعد الدین نے مختلف اخبارات و رسائل کے لیے ان کے انٹرویوز ریکارڈ کیے تھے۔ انہی انٹرویوز کو ٹرانسکرائب کر کے یہ کتاب مرتب کی گئی ہے۔ کتاب میں ان کے بچپن سے لے کر سٹی نظامت تک کے واقعات کہیں تفصیل سے اور کہیں اختصار سے قلم بند کیے گئے ہیں۔ سٹی نظامت کی ذمہ داری سے فراغت کے بعد وہ ملک کے شمالی علاقوں اور آزاد کشمیر میں آنے والے زلزلے کے بعد الخدمت کی امدادی سرگرمیوں کے نگراں رہے اور 2007ء سے 2011ء تک الخدمت فاؤنڈیشن کے مرکزی صدر کے عہدے پر بھی فائز رہے۔

اس کتاب کی اشاعت کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ہماری نئی نسل یہ جان سکے کہ پاکستان محض خطۂ زمین نہیں بلکہ ایک اسلامی نظریاتی ملک ہے، جس کے قیام کے لیے مسلمانانِ برصغیر نے عظیم قربانیاں دی تھیں۔ لاکھوں لوگوں نے اپنے گھربار، جائدادیں اور اپنے سگے رشتے داروں کو چھوڑ کر بے سروسامانی کے عالم میں ہجرت کی تھی، اور ایک نئے ملک میں زندگی کا آغاز بہت سی مشکلات کے ساتھ کیا تھا۔

نئی نسل کو یہ بھی معلوم ہو سکے کہ دنیا میں ترقی کرنے کا کوئی شارٹ کٹ نہیں ہوتا۔ سخت محنت، تعلیم، مستقل مزاجی اور اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم کسی بھی انسان کو ترقی کی شاہراہ پر گامزن

کرنے والے عوامل ہیں۔ نوجوانوں کو اس کتاب کو پڑھ کر یہ بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایک اچھا انسان وہی ہوتا ہے جو والدین، بھائی بہنوں، عزیز و اقارب، اولاد اور معاشرے کے لیے بھلائی کا پیکر ہو۔ جو اپنے حقوق کے ساتھ ساتھ فرائض سے بھی واقف ہو، اور خاص طور پر اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ اچھا رویہ رکھتا ہو۔ نعمت اللہ خان صاحب کی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح ہے جس کا کوئی گوشہ بھی مخفی نہیں ہے۔ انہوں نے ساجی شعبے میں کام کیا تو شفافیت اور بلاتفریق خدمت کی روشن مثالیں پیش کیں۔ وہ میدانِ سیاست میں آئے تو سیاست کو عبادت اور اللہ کے بندوں کی خدمت کا ذریعہ سمجھا، اور اپنے کردار سے ثابت کر دیا کہ سیاست خراب چیز نہیں ہے، اسے غلط مقاصد اور ذاتی مفادات کے لیے استعمال کرنے والے اہلِ سیاست خراب لوگ ہو سکتے ہیں۔ ورنہ اسی شہر کراچی میں پروفیسر غفور احمد، محمود اعظم فاروقی، عبدالستار افغانی اور سید منور حسن جیسے اہلِ سیاست بھی رہے ہیں، جنہوں نے سیاست کو اعتبار بخشا اور ہماری آنے والی نسلوں کو بتایا کہ سیاست برائے خدمت ہونی چاہیے اور ہو سکتی ہے۔ نعمت اللہ خان صاحب کی زندگی میں جس ایک لفظ کی سب سے زیادہ اہمیت رہی وہ دعوتِ دین ہے۔ جب وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی علیہ رحمہ کی کچھ کتب پڑھ کر جماعت اسلامی کے قریب آئے تو انہوں نے فریضۂ اقامتِ دین کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا اور دین کی دعوت کے پھیلاؤ کے لیے اپنے شب و روز ایک کر دیے۔ وہ جماعت اسلامی سے اس طرح منسلک ہوئے کہ رکنیت کا حلف خانہ کعبہ اور مسجدِ نبوی جیسے مقدس ترین مقامات پر لیا، اور زندگی کی آخری سانس تک اس حلف کی پاسداری کی۔

وہ اہلِ کراچی اور اہلِ وطن سے بے لوث محبت کرتے تھے۔ انہوں نے کراچی کی جس طرح خدمت کی اور جس طرح امانت و دیانت کے ساتھ شہر کی نظامت کی ذمہ داری کو ادا کیا، وہ نہ صرف یہ کہ نئی نسل کے لیے مشعلِ راہ ہے بلکہ پورے پاکستان کے اہلِ سیاست کو ان کے

طرزِ عمل کی پیروی کرنی چاہیے۔ نعمت اللہ خان صاحب صرف میرے والد ہی نہیں تھے، وہ شہر کراچی کے بابا تھے۔ وہ واقعی اس شہر کے لیے، ہم سب کے لیے اللہ کی نعمت تھے۔

دنیا سے ہر فرد کو بالآخر رخصت ہوجاتا ہے۔ دنیا جائے امتحان ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ دنیا سے جانے والا فرد نامہ اعمال میں کیا لے کر گیا ہے، اور اس کے جانے کے بعد دنیا اسے کس طرح یاد رکھتی ہے؟ اللہ تعالیٰ نعمت اللہ خان صاحب کی نیکیوں کو قبول فرمائے اور انہیں اپنی جوارِ رحمت میں اعلیٰ مقام عطا کرے، آمین

ندیم نعمت اللہ

نعمت اللہ خان۔۔۔ایک بے مثال انسان!

وہ پاکستان کی محبت میں جذباتی حد تک گرفتار ہیں

میرا ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ تاثر تھا کہ یہ ایک دیانت دار اور کامیاب آدمی ہیں، اسلام سے متاثر ہیں، دینی کاموں میں دلچسپی لیتے رہتے ہیں۔ "کامیاب" میں نے اس لیے کہا کہ اس زمانے میں شمالی ناظم آباد میں کوئی ڈیڑھ ہزار گز کا بنگلہ بنالینا معمولی بات نہ تھی۔ اس دوران ہوا تو یوں کہ میں نے اپنا ہفت روزہ "تعبیر" کے نام سے نکالا، مجھے اس کے لیے کسی وکیل کی ضرورت تھی جو انکم ٹیکس وغیرہ کے امور کو دیکھ سکے۔ وکیل تو کئی واقف تھے۔ خالد اسحٰق اور راجا حق نواز سے لے کر جنید فاروقی، حشمت حبیب ہمارے مقدمے بلا معاوضہ لڑتے ہی رہتے تھے، مگر مجھے اندازہ تھا کہ اس کام کے لیے ایک الگ ڈھب کا وکیل ہوا کرتا ہے، جیسے لاہور میں محمود مرزا تھے۔ برادرم منور حسن سے پوچھا تو فوراً بولے: اپنے نعمت اللہ جو ہیں، ان کے پاس چلے جاؤ۔ میں پہلی بار ان کے پاس ان کے دفتر میں پہنچا، وہ پہلے سے منتظر تھے۔ اُس وقت تو ان کی داڑھی بھی نہ تھی، لباس بھی جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، مغربی ہی تھا۔ سچ پوچھیے تو آج کے نعمت اللہ خان کو دیکھ کر آدمی مغالطے میں پڑ جاتا ہے کہ آیا ان کا حلیہ کبھی اس سے مختلف بھی رہا ہوگا! وہ جماعت اسلامی کے متاثرین میں ضرور رہے ہوں گے، ان کے گھر میں جماعت والوں کی دعوتیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں بہت سے لوگ ایسے تھے جو ملک میں سوشلزم اور الحاد کی بڑھتی ہوئی قوتوں کے خلاف جماعت اسلامی کو سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے اور اس لیے جماعت کے ہمدرد بھی تھے، اور مخالفوں سے جماعتیے کی پھبتی بھی سنتے تھے۔

پھر ایک دن خبر آئی کہ خان صاحب رکنِ جماعت ہو گئے ہیں، خانہ کعبہ میں پروفیسر غفور صاحب کے سامنے حلف اٹھایا ہے۔ شاید جذبہ ایمانی زیادہ زور مار گیا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے نائب امیر، پھر امیر ہو گئے۔ کسی نے کہا: منور حسن کی دوستی رنگ لائی ہے۔ کسی نے پوچھا: کیا ممبر شپ کے تحت معیارات سے گزرے ہیں؟ چہرے پر داڑھی خوب چھپنے لگی، آہستہ آہستہ۔ ایسی کایا کلپ ہوئی کہ اب وہ پہلے والے خان صاحب کو یاد کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ یہ میں بار بار پہلے والے خان کا حوالہ دے رہا ہوں تو خدانخواستہ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اُس وقت یہ دین سے بہت دور تھے۔ بالکل نہیں۔ عرض کیا ہے کہ دینی کاموں میں دلچسپی لیتے تھے۔ ہاں، دنیاوی طور پر کامیاب آدمی ضرور تھے۔ تقسیم کے وقت لٹے پٹے پاکستان آئے تھے۔ اُس زمانے میں ان کے دوست، مشہور صحافی فضل قریشی ان دنوں کا تذکرہ بڑے مزے سے کرتے ہیں۔ بالکل نچلی سطح سے انہوں نے اپنی زندگی کا سفر شروع کیا اور انکم ٹیکس کے بڑے کامیاب وکیل بنے۔ ان کا شمالی ناظم آباد میں گھر جس کا میں نے اوپر ذکر کیا، انہی دنوں کی یادگار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ گھر انہوں نے اپنی محنت سے حق حلال کی کمائی سے بنایا ہو گا۔ وہ دنیاوی طور پر ایک دیانت دار اور شریف آدمی ہیں، اور ایک ایسے آدمی کا دنیاوی طور پر کامیاب ہونا میرے لیے ہمیشہ خوشی کی بات رہی ہے۔ جیسے ہمارے پروفیسر غفور احمد ہیں۔ 70ء میں اسمبلی کا ممبر منتخب ہونے کے وقت وہ فیڈرل بی ایریا میں اپنا ایک نہایت عمدہ گھر رکھتے تھے اور ایک بڑے اور اہم ادارے کے ڈائریکٹر فنانس تھے۔ اچھی تنخواہ، اچھی مراعات تھیں۔ یہی حال محمود اعظم فاروقی کا تھا۔ جماعت کو انہی مرحلوں سے گزرنے والا ایک اور شخص مل گیا تھا۔

مجھے یاد ہے، میں ان کے گھر کئی بار گیا ہوں، اکثر کھانے پر احباب اکٹھے ہوتے۔ بڑے بڑے اجتماعات بھی ہوتے۔ یہ جو تاثر ہے کہ شاید انہیں غصہ بہت آتا ہے، تو مجھے یاد نہیں پڑتا۔ میں نے تو انہیں ہمیشہ نرم خو پایا۔ دھیمے انداز میں بات کرتے۔ ہاں، وہ اپنی بات پر ڈٹ جانے والے اور سچ کے اظہار میں دو ٹوک بات کرنے والے ضرور ہیں۔

ایک نکتہ صاف صاف بتاتا ہوں، جس طرح جب وہ امیر جماعت بنے تو بعض لوگوں کو حیرت ہوئی کہ جماعت میں بڑے بڑے پرانے لوگ پڑے ہیں، یہ نسبتاً نئے ''رکن'' کو امیر کیوں بنا دیا، اس طرح جب انہیں ناظم اعلیٰ کے لیے نامزد کیا گیا تو کہنے والوں نے کہا، جماعت نے یہ کیا کیا، اس کام کے لیے تو کسی ایسے آدمی کو لانا چاہیے تھا جس کا امیج کوئی غیر جانب دار یا غیر جماعتی کا ہوتا۔ اب لوگ یہ بھول چکے تھے کہ وہ ایک کامیاب وکیل بھی تھے، اب یہی سمجھا جاتا تھا کہ ایک مولوی کو اس کام پر لگا دیا۔ کسی پروفیشنل وغیرہ کو لایا جاتا۔ نعمت اللہ خان نے اب کی بار اس تاثر کو بھی زائل کر دیا۔ اب وہ کراچی کے کامیاب ترین ناظم گنے جاتے ہیں، حتیٰ کہ عبدالستار افغانی بھی ماند پڑ گئے، جو اپنی قلندری اور کارکردگی کی وجہ سے جماعت کے لیے باعثِ افتخار بنے تھے۔ نعمت اللہ خان کا کام صدر پرویز مشرف تک کو اتنا پسند آیا کہ وہ ان کے لیے مخالفتوں کے طوفان میں ایک ڈھال بن گئے، وہ سمجھ گئے کہ یہ مولوی دہشت گرد نہیں، جہاندیدہ ہے۔ اس وقت اگر مقامی حکومتوں کے تجربے کو کامیاب ثابت کرنا ہو تو پہلی مثال نعمت اللہ خان کی دی جائے گی۔ شاید اس کے بعد لاہور کے میئر عامر محمود کا ذکر آئے، مگر ان کے لیے شاید اتنی مشکلات نہیں، صوبے میں ایسی حریف حکومت نہیں جیسی نعمت اللہ خان کو ملی ہے۔ غیر جانب دار لوگ بھی کہتے ہیں کہ وہ کچھ عرصہ رہ گئے تو کراچی کی شکل بدل جائے گی۔ وہ ڈرتے ہیں نہ دبتے ہیں، بس کام میں لگے رہتے ہیں۔ مجھے ان کی ایک اور ادا بہت پسند ہے کہ وہ پاکستان کی محبت میں جذباتی حد تک گرفتار ہیں۔ جہاں بھی موقع ملتا ہے، وہ اس کا کھل کر اظہار کرتے ہیں۔ انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ ایک کامیاب آدمی ہیں، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ خدا ان کے درجات بلند کرے۔ وہ ایک بے مثال انسان ہیں۔

سجاد میر

(یہ مضمون 2004ء میں لکھا گیا)

شجرہائے سایہ دار

کہتے ہیں کہ ہر بڑے شخص کی کامیابی کے پیچھے کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ والد محترم نعمت اللہ خان صاحب کی کامیاب زندگی کے پیچھے دیگر عوامل کے ساتھ ساتھ دو خواتین کا ہاتھ بھی تھا۔ ان کی والدہ اور ہماری والدہ، یعنی ان کی اہلیہ۔ میری والدہ طاہرہ خاتون مئی 1940ء میں شاہجہان پور، یوپی میں پیدا ہوئیں جو ان کی ننھیال تھی، جبکہ ان کے والد کا تعلق کاس گنج یوپی سے تھا۔ ان کی فیملی نے 1950ء میں ہجرت کی اور کراچی میں رہائش اختیار کی۔ پرائمری سے آگے تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں مل سکا کیونکہ ان کے والد وارث ملک (ہمارے نانا) جو اگرچہ خود ایم اے ایل ایل بی تھے لڑکیوں کی تعلیم کے حق میں نہیں تھے۔ والدہ کے 5 بہن بھائی تھے جن میں 3 بہنیں اور 2 بھائی تھے۔ والد وفاقی حکومت کے شماریات ڈویژن میں ملازم تھے۔

ہم ماشاءاللہ نو بھائی بہن ہیں (وسیم، ندیم، فہیم، کلیم، افشاں، نعیم، لبنیٰ، عاصم اور ناظم)۔ سب سے بڑے وسیم بھائی ہیں، جو 1962ء میں لیڈی ڈفرن ہسپتال میں پیدا ہوئے۔ چار بیٹوں کے بعد 1966ء میں بیٹی پیدا ہوئی تو زندگی میں پہلی بار ابا جان نے میری والدہ کو میک اپ کا کوئی گفٹ دیا اور کہا کہ آج مجھے بیٹی کا باپ بن کر احساس ہو رہا ہے کہ اگر میں کسی کی بیٹی کا خیال کروں گا تو کوئی میری بیٹی کا خیال کرے گا۔ میری والدہ ایک بہت نفیس، مہذب، شائستہ اور محبت و شفقت کرنے والی خاتون تھیں۔ جب والد محترم نے عملی سیاست میں قدم رکھا تو ہمارے گھر میں مہمان داری اتنے بڑے پیمانے پر ہونے لگی کہ کوئی اور

خاتون ہوتیں تو شاید گھبرا جاتیں، لیکن والدہ نے کبھی شکوہ نہیں کیا، بلکہ وہ مہمانوں کو اللہ کی رحمت سمجھتی تھیں۔ حیرانی ہوتی ہے کہ تمام مہمانوں کے لیے گھر ہی میں کھانا بنایا جاتا، اور باہر سے کسی چیز کے منگوانے یا پکوانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

انہوں نے نہ صرف ہم سب بھائی بہنوں کی تعلیم وتربیت کو پورا وقت دیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ والدِ محترم کی بھی پوری مدد کی اور گھر کی اکثر ذمہ داریاں اپنے سر لے لیں۔ والد خدمتِ خلق اور میدانِ سیاست میں اتنے مصروف ہو گئے تھے کہ ان کو گھر کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہوتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ یہ سب والدہ اور بڑے بھائیوں کا بھرپور تعاون تھا جو میرے والد اتنے فلاحی کام کر سکے۔ الحمدللہ ہمارے والدین کی زندگی ہم سب کے لیے ایک بہترین نمونہ ہے۔

ہمارے سارے بھائی اسلامی جمعیت طلبہ سے وابستہ ہوئے اور اپنے اپنے تعلیمی اداروں میں خوب سرگرم رہے۔ 90ء کی دہائی میں جمعیت اور ایک لسانی تنظیم کے درمیان اکثر کشمکش کا ماحول رہتا تھا۔ والدہ کو تشویش ضرور ہوتی تھی لیکن انہوں نے کبھی کسی بیٹے سے یہ نہیں کہا کہ جمعیت کی سرگرمیوں سے دور رہو جاؤ۔

بدقسمتی سے بہت کم عمر میں ہی میری والدہ بیمار ہو گئیں، بلڈ پریشر اور ذیابیطس کے ساتھ ان کو ایک ایسی بیماری لاحق ہوگئی جو لاکھوں میں کسی ایک کو ہوتی ہے۔ ڈرمیٹو مایو سائیٹس، جس سے مسلز (muscles) بہت کمزور ہو جاتے ہیں اور قوت مدافعت بھی کمزور ہو جاتی ہے۔ اس بیماری میں انہوں نے دس سال گزارے۔ 26 فروری 1994ء کو انہیں دل کا دورہ پڑا اور وہ ہمیں چھوڑ کر ابدی سفر پر روانہ ہو گئیں۔ ہم نے ساری زندگی ان میں خیر اور بھلائی کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ والدِ محترم کے بارے میں ایک بات ضرور بتانا چاہوں گی تاکہ دیگر لوگ بھی اس مثال کو اپنا سکیں۔ والدِ محترم نے اپنے انتقال سے قبل ناظم آباد والا مکان فروخت کر کے ہم سب کو اپنی جائداد میں سے حصہ دے دیا

تھا اور خود وسیم بھائی کے گھر منتقل ہو گئے تھے۔ وہ کسی کا حق رکھنے والے فرد نہیں تھے۔ شاید انہیں اس کی ترغیب پروفیسر غفور احمد صاحب کے عمل سے ملی تھی، جو والدِ محترم کے لیے لیڈر بھی تھے اور بڑے بھائی کا درجہ بھی رکھتے تھے۔

سچ ہے کہ والدین اولاد کے لیے سایہ دار درختوں کی مانند ہوتے ہیں۔ ہمارے والدین دنیا سے رخصت ہو چکے لیکن ان کی یادوں کی خوشبو ہماری زندگیوں کو ہمیشہ معطر رکھے گی، ان شاء اللہ۔

افشاں عزیز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہجرت ناگزیر تھی

خالق کائنات اللہ رب العزت کی حمد و ثناء و بے پناہ شکر، اور اس کے آخری رسول حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ عقیدت میں درود و سلام کے ہدیے کے ساتھ اس کتاب کا آغاز کر رہا ہوں جسے آپ اپنی ہی طرح کے ایک عام آدمی کی یادداشتوں کا مجموعہ سمجھ سکتے ہیں۔

یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ بچپن میں، میں کوئی ذہین و فطین اور پڑھائی میں دل لگانے والا طالب علم نہیں تھا، بلکہ کھیل کود، سیر سپاٹے کا شوقین اور کسی حد تک شرارتی بھی تھا۔ آپ ایک عام سا لڑکا سمجھ لیں۔ اب لوگ سیاسی و سماجی کارکن اور عوامی نمائندے کے طور پر مجھے جانتے ہیں، لیکن سچ یہ ہے کہ میں نے خود کو ساری زندگی ایک عام آدمی سمجھا ہے اور شہر کراچی کا ناظم بننے کے بعد بھی عام لوگوں سے کبھی رابطہ منقطع نہیں ہونے دیا۔ کبھی بھی اللہ کے بندوں اور اپنے درمیان پروٹوکول کی دیوار کھڑی نہ ہونے دی۔

بہر حال ہر فرد کی طرح اپنی کہانی کا آغاز بھی بچپن کی یادوں سے کر رہا ہوں۔

والد محترم عبدالشکور خان صاحب ریلوے میل سروس میں کلرک تھے۔ نرم دل لیکن سخت اصول پسند آدمی تھے۔ نہ صرف اپنے بچوں کو بلکہ تمام مسلمانوں کے بچوں کو اعلیٰ تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتے تھے۔ تنخواہ سو روپے ملتی تھی لیکن اس ملازمت کا حق بھی غیر معمولی انداز میں ادا کرتے تھے۔ دفتری اوقات کے بعد بھی کام گھر لے آتے اور رات گئے تک اس

میں مصروف رہتے۔ اماں خفا ہوتیں تو مسکرا کر خاموش ہو جاتے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کے بارے میں فکر مند رہتے اور غور و فکر کرتے رہتے۔ شفیع اللہ خان، ارتضیٰ احمد اور نبی داد خان اعوان ان کے قریبی دوستوں میں شامل تھے۔

مجھ سے بڑی دو بہنیں اقبال اور عزیزہ تھیں، جبکہ دو چھوٹے بھائی علیم اور رؤف تھے۔ ابا کی تنخواہ محدود جبکہ کنبہ بڑا تھا۔ اماں نے غربت کے جن کو سلیقے کی بوتل میں بند کر رکھا تھا۔ مکان کا کرایہ، کھانا پینا، ہمارے تعلیمی اخراجات، مہمان داری اور دیگر دسیوں کام وہ ان سو روپوں میں کیسے کر لیتی تھیں؟ یہ بات کبھی سمجھ میں نہیں آ سکی۔

میری عمر نو سال تھی کہ ابا کی دیرینہ بیماری ٹی بی نے شدت اختیار کر لی۔ وہ ڈاکٹروں کے مشورے پر اجمیر کے ایک پُر فضا مقام تاگڑھ سید کے مزار پر چلے گئے، جو ہمارے گھر سے کئی کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ گھر اور مزار کے درمیان ایک جنگل بھی تھا۔ اماں نے کھانا لے کر جانے کی ذمہ داری لگا دی۔ راستے میں کئی بار لنگوروں نے بہت تنگ کیا لیکن کچھ دن میں اندازہ ہو گیا کہ ان سے کیسے نمٹنا ہے۔

ڈاکٹری علاج، گھریلو ٹوٹکوں اور احتیاطی تدابیر کے باوجود ابا کی بیماری بڑھتی ہی چلی گئی۔ جب ڈاکٹروں نے مایوسی کا اظہار کر دیا تو گھر منتقل ہو گئے۔ اماں اور بہنوں نے ابا کی جس طرح خدمت کی اس کا صلہ صرف اور صرف اللہ کی ذات ہی دے سکتی ہے۔

ایک دن میں گھر سے باہر کھیل کود میں مشغول تھا کہ ابا کے ایک رشتے دار عطا اللہ مجھے ڈھونڈتے ہوئے آئے اور چیختے ہوئے کہا کہ تمہارے والد کی سانسیں اکھڑ رہی ہیں اور تمہیں کھیل تماشے ہی سے فرصت نہیں ہے!

میں کمرے میں داخل ہوا تو عالم یہ تھا کہ ابا کی سانسیں اور میرے آنسو بیک وقت نکل رہے تھے۔ ان کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ نزدیک آنے کا اشارہ کیا، میرا ہاتھ تھام کر بہت آہستہ سے کہا: نعمت اللہ! یاسین شریف پڑھو۔ میں نے بے اختیار تلاوت

شروع کردی۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ والد کی نگاہیں چھت کی جانب اٹھیں اور وہیں ٹک کر رہ گئیں۔ میں سمجھا کہ تکلیف زیادہ ہے۔ لیکن کچھ ہی لمحوں میں ان کی گردن ڈھلک گئی۔ ہماری دنیا اندھیر ہوگئی۔ کمرے میں موجود گھر والے زاروقطار رو رہے تھے اور میں خاموشی سے ابا کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عزیز رشتہ دار مجھے دلاسا دے رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد تجہیز و تکفین کے مراحل شروع کرنے کے لیے ابا کے جسدِ خاکی کو کمرے سے باہر لے گئے اور میں اکیلا رہ گیا۔ ان کی باتیں ایک ایک کرکے میرے پردۂ تخیل پر مجسم شکل اختیار کرنے لگیں۔ ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ سخت گیر مزاج کے باوجود مجھے ابا سے جذباتی حد تک لگاؤ تھا۔ راتوں کو دیر تک جاگ کر دفتری کام مکمل کرنا، ہم بہن بھائیوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے فکرمندی، مسلمانوں کی ہندوستان میں حالتِ زار بہتر بنانے کے لیے مختلف تدابیر سوچنا... ان کی باتیں یاد آنے لگیں۔ ایک گھنی چھاؤں تھی جو لمحے بھر میں چھن گئی۔

اپنے آبائی وطن شاہجہاں پور میں ایک نیا آغاز میرا منتظر تھا، کیونکہ میری پیدائش اجمیر کی ہے اور یکم اکتوبر 1930ء سے سفرِ زندگی کا آغاز ہوا۔ میرے ننھیال اور ددھیال دونوں ہی شاہجہاں پور میں تھے۔ دادا، دادی تو میری پیدائش سے قبل ہی انتقال کر گئے تھے۔ ننھیالی رشتہ داروں میں نانا رضا علی خان، پولیس سے بحیثیت انسپکٹر ریٹائر ہوکر شاہجہاں پور میں مقیم تھے، نانی کا اصل نام کم ہی لوگوں کو معلوم تھا، سب انہیں بی اماں کہہ کر پکارتے تھے۔ سب کی دیکھا دیکھی میں نے بھی انہیں بی اماں کہنا شروع کردیا۔ فدا علی خان اور یوسف علی خان دو ماموں اور دو خالائیں... یہ میرا ننھیالی اثاثہ تھا۔ جب کہ اجمیر میں ہمارے ساتھ تایا حافظ احمد نور خان (یہ ریلوے میں ملازم تھے) اور محمد نور خان (یہ میو کالج میں ملازم تھے) رہا کرتے تھے۔ ان دونوں سے بڑے ایک سوتیلے تایا اور بھی تھے۔ ارادت اللہ خان، رعب داب کی وجہ سے خلقِ خدا ''دادا'' کے نام سے پکارتی تھی۔ چچا عبدالصبور کے علاوہ دو

پھوپھیاں بھی تھیں۔

پڑھائی میں عدم دلچسپی کے باوجود ابا اپنی زندگی ہی میں اسلامیہ ہائی اسکول میں مجھے داخل کروا چکے تھے۔ کوئی ایک میل کا فاصلہ پیدل طے کرنا روزانہ کا معمول تھا۔ شروع میں کچھ دن تو ابا میرے ساتھ اسکول تک گئے۔ جب راستوں کی سوجھ بوجھ آ گئی تو اکیلے ہی جانے لگا۔ کلاس کے 25 طلبہ میں سے اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ کلاس ٹیچر ہی کورس کے مضامین پڑھاتے، اور دیگر روایتی اساتذہ کی طرح سبق یاد نہ ہونے پر کڑا احتساب کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ تدریس کے درمیانی وقفے میں والدہ کی دی ہوئی اکنی سے استفادہ کرتا (نئی نسل اکنی سے واقف نہیں ہے، ایک روپے میں سولہ آنے ہوا کرتے تھے۔ ایک آنہ کو اکنی کہا کرتے تھے)۔ اس اسکول میں میرے دوستوں کی تعداد تو بہت محدود رہی لیکن عسکری تقوی (سابق صوبائی وزیر ماحولیات) سے اچھی یاد اللہ رہی۔ قیام پاکستان کے ایک طویل عرصے بعد ان سے کراچی میں سول سروس کے امتحان میں ملاقات ہوئی۔ میں انہیں اور وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ از سر نو تعارف کا بہانہ میرے ہاتھ میں موجود امتحانی کتاب بنی۔ عسکری تقوی اس پر میرا نام تلاش کرنے کے ساتھ چہرے پر نگاہیں گاڑے ہوئے تھے۔ پھر خود ہی گویا ہوئے "آپ نعمت اللہ"۔ "اور آپ عسکری تقوی"، میں نے بے اختیار جواب دیا۔

دوستیاں، کھلنڈراپن، طفلانہ مشاغل جو بے فکری کی رفعتوں میں مائل بہ پرواز تھے، ابا کے انتقال کے ساتھ آن واحد میں مسائل سے اٹی ہوئی بے اماں زمین سے آ لگے۔ والدہ کی عدت مکمل ہوتے ہی نانا ہمیں اپنے ساتھ شاہجہاں پور لے گئے۔ دو منزلہ مکان کے بالائی حصے میں ہماری فیملی کو رہائش دے دی گئی۔ گھر کے اگلے حصے میں واقع دکانیں، ریٹائرمنٹ کے بعد نانا کی آمدن کا مستحکم ذریعہ تھیں، اور اس میں سے وہ ہماری ضروریات کو پورا کرنے کی مقدور بھر کوشش کرتے تھے۔ والدہ نے شاہجہاں پور پہنچتے ہی تیس برس کی عمر میں

میونسپلٹی اسکول میں داخلہ لے لیا اور مڈل تک تعلیم مکمل کی۔ پھر اسی اسکول میں پندرہ روپے ماہانہ مشاہرے پر استانی مقرر ہو گئیں۔ جس کی وجہ سے ہمارے اسکول کی فیسیں جو معمولی ہونے کے باوجود بھاری معلوم ہوتی تھیں اور اس کے علاوہ اوپر کے چھوٹے موٹے اخراجات پورے ہونے میں مدد ملنے لگی۔ نویں جماعت میں چرن سنگھ آزاد سے ملاقات ہوئی، اس کی گفتگو نے مجھے بہت متاثر کیا۔ ہندوستان پر انگریزوں کے قبضے کے حوالے سے اس کی سوچ شدید باغیانہ تھی۔ اپنے خیالات سے اس نے مجھے بھی متاثر کرنے کی کوشش کی جس میں وہ بہت حد تک کامیاب ہو گیا۔ وہ طالب علمی کے دوران ہی انگریزوں کے خلاف تحریک چلانے کے لیے ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ بعد ازاں اس نوجوان کو آزادی مانگنے کی پاداش میں پھانسی کی سزا ہو گئی۔ کئی برس سے اس سے میرا رابطہ منقطع تھا اس لیے پتا نہیں چل سکا کہ اس برہمن زادے کے ساتھ یہ نوبت کیوں کر آئی!

1946ء کے عام انتخابات نزدیک تھے۔ عام ذہنوں میں یہ تصور راسخ ہو چکا تھا کہ انتخابات مسلمانوں کے لیے ایک آزاد وطن کے حصول کا پیمانہ ثابت ہوں گے۔ انتخابات کی تاریخ کا اعلان ہوا اور مہم دھواں دھار انداز میں شروع ہو گئی۔ شاہ جہاں پور کے حلقے سے کریم رضا خان امیدوار نامزد ہوئے۔ یہ ہمارے محلے "خلیل غربی" میں رہا کرتے تھے۔ مغرب کی نماز کے بعد امیدوار اور چند لوگ اکٹھے ہوتے جن میں سے ایک آدھ کے پاس بھونپو ہوتا تھا۔ اعلانات کے ساتھ سفر بھی جاری رہتا۔ کسی مقام پر لوگ کثرت سے اکٹھے ہو جاتے تو جلسہ عام کا انعقاد ہو جاتا۔ میں بھی دیگر نوجوانوں کے ساتھ ان اجتماعات میں جوش و خروش سے حصہ لیتا تھا۔

جلسے جلوسوں میں شرکت کی وجہ سے مصروفیات کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھیں۔ جلسوں کے اختتام کے بعد مقامی بستیوں کے مکین قدموں میں آنکھیں بچھاتے اور دلوں کے دروازے وا کر دیا کرتے تھے۔ ان کی میزبانی سے لطف اندوز ہونے کا سلسلہ کچھ زیادہ ہی دراز ہو گیا

اور نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ ایک مرتبہ چار دن گھر سے باہر گزار دیے۔ گھر واپس لوٹا تو اماں سخت غصے میں تھیں۔ فرمایا: جلسے جلوسوں کو ایک جانب رکھو اور اپنی پڑھائی پر توجہ دو، میٹرک کے امتحانات نزدیک ہیں۔ پڑوس میں ایک اسکول ماسٹر امجد صاحب رہا کرتے تھے، وہ طلبہ کو بلا معاوضہ پڑھاتے تھے، اُن کی توجہ اور شفقت میری تعلیم کے ڈوبتے ہوئے سفینے کے لیے بہت مضبوط سہارا ثابت ہوئی، دو ماہ میں جیسے تیسے نصاب مکمل کیا اور امتحان دے دیا۔ نتائج کے لیے الہ آباد سے کتابی شکل میں گزٹ نکلتا تھا۔ میری تھرڈ پوزیشن آگئی۔ اُس وقت انتخابی مہم ختم ہو چکی تھی۔

اسی دوران اجمیر سے تایا حافظ نور احمد تشریف لائے اور والدہ سے کہا کہ صاحبزادے کو اپنے ساتھ اجمیر لے کر جانا چاہتا ہوں تا کہ وہاں کسی اچھے انسٹی ٹیوٹ سے شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ سیکھ لیں۔ ہاتھ میں ہنر آ جائے گا تو ملازمت آسانی سے مل جائے گی۔ والدہ نے اجازت دے دی۔

میں نے اجمیر کے ایک انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لے کر شارٹ ہینڈ کی کلاسیں لینا شروع کر دیں۔ ایک دن انسٹی ٹیوٹ سے واپسی پر گھر کے نزدیکی میدان میں کچھ لڑکوں کو دیکھا جو غالباً کسی جلسے یا جلوس کی تیاری کر رہے تھے۔ پتا چلا کہ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی جانب سے جلسے کا انعقاد کیا جا رہا ہے۔ بھاگم بھاگ گھر پہنچا، کتابیں ایک جانب رکھیں اور دوبارہ جلسہ گاہ کی جانب رخ کیا۔ تھوڑی دیر بعد جلسے کی کارروائی شروع ہو گئی۔ پروگرام کے منتظم ہارون الرشید، جو مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر بھی تھے، سے کہا: میں نظم پڑھوں گا۔ انہوں نے خوش دلی سے اجازت دے دی۔ میں نے نظم سنائی اور پُرجوش نعرے بھی لگائے۔ جلسے کے بعد منتظمین نے کہا کہ پرسوں بھی ہمارا ایک جلسہ ہے، آپ وہاں بھی ضرور آئیں۔ جلسے میں میری پہلی آمد ہارون الرشید کے دل میں گھر کر گئی تھی۔ ہمارے درمیان تعارف، دوستی، پھر غیر معمولی اعتماد کا سلسلہ اس قدر مستحکم ہوا کہ 1950ء میں فریضۂ حج کی

ادائیگی کے لیے جاتے وقت وہ اپنے تینوں بچوں کو میرے پاس چھوڑ کر گئے تھے۔

قیام پاکستان کی اگلی رات یعنی پندرہ اگست کو ہندوؤں نے بھارت کی آزادی کی خوشی میں جلوس نکالا۔ درحقیقت ان کی خواہش تھی کوئی ایسی صورت بنے جس سے فساد پھیلے۔ وہ جلوس کی شکل میں ڈھول بجاتے اور شور مچاتے ہوئے مندر جانے لگے جو گھنٹہ گھر کی مسجد کے عین سامنے تھا۔ جلوس کے کچھ شر کا اعلان کر رہے تھے کہ مندر میں جا کر گھنٹے بجائے جائیں گے۔ اس اعلان سے مسلمانوں میں غم و غصے کی کیفیت پیدا ہوگئی اور اشتعال پھیل گیا۔ مغرب کا وقت اور کشیدگی دونوں ہی سر پر آن پہنچے۔ اس دوران ضلعی انتظامیہ کو اطلاع مل گئی۔ پولیس موقع پر پہنچ گئی اور ہندوؤں کے لیڈروں کو پیچھے دھکیل کر خاموش کرایا۔ یہ دیکھ کر وہاں جمع ہونے والے مسلمان بھی منتشر ہونے لگے اور بلوہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔

پاکستان مجھ جیسے نوجوانوں کے لیے ایک حسین خواب کی مانند تھا، جسے ایک عظیم جدوجہد کے بعد تعبیر مل چکی تھی۔ مختلف مقامات سے فسادات کی خوفناک خبریں مسلسل مل رہی تھیں، اس لیے ذہنی و جسمانی طور پر اپنے آپ کو ہجرت کے لیے تیار کرنا شروع کیا۔ ہجرت کے بارے میں میرے تصورات بہت زیادہ واضح نہیں تھے، لیکن اتنا ضرور معلوم تھا کہ کسی دنیوی مقصد سے یعنی روزگار، اعلیٰ تعلیم یا کاروبار وغیرہ کے لیے اپنا وطن چھوڑ دینا نقل مکانی کہلاتا ہے، جبکہ ہجرت کا تعلق اسلام سے ہے، اور اسلام کی خاطر اپنا علاقہ یا ملک چھوڑ کر مستقل طور پر کسی دوسرے علاقے یا ملک چلے جانے کو ہجرت کہتے ہیں۔ ہجرت کرنے والے پلٹ کر اپنے آبائی علاقے میں آباد نہیں ہوتے۔ گویا جو لوگ بھی میری طرح پاکستان جا رہے تھے، وہ ہمیشہ کے لیے جا رہے تھے۔

اس سے قبل ہارون الرشید اکیلے ہجرت کر کے پاکستان جا چکے تھے۔ والد اور بھائی شاہ جہاں پور میں ہی تھے، خیال آیا کہ کسی ذریعے سے انہیں آگاہ کر دوں کہ تنہا ہجرت کا فیصلہ کیا ہے، تاکہ وہاں جا کر جب مناسب بندوبست ہو جائے تو سب کو آنے کا کہہ سکوں۔ پھر سوچا

کہیں منع نہ کردیں، اس لیے اطلاع نہ بھجوائی۔ ہارون الرشید کی والدہ سے رابطہ کیا تو وہ بھی جانے کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ ارادہ ظاہر کیا تو بہت خوش ہوئیں۔ فرمایا: ساتھ ہی چلے چلو۔ یہ سن کر مجھے اطمینان ہو گیا۔ بہت ہی تھوڑے سامان کے ساتھ اجمیر اسٹیشن پہنچے۔ والد کے ایک ہندو دوست کی نظر مجھ پر پڑی، انہوں نے اپنے ساتھی کو آواز دی: ارے ذرا دیکھو! یہ نعمت اللہ ہے، اپنے عبدالشکور کا لڑکا۔ ان کی اس قدر والہانہ محبت سے مجھے بہت حیرانی ہو رہی تھی۔ دل سے آواز نکلی: انسانیت ابھی زندہ ہے۔ انہوں نے ہارون الرشید کی والدہ، دیگر خواتین اور چھوٹے بچوں کو لیڈیز کمپارٹمنٹ میں بٹھا دیا۔ رہ گیا میرا مسئلہ، میرے پاس ٹکٹ تھا نہ ہی پیسے۔ انہوں نے اپنے تعلقات کا استعمال کرتے ہوئے ڈاک سروس والے آر۔ ایم۔ ایس کے لال ڈبے میں مجھے بٹھا دیا۔ اُس وقت میری حیثیت منزل سے بے خبر پارسل کی سی تھی۔ پاکستان میں کس جگہ پہنچیں گے؟ سر چھپانے کا ٹھکانا کہاں ملے گا؟ پیٹ کی آگ بجھانے کا کیا بندوبست ہوگا؟ ایسے سوالات کے مقابلے میں میرا ذہن کورے کاغذ کی طرح تھا۔

زندگی جدوجہد کا نام ہے

پاکستان کی طرف سفر کا آغاز اجمیر اسٹیشن سے کیا۔ مارواڑ جنکشن، کھوکھراپار، پھر حیدرآباد تک کُل چار گھنٹے کا سفر تھا۔ اسٹیشن چھوٹا تھا لیکن آنے والوں اور استقبال کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہونے کے باوجود دین کے رشتے نے آپس میں بھائیوں جیسی قربت پیدا کر دی تھی۔ سندھی مسلمان مہاجرین کے لیے ہاتھوں میں ہار اٹھائے قطار بنائے کھڑے رہتے۔ جوں ہی ٹرین رکتی تو استقبال کے لیے سبقت کرتے۔ یہ مناظر آج کی نسل دیکھ پاتی تو لسانیت اور عصبیت کے کانٹے دار شجر کی جڑیں کٹ جاتیں۔ افسوس ایسا نہیں ہو سکا۔ اسٹیشن کے باہر عارضی قیام کے لیے عورتوں اور مردوں کے لیے علیحدہ کیمپ لگائے گئے تھے۔ غالباً ہارون الرشید کی والدہ نے کسی طریقے سے اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی، اس لیے وہ جلد ہی اسٹیشن پہنچ گئے اور قریب ہی ایک محلے میں واقع اپنے گھر لے گئے۔ فلیٹ ٹائپ کا مکان دلوں کی کشادگی کی وجہ سے خاصا وسیع معلوم ہوا۔ دو یا تین دن قیام کے دوران ذہن بنالیا تھا کہ کراچی جانا ہے۔ جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تھی لیکن کراچی میں مقیم ابا کے دوست نبی داد خان اعوان کے گھر کا پتا موجود تھا۔ ہارون الرشید کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کر کے کراچی آنے کے لیے اسٹیشن پہنچا۔ یہاں ارتضیٰ بیگ صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ ابا کے ساتھ آر۔ ایم۔ ایس میں ملازمت کرتے تھے۔ پوچھنے لگے: کہاں؟ میں نے بتایا کہ کراچی جانے کا ارادہ ہے، تو ہاتھ پکڑ کر ایک جانب لے گئے اور جیب سے دس روپے نکال کر میری مٹھی میں تھما دیے۔ رکھ لو! راستے

میں کام آئیں گے۔ دل کو ڈھارس ہوئی۔ دس روپے ملنے کی خوشی حواس پر کچھ ایسی طاری ہوئی کہ ان کا شکریہ ادا کرنا بھی بھول گیا۔ ٹرین میں سوار ہوتے وقت شام کے سائے افق کو اپنے دامن میں سمیٹ چکے تھے۔ کوئی ڈھائی گھنٹے ٹرین چلنے کے بعد سٹی اسٹیشن کے سامنے رک گئی۔ 28 اگست 1947ء کو کراچی میں قدم رکھا۔ رات کی تاریکی چہار جانب مکمل پھیل چکی تھی۔ کھانا ہارون الرشید کے گھر سے کھا کر چلا تھا، اس لیے بھوک سے زیادہ نیند میرے لیے مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں کپڑوں کا تھیلا تھا۔ اسٹیشن کے سامنے کاٹن ایکسچینج بلڈنگ کے فٹ پاتھ پر نظر پڑی۔ دیکھا تو کوئی ڈیڑھ درجن سے زائد افراد وہاں بے فکری سے سوئے ہوئے تھے۔ میں نے بھی کپڑوں والے تھیلے کو تکیہ بنایا اور سونے والوں کی صف میں شامل ہوگیا۔ تھکاوٹ اس قدر شدید تھی کہ کچھ ہی دیر میں گہری نیند آگئی اور پھر فجر کی اذان سے آنکھ کھلی۔ کراچی کی پہلی رات اور وہ بھی فٹ پاتھ پر، میں کبھی نہیں بھولا۔ صبح پہلا خیال یہ آیا کہ نبی دادخان صاحب کا گھر تلاش کرنا چاہیے۔ خستہ حال پرچی پر درج پتا پوچھتے پاچھتے جٹ لائن کے سرکاری کوارٹر پہنچ گیا جہاں وہ رہائش پذیر تھے۔ زندگی میں پہلی بار ٹرام کی سواری کا موقع ملا جو ٹاور سے صدر تک چلتی تھی۔ نبی دادخان اعوان اپنا تبادلہ کراچی کے آر۔ ایم۔ ایس کرا چکے تھے۔ ان کی اہلیہ میرے رشتے کے ماموں کی بیٹی تھیں، اس لیے جب گھر پہنچا تو انہوں نے خوش دلی کے ساتھ استقبال کیا اور جتنے عرصے بھی وہاں رہا اپنی حیثیت سے بڑھ کر آؤ بھگت کی۔

ہجرت بھی خیریت سے ہوگئی۔ ٹھکانا بھی مستقل نہ سہی، عارضی میسر آگیا۔ فکر ہوئی اب کام کاج ڈھونڈا جائے۔ ویسے بھی زیادہ عرصہ کسی پر بوجھ بننا بے زاری کو جنم دیتا ہے۔ اس لیے اجمیر سے ہجرت کر کے آنے والے ابا کے دوستوں کے پتے معلوم کر کے رابطے شروع کیے۔ سید نصرت علی ان میں سے ایک تھے، نہایت نفیس اور شفیق انسان۔ ملاقات ہوئی تو بہت توجہ سے ہجرت کا احوال، اہلِ خانہ کے حالات اور رہائش کے متعلق معلوم کیا۔ نوکری

کرو گے؟ انہوں نے پوچھا۔ اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں، بغیر سوچے سمجھے ہاں کر دی۔ اُس وقت سرکاری محکموں میں مردانِ کار کی قلت تھی، اس لیے تگڑی سفارش اور رشوت کے بغیر ہی ملازمت مل جایا کرتی تھی۔ شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ تو پہلے ہی سیکھ چکا تھا۔ سید نصرت علی ایا کے ساتھ ڈاک سروس میں سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے ملازمت کرنے کے ساتھ سردار عبدالرب نشتر کے ذاتی معاون بھی تھے۔ ایک موقع پر انہوں نے سردار عبدالرب نشتر کے اجمیر تشریف لانے پر میرا تعارف بھی کرایا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد سردار صاحب جب مواصلات کے وزیر بنے تو یہ ان کے ساتھ ہی رہے۔ ان کے توسط سے انکم ٹیکس کے محکمے میں نوکری مل گئی (انہوں نے اپنے ایک واقف کار کے پاس بھیجا اور انہیں فون کر کے کہا کہ اگر نوجوان کام کا ہو اور میرٹ پر پورا اترے تو رکھ لیجیے گا۔ مجھ سے فرمایا کہ زندگی میں کبھی سفارش کو ترقی کا ذریعہ مت بنانا)۔ ابھی ایک ہی مہینہ گزرا تھا اور تقرری کا خط بھی نہیں ملا تھا کہ حبیب بینک میں جگہ خالی ہونے کا اشتہار روزنامہ ڈان میں پڑھا۔ بغیر اطلاع دیے وہاں بھاگ گیا۔ حبیب بینک کا صدر دفتر اس وقت میکلوڈ روڈ پر تھا۔ میر بھائی نام کے ایک افسر تھے جو بینک ملازمت کے لیے آنے والوں کا انٹرویو لے رہے تھے۔ میرا نمبر آیا تو ڈکٹیشن لکھوائی اور حکم دیا کہ پڑھ کر سناؤ۔ خدا بھلا کرے یادداشت کا، بغیر دیکھے سنا دیا تو بہت خوش ہوئے۔ "میرے ساتھ آؤ"۔ اپنے دفتر میں لے گئے اور انتظامی معاملات کے حوالے سے التوا کا شکار خطوط کا پلندہ مجھے تھما دیا اور کہا "انہیں ٹائپ کر کے لاؤ"۔ ٹائپنگ کی رفتار مناسب تھی، اس لیے اچھے خاصے خطوط ٹائپ کر کے دے دیے۔ ملازمت مل گئی۔ ملازمت کے دوران اگلے نو ماہ تک میری رہائش نبی داد خان اعوان صاحب کے ساتھ ہی رہی۔ نوکری کا اگلا لنگر سمندری نمک بنانے والی کمپنی گریکس سالٹ میں ڈالا۔ اس کا دفتر ٹاور پر تھا۔ اس کے بعد خوب سے خوب تر کی جستجو گریز اینڈ کامپٹن لے گئی۔ مختصر عرصے کے لیے ڈینسو ہال پر واقع کمپنی کے دفتر میں 175 روپے ماہوار پر ملازمت کرنے کے بعد

بارکلنس لمیٹڈ کا رخ کیا۔ اب تنخواہ 190 روپے تھی۔ طبیعت اکتا گئی تو ہاورڈ کے سامنے ایلومینیم پاکستان کا دفتر میری جائے ملازمت بن گیا۔ کچھ وقت گزرا، سندھ پرچیز نگ بورڈ پہنچ گیا۔ یہ نیم سرکاری ادارہ سندھ سے باہر غلہ برآمد کرتا تھا۔ غصیلے قسم کے جنرل منیجر کی ماتحتی نصیب میں آئی۔ موصوف ناگپور میں ڈپٹی کمشنر رہ چکے تھے۔ افسروں والی خو بو میں مکمل رچے ہوئے۔ کمپنی کے چیئرمین جمشید نسروانجی مہتا تھے۔ 1930ء میں ممبئی سے علیحدہ ہونے کے بعد کراچی کے پہلے میئر رہ چکے تھے۔ وہ کمپنی آتے اور نوٹس لکھوانے کے لیے کوئی دستیاب نہیں ہوتا تو جنرل منیجر کے ماتحت کی حیثیت سے میں ان کے پاس چلا جاتا۔ تھوڑے ہی دن یہ سلسلہ چلا ہوگا، ایک دن کہنے لگے "نعمت اللہ میں مصروف ہوتا ہوں، تم ایسا کرو گاڑی میں میرے ساتھ بیٹھ جایا کرو، ڈکٹیشن لکھوا دیا کروں گا"۔ راستے بھر مختصر نویسی میں اس قدر منہمک رہتا کہ پتا ہی نہیں چلتا کب ان کے گھر پہنچ گئے ہیں۔ وسیع گھر کے کشادہ لان میں دیوار کے ساتھ کرسیوں پر سائلین اپنے مسائل بیان کرنے کے لیے پہلے سے موجود رہتے تھے۔ نسروانجی باری باری سب سے ملاقات کرتے اور وہیں احکامات جاری کرتے۔

نئے وطن میں اب کچھ کچھ قدم جمنے لگے تھے۔ اس لیے 1948ء میں شاہ جہاں پور جا کر چھوٹے بھائی علیم کو اپنے ہمراہ کراچی لے آیا اور C.M.S ہائی اسکول برنس روڈ پر چوتھی جماعت میں داخل کروا دیا۔ ایک سے دو ہونے کے بعد خیال آیا کہ رہنے کے لیے اپنا کوئی ٹھکانا کرنا چاہیے۔ حالانکہ نبی داد خان اعوان نے بہت اصرار کیا لیکن میں نے شکریہ ادا کیا اور پی آئی بی میں ایک قدیم مکان پچیس روپے ماہانہ کرائے پر حاصل کیا۔ گھر کیا تھا چھوٹا سا کمرہ، ذرا سا صحن، بیت الخلاء، اور غسل خانہ۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ کچھ عرصے کے بعد مالک نے تعمیر کے لیے مکان خالی کرا لیا تو لیاری چلے گئے اور بغدادی سڑک پر کمرہ لے لیا۔ یہاں کچھ دن رہے۔ دفتر سے فاصلہ بہت زیادہ تھا اس لیے بندر روڈ پر نگار سینما کے نزدیک

مولوی مسافر خانے میں دو چارپائیاں کرائے پر لے لیں۔ جس جگہ آج کل قائداعظم کا مزار ہے، اُس وقت یہ علاقہ قائد آباد کہلاتا تھا۔ چند ہفتوں کے بعد وہاں گھاس پھونس سے بنی ہوئی آٹھ دس فٹ چوڑی جھونپڑی خریدلی۔ پاکستان آنے کے بعد کئی لوگوں نے مشورہ دیا تھا کہ کلیم فارم بھر دو تاکہ تمھیں ہندوستان میں چھوڑے ہوئے مکان کے بدلے میں کراچی میں حکومت کوئی مکان الاٹ کردے۔ کچھ لوگوں نے یہ تک کہا کہ جھوٹا کلیم داخل کردو اور بڑا مکان لینے کی کوشش کرو۔ میرے دل نے ایسے ہر مشورے کو مسترد کردیا۔ میں نے کوئی کلیم داخل نہیں کیا۔ چھوٹا سا مکان لینے کی کوشش بھی کبھی نہیں کی۔ جھونپڑی کو محل سمجھا اور عزم کرلیا کہ خوب محنت کروں گا اور اپنی حلال کی کمائی سے مکان بناؤں گا۔

اب میں صاحب مکان تھا۔ مختصر سی جگہ میں غسل خانہ اور بیت الخلا بھی بنایا۔ لالٹین روشنی کا واحد سہارا تھی۔ پانی کا حصول سرکاری نل سے ممکن تھا۔ صبح ڈیوٹی پر جانے سے قبل کنستر بھر کر لاتا۔ چھوٹے بھائی نے اندازہ لگایا تمام سہولیات میسر آگئی ہیں، اب اماں جان کو یہاں بلانے میں کوئی حرج نہیں۔ خط لکھا "بھائی صاحب نے ذاتی مکان بنالیا ہے، آپ سب لوگوں کے ساتھ بلاتاخیر تشریف لے آئیں۔"

خط ملنے کے کچھ ہی دن بعد اماں، چھوٹی بہن اور بھائی کے ساتھ بذریعہ ٹرین کراچی پہنچ گئیں۔ جھونپڑی دیکھ کر ناراض ہوئیں اور کہا "یہ ہے تمہارا گھر.......!" ان کی اس خفگی سے قبل ہی میرے ذہن میں یہ خیال تقویت پاچکا تھا کہ اب سرکاری ملازمت کا بندوبست کرنا چاہیے تاکہ اس کی وجہ سے سرکاری مکان بھی مل سکے۔ اماں کی ڈانٹ نے فیصلے کے لیے حرفِ آخر کا کام کیا۔ سرکاری نوکری وزارتِ دفاع کے ذیلی محکمے آئی ایس آئی میں ملی۔ ڈائریکٹوریٹ میں جوائننگ دی جس کا دفتر پریس کلب کے سامنے تھا۔ یہاں وزارتِ دفاع کے اور دفاتر بھی تھے۔ پاسپورٹ آفس سے متصل مسجد خضرا کے آس پاس پورے پاکستان کا سیکریٹریٹ قائم تھا۔ نواب زادہ لیاقت علی خان ملک کے پہلے وزیراعظم تھے۔ حکومت

نے شہنشاہ ایران کو پاکستان کے دورے کی دعوت دی۔ آئی ایس آئی کے دفتر کا دورہ بھی مہمان کے شیڈول میں شامل تھا۔ کرنل یعقوب خان انٹیلی جنس سروسز کے انچارج تھے۔ موصوف بعد میں لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے تک پہنچے۔ پھر مشرقی پاکستان کے گورنر اور 80ء کی دہائی میں پاکستان کے وزیر خارجہ بھی رہے۔ غصے کے تیز اور ڈسپلن کے شدید قائل کرنل کے سامنے شہنشاہ ایران کی گاڑی آکر رکی۔ وہ استقبال کے لیے آگے بڑھے، جانے کہاں سے چائے کے ہوٹل والا ایک بچہ کپ اٹھائے وہاں آنکلا۔ کرنل کو پروٹوکول کے درمیان مداخلت پر شدید سبکی ہوئی۔ غصے کے عالم میں اور تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا، بچے کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر فضا میں بلند کیا اور تیزی سے واپس زمین پر رکھ دیا۔ میں یہ منظر اپنے کمرے سے دیکھ رہا تھا۔ خیال آیا کہ ان کی جگہ کوئی سویلین ہوتا تو شاید ایسا نہ کرتا۔ بعد ازاں جب کرنل یعقوب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو بہت نرم مزاج، شفیق، صاحب مطالعہ اور مہذب انسان پایا جو دیگر فوجی افسران سے الگ مزاج رکھتے تھے۔ سچ یہ ہے کہ کسی انسان کے مزاج اور شخصیت کو ایک واقعے سے نہیں پہچانا جا سکتا۔

اُس زمانے میں آئی ایس آئی کا کام قدرے محدود اور مختلف تھا، لیکن اُس وقت بھی بھارت کی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھی جاتی تھی۔ دفتر گھر سے نزدیک تھا، مسجد بھی وہیں تھی۔ بارشوں کا موسم تھا، سوچا نماز عصر دفتر کی مسجد میں ادا کر لوں پھر گھر چلتا ہوں۔ ابھی نیت باندھی ہی تھی کہ بادلوں کی گڑگڑاہٹ نے ماحول ہی نہیں دل بھی دہلا کر رکھ دیا۔ خیال آیا خدا خیر کرے آشیانہ تنکوں کا ہے، بکھر کر نہ رہ جائے۔ جلدی جلدی نماز مکمل کی۔ پتلون کے پائنچے گھٹنوں تک اوپر کیے اور چل پڑا جھونپڑی بچانے۔ جو مزار قائد کے نشیبی حصے میں تھی۔ دیکھا تو آدھی پانی میں ڈوب چکی تھی۔ بمشکل اندر داخل ہو پایا۔ اماں جی چولہا چارپائی پر رکھے کھانا پکانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ نظر پڑی تو ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ زارو قطار رونے لگیں۔ بہن بھائی ایک کونے میں سکڑے بے بس نگاہوں سے مجھے تک رہے

تھے۔ برسات کا پانی کئی دن تک زبردستی کے مہمان کی طرح گھر میں موجود رہا۔ بالآخر میونسپلٹی کے اہلکاروں نے نالہ بنا کر نکاسی کا انتظام کیا۔ لطافت اللہ ہماری جھونپڑی سے تھوڑے فاصلے پر رہتے تھے۔ اماں ان کے گھر والوں کو جانتی تھیں۔ دوسرے نمبر کی بہن عزیزہ کے لیے ان کا رشتہ آیا تو کوئی خاص معاشی مصروفیت نہ ہونے کے باوجود محض کردار کی بنیاد پر ہاں کر دی۔ دو چار کپڑوں اور تھوڑے سے برتنوں کے ساتھ بہن کو رخصت کیا۔ لطافت اللہ بعد میں قارن آفس میں ملازم ہو گئے تھے۔ پھر ان کا تبادلہ تھائی لینڈ ہو گیا تو اہلیہ کو ساتھ لے گئے۔ وہیں بڑی بیٹی کی ولادت بھی ہوئی۔ ان کی دوسری بیٹی مشتاق یوسفی صاحب کی بہو ہے۔ کچھ عرصے کے بعد شہر کی انتظامیہ نے جھونپڑی مکینوں کو جیکب لائن میں کرائے پر سرکاری مکانات دے دیے۔ بہنوئی لطافت اللہ کے حصے میں بھی ایک کوارٹر آیا۔ چھ ماہ بعد حکام نے میرا تبادلہ ایئر ہیڈ کوارٹر کر دیا جو ماری پور ایئر بیس کے اندر تھا۔ یہاں دفتر پہنچنے کا وقت صبح ساڑھے چھ بجے مقرر تھا۔ نمائش پر ایئر بیس کے فوجیوں کو لے جانے کے لیے ٹرک آتا تھا۔ سویلین ملازمین بھی اسی میں بیٹھ جایا کرتے تھے۔ جیکب لائن سے نمائش تک پیدل پہنچنے کے بعد ٹرک آتا تو ساری سیٹیں بھری ہوتی تھیں۔ مجبوراً کھڑے ہو کر سفر کرنا پڑتا۔ یہاں پر تنخواہ پونے دو سو روپے تھی۔

پونے دو سو روپے ماہانہ میں پوری فیملی کا گزارہ مشکل سے ہو رہا تھا، اس لیے فیصلہ کیا کہ جز وقتی ملازمت تلاش کی جائے۔ اگلے کچھ برس سخت مشقت میں گزرے۔ براس برادرز، اے آر جی خان اور شریف اینڈ برادرز میں پارٹ ٹائم ملازمت کی۔

ایئر بیس سے چھٹی کے بعد فوجی ٹرک سے میکلیوڈ روڈ تک آتا، جی پی او کی مسجد میں نماز ظہر ادا کرتا اور وہیں بیٹھ جاتا۔ مسجد کے ایک گوشے میں بیٹھ کر کھانا کھانے کے بعد پہلی جز وقتی ملازمت پر روانہ ہو جاتا۔ 3 بجے سہ پہر تک پہنچنا لازمی ہوتا تھا۔ پانچ بجے چھٹی ہوتی تو دوسری جز وقتی ملازمت کے لیے بیرسٹر اصغر کے دفتر روانہ ہو جاتا۔ رات نو بجے گھر واپس

آتے ہوئے جسم تھکن سے چُور اور دماغ کام کرنے سے قاصر ہوتا۔ اگلے دن کا سورج بھی گزشتہ دن جیسی مصروفیات کے ساتھ طلوع ہوتا تھا سوائے ہفتہ وار چھٹی والے دن کے، جب مجھے صبح دیر تک پاؤں پھیلا کر سونے کا موقع ملا کرتا۔

پڑوس میں مقیم ایک صاحب نے مشورہ دیا کہ برخوردار! کچھ توجہ مزید تعلیم کے حصول پر بھی دو۔ مشورہ معقول تھا، سو عمل کرنے کا سوچا۔ نزدیک ہی ایک صاحب نے اپنے گھر میں منشی کلاسز کا آغاز کر رکھا تھا۔ اس وقت منشی فاضل، مولوی فاضل اور اردو فاضل کا طریقہ تعلیم رائج تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کے زیر انتظام وضع کردہ اس نظام کے تحت منشی فاضل میں فارسی اور مولوی فاضل میں عربی پڑھائی جاتی۔ منشی فاضل میں داخلہ تو لے لیا لیکن تین ملازمتوں کے درمیان پڑھائی کے لیے بالکل بھی وقت نہیں ملتا تھا۔ صبح ڈیوٹی پر جانے کے دوران ٹرک میں کھڑے ہو کر اس طرح پڑھتا کہ ایک ہاتھ میں کتاب ہوتی اور دوسرے سے ٹرک کے پیچھے کو تھاما ہوا ہوتا تھا۔ انہی مصروفیات اور مشکلات کے ساتھ ایف اے اور بی اے بھی کر لیا۔

ایک دن دفتر سے چھٹی لی اور اسلامیہ کالج جا کر ایم اے میں داخلہ لیا۔ آرٹس کے مضامین کا انتخاب کیا۔ داخلہ ریگولر طالب علم کی حیثیت سے لیا لیکن پڑھائی پرائیویٹ طلبہ کی طرح کی، کیونکہ تین ملازمتوں کے ساتھ کالج جانا اور کلاسوں میں حاضری دینا ممکن ہی نہیں تھا۔ دو سال کیسے گزرے، پتا بھی نہیں چلا۔ کب ایم اے کے امتحانات آئے؟ کس طرح تیاری کی؟ کیسے امتحانات دیے؟ ایک دوست نے بتایا کہ اخبار میں رزلٹ چھپا ہے۔ میں سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہو گیا تھا۔ بیرسٹر اصغر علی کے مشورے پر ایل ایل بی کرنے کا فیصلہ کیا اور رائس ایم کالج میں داخلہ لے لیا۔ جب اصغر صاحب نے یہ مشورہ دیا تو مجھے تین ملازمتوں کے ساتھ اس پر عمل کرنا ناممکن محسوس ہوا تھا۔ جب میں نے ان سے کہا کہ نہیں ہو پائے گا تو انہوں نے فرمایا:

Everyone has to take a Dive in the river. Either he will be in or he will be out. But that one dive, everybody has to take

زندگی میں ہر شخص کو ایک موقع ضرور ملتا ہے کہ وہ استفادے کی ہر ممکن کوشش کرے، یا تو مشکلات کے سمندر میں غوطہ کھا کر ڈوب جائے گا یا باہر نکل آئے گا۔ بہر حال اس ایک موقع کو استعمال ضرور کرنا چاہیے۔ اُن کی اس بات نے مجھے یکسو کر دیا۔

یہاں بھی باقاعدہ کلاس لینے کی سعادت سے محروم رہا۔ خدا کا شکر ہے کہ کسی نے پوچھنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ اس دوران جیکب لائن میں حکومت سرکاری ملازمین کے لیے مکانات تعمیر کر چکی تھی۔ ہمارے گھر والے بھی وہاں شفٹ ہو گئے۔ بڑی بہن کوئٹہ میں مقیم تھیں۔ ایک بچے کی ولادت کے دوران کسی پیچیدگی کی وجہ سے زیادہ خون ضائع ہوا اور ان کا انتقال ہو گیا۔ پورے خاندان خاص طور پر اماں کے لیے لاڈلی بیٹی کی اچانک جدائی بہت بڑا صدمہ ثابت ہوئی۔ لیکن اللہ نے اماں کو بے پناہ صبر اور حوصلہ بخشا تھا۔ انہوں نے کچھ عرصے کے بعد ہمارے بہنوئی ریاض اللہ خان کی دوسری شادی خود کرائی۔

کلاس روم اور اساتذہ کے چہروں سے نا آشنائی ایل ایل بی میں میرے لیے رکاوٹ نہ بن سکی۔ ایل ایل بی کی کشتی ابھی ساحل تک نہیں پہنچی تھی کہ ڈپلومہ ان جرنلزم میں داخلے کے لیے کراچی یونیورسٹی کا رخ کیا۔ داخلہ تو آسانی سے مل گیا لیکن صورت حال توقع کے برعکس تھی۔ صدر شعبہ پروفیسر شریف المجاہد بے حد با اصول اور ڈسپلن کے پابند انسان تھے۔ فضل قریشی میرے کلاس فیلو تھے اور ان کا گھر جیکب لائن ڈاکخانے کے ساتھ تھا۔ وہ بھی صبح سے شام تک ملازمت میں مصروف رہا کرتے تھے اور میری ہی طرح کلاس سے مسلسل غیر حاضر رہا کرتے۔ بہر حال ان دنوں میں بطور رپورٹر ہمیں مختلف اخبارات میں کام سیکھنے کا موقع ملا۔ مجھے وکٹوریہ روڈ پر U.P.P (یونائیٹڈ پریس آف پاکستان) اور فضل قریشی کو

P.P.I (پاکستان پریس انٹرنیشنل) بھیجا گیا۔ U.P.P میں ٹریننگ کے دوران مجھے بابائے اردو مولوی عبدالحق کا انٹرویو کرنے کا موقع ملا۔ امتحانات نزدیک آگئے، لیکن ہمارے معمولات بدستور اپنے مخصوص انداز سے جاری تھے۔ ایک روز یونیورسٹی جانے کا اتفاق ہوا تو شریف المجاہد صاحب کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ دیکھتے ہی کہا کہ تم لوگ کلاس میں نہیں آتے، پڑھائی کیا کرتے ہوگے! اتنی کم حاضری پر امتحانات میں بیٹھنے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا۔

ہمارا سال ضائع ہوگیا۔ اگلے برس ٹوٹی پھوٹی تیاری کے ساتھ امتحان دیا اور تھرڈ ڈویژن حاصل کی۔ فضل قریشی نے تربیت کے مرحلے میں ایسی دلچسپی دکھائی کہ پی پی آئی کے ہی ہوکر رہ گئے۔ صحافتی اداروں سے افراد کی ایسی طویل رفاقت بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ فضل قریشی جیسے بلند قامت فرد سے تعلقِ قلبی پر مجھے ہمیشہ فخر محسوس ہوا۔

1956ء میں ایل ایل بی کی ڈگری بھی مل گئی۔ سرکاری افسر بننے کا شوق مجھے نوجوانی میں پیدا ہوا تھا۔ اس زمانے میں آئی سی ایس یعنی انڈین سول سروس ہندوستان کا سب سے معتبر ادارہ ہوا کرتا تھا۔ جو لوگ اس کا امتحان پاس کر لیتے تھے وہ بڑے افسر بن جاتے تھے اور معاشرے میں ان کی حیثیت بہت نمایاں ہوجاتی تھی۔ کراچی آنے کے بعد بھی میرے ذہن میں یہی دھن سمائی ہوئی تھی۔ پاکستان ایڈمنسٹریٹو سروس کے امتحان میں بیٹھنا ایک خواب کی مانند تھا۔ اس کے لیے خوب تیاری کرنی پڑتی تھی۔ 1955.56ء میں اس امتحان میں بیٹھا۔ اُس وقت میں ایئر ہیڈکوارٹرز میں بھی ملازم تھا۔ تحریری امتحان میں پاس ہوگیا، حالانکہ اس امتحان میں لوگ دو تین سال میں پاس ہوا کرتے تھے۔ میرا ڈومیسائل کراچی کا تھا اور کراچی کی سیٹیں اُس وقت بھی بہت کم تھیں۔ انٹرویو میں فیل ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ کامیاب ہونے والے امیدوار مجھ سے بہتر ہوں گے۔ دوسری بار امتحان دینے کا ارادہ کیا تو محض ایک دن کے فرق سے Over age ہوگیا۔ بہت کوشش کی لیکن یہ مسئلہ حل نہ ہو سکا۔

این ایم خان جو مشرقی پاکستان کے چیف سیکریٹری رہ چکے تھے اور ہمارے افسر تھے، ان سے بات کی۔ وہ میری محنت اور بھاگ دوڑ سے متاثر تھے اور میری ترقی کے خواہاں تھے۔ سروس کمیشن کے چیف ضیاء الدین یا ضیاء اللہ صاحب ان کے دوست تھے۔ این ایم خان نے انہیں خط لکھا:

Mr. Niamatullah Khan, about whom I am writing this letter was born one hour before he should have. You will agree with me that its non of his fault.

اس خط کے باوجود مجھے امتحان دینے کی اجازت نہیں مل سکی۔ سرکاری افسر بننے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

عہدِ جوانی کی کچھ تصاویر

وکالت کا پیشہ اپنالیا

اب میرے پاس دو راستے تھے، صحافت کو بطور پیشہ اپنالوں یا پھر وکالت شروع کروں۔ بیرسٹر اصغر علی کا مشورہ یاد آیا اور پریکٹس شروع کرنے کے لیے کچھ ذہن بن گیا۔ کس طرح آغاز کروں، وسائل کہاں سے آئیں گے؟ دفتر کے لیے جگہ کہاں ملے گی؟ کلائنٹس کون لے کر آئے گا؟ ایسے سوالات نے الجھن میں مبتلا کر دیا۔ اللہ کا نام لیا اور ہارون الرشید کو ساری صورت حال بتا کر پانچ ہزار روپے بطور قرض طلب کیے۔ یہ سوچ رکھا تھا کہ اگر قرض کی واپسی کے لیے پیسے نہ ہوئے تو اپنا پی ای سی ایچ ایس والا پلاٹ فروخت کروں گا، جو اس دور میں بہت ہی کم قیمت میں قسطوں پر خریدا تھا۔ وزیر مینشن نکل روڈ پر ایک عمارت کی پہلی منزل پر ایک چھوٹا سا کمرہ تین ہزار روپے پگڑی اور دو سو روپے ماہانہ کرائے پر حاصل کیا۔ ٹیلی فون کے بغیر وکیل کے دفتر کا چلنا بہت مشکل تھا، اور اس زمانے میں ٹیلی فون کا کنکشن لینا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ اس موقع پر ایک پرانے دوست حافظ الیاس کام آئے جو وزیر مواصلات رمیض الدین صاحب کے ذاتی معاون تھے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ وزیر موصوف کے دفتر میں لے گئے اور رمیض الدین صاحب سے تعارف کروا کر مسئلہ بیان کیا۔

انہوں نے فرمایا: Where is your application۔ بنگالی ہونے کی وجہ سے رمیض الدین صاحب کا شین قاف اٹکتا تھا، اس لیے انگریزی میں گفتگو کو ترجیح دیتے تھے۔ درخواست کا پوچھنے پر میں نے جیب میں رکھی ہوئی ٹائپ شدہ درخواست ان کے

ہاتھ میں تھمادی۔ پڑھے بغیر اس پر نوٹ لکھ دیا ــــ May be given (فون دیا جا سکتا ہے!) اگلے دن دفتر پہنچا تو ٹیلی فون نصب کیے جانے کا ڈیمانڈ نوٹس آچکا تھا جسے جمع کروا دیا، اور رابطے کی یہ کمی بھی دور ہوگئی۔ میدان نیا تھا، لوگ پرانے شہسواروں کو بھی ٹھونک بجا کر کیس حوالے کرتے تھے۔ نئے کو کون پوچھتا! شاہجہان پور کے گاؤں ''اکینورا'' کے رہنے والے دوست سید نذیر احمد لیاقت آباد دس نمبر میں رہائش پذیر اور ٹھیکیداری کا کام کرتے تھے۔ ایک کیس لے کر آئے۔ کیس بھی کیا تھا؟ کوئی دستاویز لکھوانی تھی۔ منٹوں میں نمٹا دیا۔ پچیس روپے معاوضہ ملا۔

انکم ٹیکس کے وکیل کی حیثیت سے کام کرنا آسان کام نہیں تھا۔ لوگ آکر کہتے کہ کیس جمع کروادیں اور ٹیکس کم سے کم دینا پڑے۔ کچھ لوگ کہتے کہ ہم اپنی آمدنی میں سے حساب کتاب کرکے ڈھائی فیصد زکوۃ نکال کر مستحقین کو دے دیتے ہیں، اگر حکومت کو پورا ٹیکس دیں گے تو ہمارے پاس کیا بچے گا؟ میں ایسے لوگوں کو سمجھانے کی پوری کوشش کرتا کہ زکوۃ الگ چیز ہے اور ٹیکس الگ۔ زکوۃ فرض عبادت ہے، جبکہ ٹیکس سے ملک کے کئی طرح کے اخراجات پورے ہوتے ہیں۔ جو لوگ ٹیکس چوری کرنا چاہتے تھے، اُن کا کیس لینے سے معذرت کرلیتا۔

میرا زندگی بھر کا مشاہدہ یہ رہا کہ لوگ جس طرح اپنی مرضی سے زکوۃ دیتے ہیں، اسی طرح ٹیکس بھی دینا چاہتے ہیں، لیکن حکومتوں نے ٹیکس کی وصولی کے نظام کو پیچیدہ بنایا ہوا ہے اور ٹیکس کے محکمے کے افسران اور اہلکار اس پیچیدہ نظام کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ رشوت کے عوض اپنے کلائنٹس کو ٹیکس چوری کی ترغیب دیتے ہیں اور ملکی خزانے کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔ پاکستان بدقسمتی سے دنیا کے اُن ملکوں میں شامل ہے جہاں انکم ٹیکس دینے والوں کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ زراعت کے شعبے پر انکم ٹیکس لاگو نہیں ہوتا جبکہ کاروباری حضرات کا دو الگ طرح کے اکاؤنٹس رکھنا ایک عام سی بات ہے۔

انکم ٹیکس کا دفتر ناز سینما کے سامنے تھا، ٹیکس ریٹرن جمع کرانے میں خود جاتا تھا۔ دن گزرتے رہے یہاں تک کہ صدر اسکندر مرزا نے 7 اور 8 اکتوبر 1958ء کی شب کو پاکستان کی تاریخ کا پہلا مارشل لا لگا دیا۔ اور اس وقت کے آرمی چیف ایوب خان کو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا۔ ایوب خان نے 20 دن کے اندر اسکندر مرزا کو اقتدار سے بے دخل کر کے پہلے کوئٹہ پھر برطانیہ بھجوا دیا۔ مارشل لاء حکام نے اعلان کیا کہ ایسے افراد جنہوں نے اب تک آمدن و خرچ کے گوشوارے جمع نہیں کروائے وہ اپنا حساب کتاب بمع ٹیکس جمع کرا دیں، ہم جرمانہ عائد نہیں کریں گے اور ٹیکس بھی کم وصول کریں گے۔ یہ حکم نامہ آنے کی دیر تھی کہ کیسر کی لائن لگ گئی اور خوش حالی کا دور شروع ہو گیا۔ حالات نے بہتری کی مزید منازل طے کیں تو جیکب لائن سے نکل کر ناظم آباد نمبر دو میں کرائے کا مکان 216 روپے ماہوار پر حاصل کیا۔

والدہ اور بہن نے کسی تقریب میں ایک لڑکی کو دیکھا اور مجھے بتایا کہ ہم نے تمہارے لیے لڑکی پسند کر لی ہے، اگر تم چاہو تو دیکھ سکتے ہو۔ شریعت نے اگرچہ اس بات کی اجازت دی ہے لیکن مجھے اماں اور بہن کی پسند پر پورا بھروسا تھا۔ ایک جھلک یا تصویر دیکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی۔ کچھ دنوں کے بعد اماں اور بہن نے باقاعدہ رشتہ لے جا کر بات پکی کر دی۔

سسرال والوں نے مختلف ذرائع سے چھان بین کی، ذاتی کردار، دوست احباب، ذریعہ معاش غرض ہر چیز کے متعلق تسلی کی گئی۔ 16 جنوری 1960ء کو زندگی کے نئے سفر کا آغاز ہوا اور طاہرہ میری زندگی کا حصہ بن گئیں۔ اہلیہ طاہرہ دو بھائیوں اور چار بہنوں میں سب سے بڑی تھیں۔ انہوں نے ہمارے خاندان کو پوری طرح اپنایا اور اماں کو ساس نہیں سگی والدہ کا مقام دیا۔ گھر زمین پر جنت کا ٹکڑا لگنے لگا تھا۔

پچاس کی دہائی میں جیکب لائن کے جس خیمے میں میری رہائش تھی وہیں جماعت

اسلامی کے افتخار احمد (1970ء کے انتخابات میں سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے) اور رجب علی رہا کرتے تھے۔ یہ دونوں حضرات میرے خیمے کے پیچھے جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔ اکثر ملاقات ہوتی تو مولانا مودودی کی کتابیں اور کتابچے پڑھنے کے لیے تھما دیا کرتے۔ مولانا کا نام میں نے بہت سن رکھا تھا کہ کوئی ان کی کتابیں پڑھ لے تو اس کا دماغ پلٹ جاتا ہے اور وہ مولوی بن جاتا ہے۔ یہ بات میرے دماغ میں بیٹھی ہوئی تھی، اس لیے وہ کتابیں پڑھنے کے بجائے طاق پر رکھ دیا کرتا تھا۔ یہ حضرات واپس لینے کے لیے آتے اور پوچھتے پڑھ لیں؟ مطمئن کرنے کے لیے کہہ دیتا ہاں دیکھ لی ہیں۔ طویل عرصے تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ گھر کی تبدیلی کی وجہ سے ان حضرات سے رابطہ منقطع ہوگیا، یہاں تک کہ ناظم آباد بلاک ایف میں ذاتی مکان تعمیر کرایا اور اہل خانہ یہاں شفٹ ہو گئے تو نزدیک ہی جماعت اسلامی کے مقامی حلقے کے ناظم صدیق صاحب سے جو بلاک "بی" میں رہتے تھے، سلام دُعا ہوئی۔ دوسری جانب اپنے دفتری کاموں کے سلسلے میں انکم ٹیکس بلڈنگ جانے کا موقع ملتا رہتا تھا۔ ایک روز انکم ٹیکس بلڈنگ کے بار روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ کچھ فاصلے پر یوسف صاحب (مسلم لیگ کے پکے حمایتی) بیٹھے ایک کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے۔ "کیا پڑھ رہے ہیں؟" پوچھا تو بجائے نام بتانے کے، کہنے لگے "یار! بڑی عجیب کتاب ہے"۔ اُن کے ہاتھ سے کتاب لے کر تھوڑا مطالعہ کیا تو بڑی دلچسپ معلوم ہوئی۔ میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہنے لگے "بھئی یہ نزدیک ہی اسٹینڈرڈ فوٹو گراف والے اسرار صاحب ہیں نا، اُن کی دکان پر بہت سی کتابیں موجود ہیں اور وہ ڈسکاؤنٹ بھی بہت دیتے ہیں"۔ بغیر کچھ کہے اسرار صاحب کی دکان کی جانب چل دیا۔ اور پہلے تو وہی کتاب خریدی جو یوسف صاحب پڑھ رہے تھے۔ پھر کوئی ڈیڑھ سو روپے کی مزید کتابیں خریدیں اور اگلے کچھ دنوں میں پڑھ ڈالیں۔ صدیق صاحب سے ایک مرتبہ پھر ملاقات ہوئی، اس مرتبہ اُن کے کچھ کہنے سے قبل میں نے آفر کر ڈالی کہ آپ لوگ اپنے اجتماعات میرے گھر پر

منعقد کرلیا کریں۔

1965ء کی جنگ شروع ہوئی تو ملک میں مارشل لا نافذ تھا اور ایوب خان مارشل لا ایڈمنسٹریٹر تھے۔ جنگ شروع ہوئی، ایوب خان نے ریڈیو پر قوم سے پر جوش خطاب کیا اور آخر میں کلمہ بھی پڑھا۔ پورا ملک جذبہ جہاد اور شوقِ شہادت کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بھارت کی جانب سے گولہ باری کے دوران کچھ گولے کیماڑی اور بہار کالونی میں بھی آ کر گرے تھے۔ مغرب ہوتے ہی ہر قسم کی روشنیاں گل کر کے بلیک آؤٹ کر دیا جاتا۔ فوجیوں کو سڑک سے گزرتا دیکھ کر عوام ان کے حق میں نعرے لگاتے۔ سترہ دن کی جنگ کے دوران باوجود کوشش کے کام پر جانے کا موڈ نہیں ہوتا تھا۔ ریڈیو سے خبریں ملتیں کہ پاک فوج نے دشمن کے اتنے ٹینک تباہ کر دیے، درجنوں فوجی ہلاک کر دیے۔ قوم کا مورال ایسی خبروں سے مزید بلند ہو جاتا تھا۔ جنگ کے دوران ہی بیٹے کلیم کی لیاقت آباد گورنمنٹ ہسپتال میں ولادت ہوئی۔ اُس زمانے میں سرکاری ہسپتالوں میں سیاسی اور سفارشی بھرتیاں نہیں ہوا کرتی تھیں اور ان کا معیار بہت اچھا ہوتا تھا۔

زندگی میں پہلے ذاتی مکان کے لیے پلاٹ کا حصول اور اس کی تعمیر کا معاملہ بھی خوب تھا۔ 1966ء کی بات ہے جنگ ختم ہوئے کچھ ہی عرصہ گزرا تھا۔ نارتھ ناظم آباد کے بلاک F کے پلاٹ E-47 کے مالک شناسا تھے اور ایک بینک میں ملازمت کرتے تھے۔ انہیں 19 ہزار روپے قسطوں میں ادا کر کے پلاٹ کا سودا کیا۔

ابتدا ہی سے ذاتی مکان کے متعلق ذہن میں تصور قائم تھا کہ پلاٹ وسیع اور اس پر تعمیر مختصر ہونی چاہیے۔ بلڈنگ کوڈ کے اعتبار سے کُل رقبے میں ایک تہائی حصے پر تعمیر کی اجازت تھی۔ اس اعتبار سے 600 مربع گز پر مکان بنانے میں 2 لاکھ 76 ہزار روپے خرچ ہو گئے۔ 67ء کے آخر میں تعمیر مکمل ہونے کے بعد ایک حصے کو کرائے پر اٹھا دیا۔ نزدیک ہی اپنا کلینک چلانے والے ڈاکٹر نے یہاں رہائش اختیار کی۔ بالائی حصے میں بھی دو کمرے

بنوائے تھے۔ بعد ازاں برادرم سید منور حسن اپنے آبائی گھر کی تقسیم کی وجہ سے یہاں منتقل ہو گئے اور دس برس تک یہاں رہے۔

اہلیہ گھر کا انتظام نہایت خوش اسلوبی سے سنبھالے ہوئے تھیں اور بچوں کی تعلیم کے معاملات بھی خود ہی دیکھا کرتی تھیں۔ مجھے جماعت اسلامی کے احباب سے ملنے جلنے اور پروگرامات میں شرکت کا باقاعدگی سے موقع ملتا رہا۔

26 مارچ 1969ء کو ایوب خان نے ملک میں جاری ہنگاموں اور عوامی دباؤ کے پیش نظر استعفیٰ دے دیا اور اقتدار اسپیکر کے بجائے کمانڈر ان چیف یحییٰ خان کے سپرد کر دیا۔ 28 نومبر کو یحییٰ خان نے اپنی نشری تقریر میں 3 اکتوبر 1970ء کو ملک میں عام انتخابات کا اعلان کر دیا۔

خانۂ کعبہ اور مسجدِ نبوی میں حلف کا اعزاز

ستر کی دہائی میں ملک میں اسلام اور سوشلزم کی نظریاتی کشمکش عروج پر تھی۔ اشتراکی قوتوں نے اپنی طاقت کے اظہار کے لیے پورے ملک میں 19 اپریل 1970ء کو ہڑتال کا اعلان کیا۔ ہڑتال کے پروگرام سے پہلے جماعت اسلامی نے قوم سے اپیل کی کہ 19 اپریل کی ہڑتال سے لاتعلقی رکھی جائے اور اسے کامیاب نہ ہونے دیا جائے تا کہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ پاکستان ایک اسلامی نظریاتی ریاست ہے اور یہاں سوشلزم سمیت کوئی دوسرا ازم کامیاب نہیں ہوسکتا۔

مولانا مودودیؒ کی اس اپیل کا خاطر خواہ اثر ہوا اور 19 اپریل کی ہڑتال بری طرح ناکام ہوگئی۔ مولانا مودودیؒ نے واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ "اس ملک میں اسلام کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس ملک کو دارالاسلام بن کر رہنا ہے یا مارکس اور لینن کی امت کا ملک بن جانا ہے"۔ مولانا مودودیؒ نے تمام دینی جماعتوں اور عوام سے اپیل کی کہ وہ 31 مئی 1970ء کو "یوم شوکتِ اسلام" کے طور پر منائیں۔

31 مئی پاکستان کی تاریخ کا ایک اہم اور یادگار دن ثابت ہوا۔ لاہور، پشاور، کوئٹہ، ڈھاکہ، چٹاگانگ اور کراچی سمیت ملک کے تمام چھوٹے بڑے شہر اور قصبے "پاکستان کا مطلب کیا... لا الہ الا اللہ" کے نعروں سے گونج اٹھے۔ انتہائی پرامن اور منظم جلوس نکالے گئے اور مظاہرے ہوئے۔ لاہور میں امیر جماعت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، اکابرینِ جماعت اور دیگر دینی جماعتوں کے رہنماؤں نے بہت بڑے جلوس کی قیادت کی، جبکہ کراچی

میں نائب امیر جماعت میاں طفیل محمد نے ایک عظیم الشان جلوس کی قیادت کی۔ اس دوران مشرقی پاکستان میں اس قدر شدید سیلاب آیا کہ الیکشن کو 7 دسمبر 1970 تک ملتوی کرنا پڑا۔

جماعت نے کراچی سے قومی اسمبلی کے لیے پروفیسر غفور احمد، محمود اعظم فاروقی، صابر حسین شرفی، سید ذاکر علی، عبدالستار افغانی اور پیر محمد کو امیدوار نامزد کیا، جبکہ مولانا ظفر احمد انصاری صاحب کی حمایت کی گئی جو آزاد حیثیت سے انتخابات میں حصہ لے رہے تھے۔ صوبائی اسمبلی کی چودہ نشستوں پر بھی امیدوار کھڑے کیے گئے۔ ملک کے دونوں حصوں میں زبردست انتخابی مہم چلائی گئی۔ کارنر میٹنگز، جلسے، جلوس اور گھر گھر جا کر لوگوں سے رابطے کیے گئے۔ قیادت اور کارکن انتخابی مہم سے پوری طرح مطمئن تھے اور اخبارات بھی جماعت اسلامی کے امیدواروں کی ممکنہ کامیابی کی نوید سنا رہے تھے، لیکن الیکشن والے دن بیلٹ بکسوں سے جو نتائج برآمد ہوئے وہ توقع کے بالکل برخلاف تھے۔ مغربی و مشرقی پاکستان میں جماعت اسلامی کو بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ کراچی میں قومی اسمبلی کے امیدواروں میں سے پروفیسر غفور احمد، محمود اعظم فاروقی اور ہمارے حمایت یافتہ مولانا ظفر احمد انصاری کامیاب ہوئے، جبکہ صوبائی اسمبلی کی صرف ایک نشست پر افتخار احمد کامیاب ہو سکے۔ مجموعی انتخابی نتائج نے عجیب صورت حال پیدا کر دی۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ نے 162 میں سے 160 نشستیں حاصل کرلیں۔ جب کہ مغربی پاکستان میں پاکستان پیپلز پارٹی نے 138 میں سے 81 نشستیں جیت لیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر مولانا مودودیؒ نے تبصرہ کیا: "آج پاکستان کو تقسیم کرنے کی بنیاد رکھ دی گئی ہے"۔ آنے والے حالات نے ان کی بات حرف بہ حرف سچ ثابت کر دی۔ اقتدار کی کشمکش کشیدگی میں تبدیل ہوگئی، حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ یحییٰ خان کے اللے تللے اور عیاشیاں تھیں کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ اس دوران یہ اطلاعات تھیں کہ شیخ مجیب الرحمٰن نے ذوالفقار علی بھٹو سے کہا ہے

فہرست پر جائیے

کہ آپ مجھے پاکستان کا وزیر اعظم بننے دیں ورنہ یہ ملک تقسیم ہو جائے گا۔ اور بد قسمتی سے ایسا ہی ہوا۔

مشرقی پاکستان کی آبادی مغربی پاکستان سے کچھ زیادہ تھی اور وہاں بنگالی بولنے والے مسلمانوں کی غالب اکثریت تھی۔ جاگیردار، وڈیرے، خان، سردار اور سیاسی طور پر مضبوط پیر وہاں نہ ہونے کے برابر تھے۔ عوامی لیگ سب سے بڑی اور مقبول سیاسی جماعت تھی۔ مسلم لیگ کا کردار بہت محدود ہو چکا تھا، جبکہ جماعت اسلامی صوبے کے تمام حصوں میں مضبوط تنظیمی لیکن محدود سیاسی قوت رکھتی تھی۔ عوامی لیگ کے لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن مڈل کلاس سے تعلق رکھتے تھے اور پاکستان کی اشرافیہ خاص طور پر اسٹیبلشمنٹ کے رویے سے نالاں تھے۔

مشرقی پاکستان میں اپنے ہی لوگوں کے خلاف کیے جانے والے فوجی آپریشن نے حالات کو بد سے بدترین بنا دیا۔ یحییٰ خان اور جنرل ٹکا خان حالات کی سنگینی کا اندازہ لگانے میں بری طرح ناکام رہے اور جلتی پر تیل چھڑکتے رہے۔ جماعت اسلامی نے مارچ کے فوجی آپریشن کی مخالفت کی اور مطالبہ کیا کہ اقتدار اکثریتی جماعت کے حوالے کیا جائے۔ لیکن مغربی پاکستان میں اقتدار کی غلام گردشوں میں کچھ اور ہی منصوبے پروان چڑھ رہے تھے۔

جب عوامی لیگ نے مکتی باہنی کو ہندوستان کی مدد سے مسلح کیا اور غیر بنگالی مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا تو جماعت نے یہ دیکھتے ہوئے کہ ملکی سالمیت کو شدید خطرات لاحق ہو گئے ہیں، عوامی لیگ کی کھل کر مخالفت اور فوج کی مشروط حمایت کا فیصلہ کیا۔ فوج کی بنائی ہوئی رضا کار تنظیم البدر میں جمعیت کے نوجوانوں نے شمولیت اختیار کی اور ملک کو بچانے کی لڑائی میں غیر معمولی قربانیاں پیش کیں۔

مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا اسے لکھنے کا حوصلہ مجھ میں نہیں ہے۔ خون اور آنسوؤں

کی اس المناک داستان کو مختلف لوگوں نے قلم بند کیا ہے، لیکن یہ نا کافی ہے اور اس کے کئی اہم پہلو اب بھی تشنہ ہیں۔

16 دسمبر 1971ء، سقوط بغداد کے بعد امت کی تاریخ کا سب سے سیاہ دن ہے، جب اپنوں اور غیروں کی سازشوں اور لسانی تعصب کے کامیاب وار نے ملک کو دو لخت کر دیا اور بنگلہ دیش وجود میں آ گیا۔ اس سانحے سے ایک دو دن قبل جنرل امیر عبداللہ نیازی عرف ٹائیگر اپنے دفتر میں کرسی سے ٹیک لگائے بڑے طمطراق سے فرما رہے تھے کہ دشمن کی فوجیں ہماری لاشوں پر سے گزر کر اس ملک میں داخل ہوں گی۔ لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ چشم فلک نے دیکھا کہ ہماری فوج نے سر جھکا کر دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ ایسا نہیں ہے کہ مشرقی محاذ پر فوجی افسروں اور سپاہیوں نے بہادری کا مظاہرہ نہیں کیا اور جانوں کے نذرانے پیش نہیں کیے۔ اکثر مقامات پر فوج اور رضا کار بڑی بے جگری سے لڑے اور مکتی باہنی و انڈین فوج کو نقصان بھی پہنچایا، لیکن ایک مشکل محاذ پر جب عوام کی اکثریت آپ کے خلاف ہو چکی ہو، کوئی بھی فوج جنگ میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتی، اور وہاں تو کسی کو یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ مغربی پاکستان کی اشرافیہ جنگ لڑنا چاہتی بھی ہے یا اہل بنگال کو بوجھ سمجھ کر از خود الگ کیا جا رہا ہے۔

ملک کا ایک بازو کٹ گیا۔ تاریخ کے ساتھ ساتھ جغرافیہ بھی بدل گیا لیکن بے حس لوگوں کو نہ شرم آئی اور نہ غیرت۔

31 دسمبر کی رات کراچی اور لاہور میں طبقہ اشرافیہ کے سفاک لوگ نئے سال کی آمد کا جشن منا رہے تھے۔ کراچی کے پنج ستارہ ہوٹلوں میں شراب کے دور چل رہے تھے اور رقص و سرود کی محفلیں ان لوگوں کا غم غلط کر رہی تھیں۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

سقوطِ ڈھاکہ کے دو دن بعد یعنی 18 دسمبر کی شام کو جنرل یحییٰ نے اپنا استعفیٰ تحریر کیا، اور امریکا میں موجود ذوالفقار علی بھٹو کو خط لکھا کہ وہ پاکستان آکر اقتدار سنبھالیں۔ ذوالفقار علی بھٹو 20 دسمبر کو راولپنڈی پہنچے اور ایوانِ صدر جا کر انہوں نے اپنے عہدے کا حلف اٹھایا۔

اقتدار سنبھالتے ہی موصوف نے فوج کے کچھ جرنیلوں کی چھٹی کر دی اور کچھ کو آؤٹ آف ٹرن ترقی دی۔ مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن کی قیادت کرنے والے جنرل ٹکا خان کو بری فوج کا سربراہ مقرر کر دیا گیا۔ 17 اپریل 1972ء کو نئے آئین کی تیاری کے لیے ایک 25 رکنی آئین ساز کمیٹی تشکیل دی۔ اس میں تمام سیاسی جماعتوں کی نمائندگی تھی۔ پروفیسر غفور احمد جماعت اسلامی کی طرف سے شامل تھے۔ کمیٹی کے سربراہ وزیر برائے قانون اور پارلیمانی امور میاں محمود قصوری تھے۔ بعد میں انہوں نے استعفیٰ دے دیا اور ان کی جگہ عبدالحفیظ پیرزادہ کو کمیٹی کا چیئرمین بنا دیا گیا۔

20 اکتوبر 1972ء کو کمیٹی نے آئین کے مسودے کو حتمی شکل دے کر قومی اسمبلی کے حوالے کیا۔ 10 اپریل 1973ء کو اس کی منظوری دی گئی، جبکہ صدر کی توثیق کے بعد 14 اگست 1973ء کو اسے نافذ کر دیا گیا۔

آئین کے تحت اسلام پاکستان کا سرکاری مذہب قرار پایا، جبکہ صدر اور وزیر اعظم کے لیے مسلمان ہونا لازمی قرار دیا گیا۔ اردو کو قومی زبان قرار دیا گیا اور عدلیہ کی آزادی کی ضمانت دی گئی۔ اہم ترین اور تاریخی نکتہ یہ تھا کہ عقیدۂ ختم نبوت کے منکرین یعنی قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا۔

جولائی 1972ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت نے سندھی کو صوبے کی سرکاری زبان بنانے کا بل صوبائی اسمبلی سے منظور کروالیا۔ اس اقدام کے خلاف اردو بولنے والے افراد نے کراچی، حیدرآباد، سکھر اور دیگر شہروں میں سخت احتجاج کیا۔ دونوں طرف کے کچھ

لیڈروں نے اس مسئلے کو مذاکرات اور افہام و تفہیم سے حل کرنے کے بجائے اشتعال انگیز بیانات دیے جس کی وجہ سے منافرت اور تعصب کی فضا پیدا ہوگئی اور شہری زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی۔ شدید ہنگامے پھوٹ پڑے اور 55 افراد ہلاک جبکہ سینکڑوں زخمی ہوگئے۔ سیکڑوں دکانیں لوٹ لی گئیں یا نذرِ آتش کردی گئیں۔ کراچی، حیدرآباد، سکھر اور دیگر شہروں میں کئی کئی دن کرفیو نافذ رہا۔ لوگوں کو نقل مکانی پر بھی مجبور ہونا پڑا۔ ان لسانی فسادات کو فرو کرنے میں جماعت اسلامی نے بہت مثبت اور تعمیری کردار ادا کیا۔ جماعت کے پارلیمانی لیڈر اور رکن قومی اسمبلی پروفیسر غفور احمد کو حکومت نے لسانی مسئلہ پر مذاکرات میں شرکت کی دعوت دی۔ وہ ان مذاکرات میں سمجھوتہ ہونے تک شریک رہے۔ سمجھوتے کے مطابق سندھی اور اردو دونوں زبانوں کو سندھ کی سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا۔ پاکستان کے باقی ماندہ تین صوبوں پنجاب، سرحد اور بلوچستان کی حکومتوں نے پہلے ہی اردو کو اپنے صوبوں کی سرکاری زبان کا درجہ دے دیا تھا، جبکہ اُس وقت بھی دفاتر، بیوروکریسی اور عدلیہ کی زبان انگریزی ہی تھی اور اگلی کئی دہائیوں تک بھی صورت حال میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ نوجوان نسل کو اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ تبدیلی جذباتی نعروں اور اعلانات سے نہیں آجاتی، بلکہ اس کے لیے سازگار ماحول اور حکمرانوں کی سیاسی خواہش کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارا طبقہ اشرافیہ انگریز کے جانے کے باوجود خود کو ذہنی غلامی سے آزاد نہیں کرواسکا اور آج بھی انگریزی زبان اس ملک میں ترقی کی کنجی سمجھی جاتی ہے۔

بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

مجھے بندگانِ خدا کی خدمت کا شوق لڑکپن ہی سے تھا۔ اجتماعی ماحول سے وابستگی اپنے پسندیدہ کام یعنی خدمتِ خلق کی مصروفیات انجام دینے کے لیے سازگار ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر اطہر قریشی صاحب جماعت اسلامی کے ذمہ داران میں شامل تھے۔ بے حد پُرکشش اور بااخلاق انسان تھے۔ ایک دن اُن سے کہا: آپ کے پاس شادی بیاہ اور امداد کے سلسلے میں

جو درخواستیں آتی ہیں وہ مجھے دے دیا کریں۔ انکوائری کر کے سامان پہنچانے سمیت دیگر کام بھی کر دیا کروں گا۔ وہ بخوشی آمادہ ہو گئے۔ اہلیہ بھی ان کاموں کی جانب مائل ہو گئیں۔ کاموں میں ہاتھ بٹانا، امدادی سامان پیک کرنا اور سلیقے سے رکھنا از خود اپنے ذمہ لے لیا۔ ڈاکٹر اطہر قریشی نے مجھے خدمتِ خلق کا علاقائی انچارج بنا دیا۔ نیو کراچی کے ایک گھرانے کی جانب سے شادی کے لیے امداد کی درخواست موصول ہوئی۔ تحقیق کے لیے ان کے گھر پہنچا تو عالم یہ تھا کہ بٹھانے کے لیے ایک جھلنگی چارپائی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ گفتگو کے دوران پتا چلا کہ اگلے دن شادی ہے اور بچی کے سر پر رکھنے کے لیے ایک دوپٹہ تک نہیں ہے۔ دل لرز کر رہ گیا۔ کچھ سامان ساتھ لے کر گئے تھے، وہ حوالے کیا۔ شادی کا جوڑا، اسٹیل اور چینی کے برتن، روزمرہ ضروریات کی کچھ چیزیں اور پانچ سو روپے نقد دے کر جب واپس لوٹ رہا تھا تو خیال آیا کہ معاشرے میں اس قدر محرومی اور غربت ہے۔ کوئی ایسا میکنزم ہونا چاہیے کہ جس سے ضرورت مند بہتر انداز میں استفادہ کریں۔ حکیم صادق صاحب امیر کراچی تھے، اُن سے اس موضوع پر تفصیلی تبادلہ خیال ہوا، جس کے نتیجے میں انہوں نے جماعت اسلامی کراچی کے شعبہ خدمت خلق کو توسیع دینے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ سرگرمیوں میں اضافہ ہوا اور غریبوں کو علاج کے اخراجات، بیواؤں کو راشن، طلبہ کو وظائف، فیس کے انتظام سمیت دیگر مدات بھی شامل ہو گئیں۔

مطالعۂ کتب، اجتماعات میں شرکت، اور تفویض کی گئی ذمہ داریوں کو ممکنہ حد تک بہتر انداز میں انجام دینے کی کوشش میں مصروف دیکھ کر قریبی ساتھیوں اور ذمہ داران نے خیال ظاہر کیا کہ مجھے جماعت اسلامی کا رکن بن جانا چاہیے۔ 1974ء کا واقعہ ہے۔ پروفیسر غفور احمد امیر جماعت کراچی تھے اور رابطہ عالم اسلامی کی ایک میٹنگ میں شرکت کے لیے سعودی عرب گئے ہوئے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں حکیم صادق حسین قائم مقام امیر جماعت تھے۔ میرا بھی اہلیہ کے ہمراہ حج کی ادائیگی کا ارادہ بن گیا۔ روانگی سے قبل حکیم صادق

صاحب تشریف لائے اور فرمایا "آپ رکنیت کا یہ فارم پر کر دیں"۔ میں نے انہیں جواب دیا کہ "یہ فارم حج پر اپنے ساتھ ہی لیے جاتا ہوں۔ بھر کر واپس لے آؤں گا"۔ تو کہنے لگے "میں منور حسن (اس وقت کراچی کے قیم یعنی جنرل سیکرٹری تھے) کے ہاتھ دو فارم آپ کو بھجوا دوں گا، ایک بھر کر یہیں چھوڑ جایئے گا، دوسرا اپنے ساتھ لے جائیں۔ جب واپس لے کر آئیں گے تو یہ والا تلف کر دیں گے"۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ شام کو سید منور حسن گھر تشریف لائے۔ دیکھا تو ہاتھ میں ایک ہی فارم تھا، دوسرے کے متعلق پوچھا تو کہا "مجھے تو ایک ہی دے کر بھیجا ہے"۔ میں نے کہا کہ "ٹھیک ہے یہی دے دیجیے"۔ میں وہ فارم اپنے ساتھ سعودی عرب لے گیا، لیکن کسی وجہ سے بھر نہیں سکا۔ حج کے دوران پتا چلا کہ پروفیسر غفور صاحب بھی منیٰ میں موجود ہیں۔ اگلے دن ملاقات ہوئی، کہنے لگے "تیار ہیں؟ کل خانہ کعبہ میں رکنیت کا حلف لوں گا"۔ حسب پروگرام وہاں پہنچ تو گیا، پتا چلا کہ غفور صاحب ایک میٹنگ میں مصروف ہو گئے ہیں۔ میرے ساتھ صلاح الدین صاحب (مدیر جسارت) اور ایک پڑوسی موجود تھے۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ پروفیسر صاحب نے حلف لینے کا ضرور کہا ہے لیکن اب وہ موجود نہیں ہیں تو کوئی دوسرا ذمہ دار فرد یہ مسئلہ حل کر سکتا ہے۔ وہاں رحیم یار خان کے امیر جماعت موجود تھے، انہوں نے حلف لیا۔ حج کے بعد زیارت کے لیے مدینہ منورہ پہنچا تو راستے میں صفدر چودھری مل گئے۔ خیریت دریافت کرنے کے بعد کہنے لگے پروفیسر غفور احمد صاحب فلاں ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے ہیں۔ پہلے تو لرزتے کانپتے روضہ رسول ﷺ پر حاضری دی اور خدمت اقدس میں درود و سلام کا نذرانہ پیش کیا۔ روضہ رسول ﷺ پر حاضری اور مسجد نبوی میں نماز کی ادائیگی کے وقت جو کیفیت دل و دماغ پر طاری ہوئی اسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ پروفیسر غفور احمد جس ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے تھے وہاں جا پہنچا۔ انہیں علم نہیں تھا کہ میں حلف یافتہ ہو چکا ہوں۔ کہنے لگے "کل مسجد نبوی میں آپ کا حلف لوں گا"۔ جی میں آیا کہ بتا دوں، پھر خیال آیا کہ

پروفیسر غفور صاحب جیسے عاشق رسول ﷺ کے سامنے مسجد نبوی میں حلفِ رکنیت پڑھنا غیر معمولی بات ہے۔ اگلے دن طے شدہ وقت سے پہلے ہی پہنچ گیا۔ انہوں نے مسجد کے صحن میں حلف لیا۔ حج بھی ادا ہو گیا تھا اور دو مرتبہ رکنیت کا حلف بھی اٹھا لیا۔ اس کے بعد پاکستان واپسی کا قصد کیا۔ اہلیہ نے توجہ دلائی آپ کی شیو بڑھ گئی ہے، بنوالیں تو مناسب رہے گا۔ جواب دیا کہ اب ان شاء اللہ داڑھی رکھوں گا۔ کراچی پہنچا تو جماعت اسلامی ناظم آباد کے ذمہ داران کو خیال آیا کہ موصوف تو ہمارے علاقے کی حدود میں رہتے ہیں، اس ناتے حلف برداری تو یہیں ہونی چاہیے۔ انہیں بھی میرے دو مرتبہ حلف اٹھانے کے متعلق علم نہیں تھا۔ متین علی خان صاحب ناظم علاقہ تھے۔ تیسری مرتبہ انہوں نے حلف لیا اور ساتھ ہی میری رکنیت پر مہر ثبت کر دی گئی، کہ خالصتاً علاقے کا رکن ہوں۔

قفس کی سمت گئے بھی تو اپنی مرضی سے

21 اگست 1974ء کی شام مولانا مودودیؒ امریکا سے علاج کروا کر واپس لوٹے۔ طے کیا گیا کہ کارکنان کراچی ایئر پورٹ پہنچ کر بھرپور استقبال کریں گے۔ تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ایئر پورٹ پر تا حدِ نگاہ جماعت اسلامی کا پرچم تھامے کارکنان جمع تھے۔ مولانا ایئر پورٹ کی عمارت سے باہر آئے۔ استقبالی ہجوم ان کی جھلک دیکھنے کے لیے آگے بڑھا۔ بھگدڑ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ مولانا شدید ناراض ہوئے اور برہمی کا اظہار فرمایا۔ کچھ دیر بعد وہ باہر آئے اور اپنی اہلیہ کے بھائی کے گھر چلے گئے۔ دوسری گاڑی میں ان کی اہلیہ بیٹھ گئیں جسے میں چلا رہا تھا۔ مولانا کی اہلیہ راستے میں بھی ایئر پورٹ پر ہونے والی ہڑبونگ پر خفا تھیں، کہنے لگیں "اب تو آپ لوگ مولانا کا پیچھا چھوڑ دیں۔ دیکھیں تو سہی کیا حال کر دیا ہے ان کا (اشارہ مولانا کی خرابیِ صحت کی طرف تھا)۔" مجھے کارکنان کے جذباتی رویے پر افسوس ہوا اور احساس ہوا کہ استقبال کے لیے چند ذمہ داران کا ایئر پورٹ آنا ہی بہتر ہوتا۔ اسی رات فاروقی مسجد سعود آباد میں جلسہ عام کا انعقاد بھی کیا گیا تھا۔ سارے انتظامات مکمل تھے، ہزاروں لوگ مولانا کو سننے کے لیے وقت سے پہلے وہاں موجود تھے۔ جلسے کے منتظمین مولانا کو لینے کے لیے گھر پہنچے تو انہوں نے غصے سے انکار کر دیا۔ وہیں کچھ لوگ مولانا سے ملاقات کے لیے پہلے سے موجود تھے، ان میں ممتاز قانون دان اے کے بروہی بھی شامل تھے۔ انہوں نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو اصرار کیا "مولانا آپ ضرور شرکت کیجیے، لوگ دور دور سے آپ کو سننے کو آئے ہیں"۔ مولانا

اسے کے بروہی کی بڑی قدر کرتے تھے، چلنے پر آمادہ ہو گئے اور تیاری کے لیے اہلیہ سے کپڑے نکالنے کو کہا جو دوسرے کمرے میں تھیں۔ انہیں فکر لاحق ہوئی کہ ابھی علاج مکمل کروا کر پہنچے ہیں، پروگرامات میں شرکت کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا تو کہیں صحت پھر سے خراب نہ ہو جائے۔ اس لیے کمرے سے پوچھنے لگیں "کہاں جارہے ہیں؟" مولانا کا غصہ پوری طرح ٹھنڈا نہیں ہوا تھا، اس لیے تیز لہجے میں جواب دیا "قبرستان"۔ خیر کچھ دیر بعد موڈ بہتر ہو گیا تو کپڑے تبدیل کیے اور جلسے میں شرکت کے لیے روانہ ہو گئے۔ مولانا مودودی بہت بڑے آدمی تھے۔ بڑے لوگوں کی ایک نشانی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ خوشی، غمی یا غصے کے جذبات کو زیادہ دیر کے لیے اپنے حواس پر طاری ہونے نہیں دیتے۔ حاضرین جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا: "جو لوگ اللہ کی راہ میں استقامت دکھاتے ہیں وہ برابر آگے بڑھتے رہتے ہیں، کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی ان کا راستہ نہیں روک سکتی، کوئی تکلیف اور کوئی دکھ ان کے لیے زحمت کا باعث نہیں بنتا، وہ اپنی قربانیوں پر رنج یا افسوس نہیں کرتے بلکہ خوش ہوتے ہیں کہ اس راہ میں انہیں بھی کسی قابل سمجھا گیا۔ جب ان کے دلوں میں خدا کے سوا کسی کا ڈر نہیں رہتا تو اسٹین گنیں، آنسو گیس اور لاٹھیاں ان کا راستہ نہیں روک سکتیں۔ انہیں اس کی بھی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ خدا کی راہ سے ہٹنے والوں کو کتنی دولت یا کیسا عہدہ ملتا ہے، کون وزیر اعظم یا صدر رہتا ہے اور کسے محلات اور خزانے ملتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں ایسی کسی چیز کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ ان کے نزدیک اصل قدر وہی ہوتی ہے جو اللہ کے ہاں ہو۔

حضرات!

اللہ کی راہ میں ڈٹ جانے والوں کے لیے فرشتے مدد لاتے ہیں، لیکن اس طرح نہیں کہ آپ کو تختِ شاہی پر بٹھا دیں۔ آپ اپنے راستے پر استقامت کے ساتھ گامزن رہیں تو وہ آپ کو ہر مرحلے پر کامیاب کریں گے۔ اگر آپ اللہ کے سوا کسی کی پروا نہ کریں، اس کی

رضا کے سوا کسی کی خوش نودی آپ کے پیش نظر نہ ہو تو یقین رکھیں کہ آپ ضرور غالب آئیں گے۔ صرف اللہ پر بھروسا، اپنے مقصدِ حیات کے لیے مسلسل ایثار و قربانی، اور استقامت کے ساتھ مسلسل جدو جہد ہی آپ کو کامیابی سے ہم کنار کرسکتی ہے۔ یہی بات میں دنیا بھر میں اسلام کے لیے کام کرنے والوں سے کہتا ہوں اور یہی میری نصیحت تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کے لیے ہے۔"

پیپلز پارٹی کو 1970ء کے انتخابات میں کراچی سے قابلِ ذکر ووٹ نہیں مل سکے تھے، لیکن بھٹو صاحب نے کراچی کے عوام کے دل جیتنے کی کچھ کوششیں ضرور کیں۔ ان کے دور میں کراچی میں پاکستان اسٹیل مل، عباسی شہید ہسپتال، سندھ میڈیکل کالج، کمپری ہینسو ہائی اسکولز اور سپر مارکیٹ لیاقت آباد جیسے ادارے بنائے گئے۔

صنعتوں کو قومیائے جانے کی عجیب و غریب پالیسی نے البتہ شہر کراچی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا، جس کے منفی اثرات کئی دہائیوں تک ختم نہیں ہوسکے۔ سرکاری ملازمتوں میں دیہی و شہری کوٹہ سسٹم کا نفاذ بھی کراچی کے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہوا، بلکہ پورے صوبے پر اس کے منفی اثرات مرتب ہوئے۔ کسی بھی قوم اور قومیت کے نوجوانوں کے لیے مقابلے کی فضا بہت ضروری ہوتی ہے۔ کوٹہ سسٹم جیسے فیصلے قوموں کو پیچھے لے جاتے ہیں اور نوجوان مقابلے سے راہِ فرار اختیار کرنے لگتے ہیں۔

مارچ 1976ء میں بھٹو صاحب نے جنرل محمد ضیاء الحق کو بری فوج کا سربراہ مقرر کیا۔ بظاہر سیدھے سادے اور پروفیشنل افسر نظر آنے والے جنرل ضیاء آگے چل کر بھٹو صاحب کے لیے وبالِ جان ثابت ہوئے۔

بھٹو صاحب اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی تھے اور طویل عرصے تک اہم سرکاری مناصب پر رہ چکے تھے، عوام کے کئی طبقات میں مقبول بھی تھے، لیکن مزاج میں وڈیرہ شاہی اور آمریت کا عنصر بھی موجود تھا۔ مخالفت برداشت نہیں کرپاتے تھے اور مخالفین کو بزورِ قوت کچل دینے سے بھی

دریغ نہیں کرتے تھے۔ 1977ء میں جب انتخابات کی تاریخ کا اعلان ہوا، اپنی فسطائی پالیسیوں کی وجہ سے پیپلز پارٹی کی مقبولیت میں بے حد کمی واقع ہو چکی تھی۔ خاص طور پر بڑے شہروں کے لوگ خوش نہیں تھے۔ انتخابات کا اعلان ہوتے ہی ملک بھر کی تمام جماعتوں نے پیپلز پارٹی کی مخالفت میں ایک پرچم تلے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ پاکستان قومی اتحاد (پاکستان نیشنل الائنس) تشکیل دیا گیا۔ 1977ء کے انتخابات میں کراچی پاکستان قومی اتحاد کا سب سے مضبوط قلعہ ثابت ہوا۔ یہاں کے عوام نے پیپلز پارٹی کو مسترد کر دیا اور قومی اتحاد کے امیدواروں کو بھاری مارجن سے کامیاب کروا کر ایک بار پھر ثابت کیا کہ اہل کراچی ملک کو سیکولرازم، سوشلزم یا کسی بھی دوسرے ازم کی طرف جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ اور ملک کی نظریاتی اساس یعنی اسلام سے اس شہر کے باسیوں کی نظریاتی وابستگی بہت مضبوط بنیادوں پر ہے۔ کراچی میں قومی اسمبلی کے امیدواروں سردار شیر باز خان مزاری، محمود اعظم فاروقی، مولانا محمد حسن حقانی، پروفیسر غفور احمد، منشی بیش امام، حاجی حنیف طیب، ایئر مارشل ریٹائرڈ اصغر خان، شاہ فرید الحق اور سید منور حسن کو کامیابی حاصل ہوئی۔ سید منور حسن نے 73997 ووٹ حاصل کیے جبکہ ان کے مدمقابل امیدوار معروف شاعر جمیل الدین عالی کو 33086 ووٹ مل سکے۔ پاکستان قومی اتحاد نے صوبائی انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا، کیونکہ پورے ملک سے دھاندلی کی بے شمار شکایات موصول ہوئی تھیں۔

7 مارچ 1977ء کو ہونے والے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی نے 155، جب کہ پاکستان قومی اتحاد نے 36 سیٹیں حاصل کیں۔ پورے ملک میں دھاندلی کا شور مچ گیا جس میں پاکستان قومی اتحاد پیش پیش تھا۔ اپوزیشن کی طرف سے 11 مارچ کو پورے ملک میں پہیہ جام ہڑتال کی گئی اور تحریک چلانے کا اعلان کیا گیا۔ اپریل کے اواخر تک تحریک اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی۔ احتجاج اس قدر بھرپور تھا کہ حکومت نے بعض شہروں میں جزوی مارشل لا لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سے قبل تمام سیاسی و مذہبی جماعتوں نے بھٹو کے خلاف چلنے والی

تحریک میں مشترکہ طور پر گرفتاریاں پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ کراچی میں مختلف سیاسی پارٹیوں کا نمائندہ اجلاس ہوا جس میں طے کیا گیا کہ روزانہ تمام پارٹیوں کے کچھ کارکن اکٹھے ہوں گے اور کسی مصروف جگہ پر عوام کے سامنے گرفتاری پیش کریں گے۔ جس دن میری گرفتاری کی باری آئی تو گھر میں کسی سے تذکرہ نہیں کیا۔ بس روانہ ہونے سے قبل والدہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور بے اختیار ان کا ماتھا چوما۔ وہ ٹھٹھک کر رہ گئیں کہ کوئی معاملہ ضرور ہے۔ سائٹ کے چوراہے پر پولیس بڑی تعداد میں ہماری آمد کی منتظر تھی۔ نزدیک پہنچے تو ایک اہلکار میرے پاس آیا اور خلافِ توقع بے حد شائستگی سے کہنے لگا "سر آیئے، گاڑی میں بیٹھ جائیں"۔ میں بیٹھ گیا۔ پولیس کے پاس جانے کیا احکامات آئے کہ انہوں نے ساتھ آئے دیگر کارکنان کو بھی گرفتار کرلیا اور تھانے لے آئے۔ مقدمہ درج ہوا اور لانڈھی جیل میں سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا۔ اسی رات گاڑیوں میں بھر کر سکھر جیل پہنچا دیا گیا۔ یہاں کا تو منظر ہی اور تھا۔ بڑی جید شخصیات موجود تھیں۔ مولانا شاہ احمد نورانی، پروفیسر غفور احمد، پروفیسر شاہ فرید الحق، بوستان علی ہوتی، میر علی احمد تالپور، سردار شیر باز مزاری، دوست محمد فیضی اور جنرل ریٹائرڈ امیر عبداللہ نیازی۔ جیل میں جہاں سیاسی و مذہبی رہنماؤں کی محبت سے استفادہ کرنے کا موقع ملا وہیں جنرل نیازی سے بھی گفتگو ہوئی۔ "یہ آپ نے کیا کیا، اتنے بڑے لشکر کے ساتھ سرنڈر کر دیا؟" میرے اس سوال پر نہایت معصومیت سے کہنے لگے "مجھے بتایا گیا تھا کہ اگر ہم ہتھیار نہیں ڈالیں گے تو مغربی پاکستان بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ایسی صورتِ حال میں، میں اور کیا کرتا؟" یہ کہہ کر سادگی سے میرے چہرے کو دیکھنے لگے۔ "اسلام کی تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ مسلمانوں نے اتنی بڑی تعداد میں دشمن فوج کے سامنے ہتھیار ڈالے ہوں، کجا کہ ملک بچانے کے لیے ایک حصہ ہی گنوا دیا جائے، جہاں کے رہنے والے آزاد وطن کو حاصل کرنے کے لیے پہلے ہی خون کی ندیاں عبور کر کے آئے تھے"۔ وہ میری تلخ باتیں سنتے رہے لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔ جیل میں نماز کا نظام قائم کیا گیا۔ اذان میں دیا کرتا تھا جب کہ

امامت مولانا شاہ احمد نورانی کرتے تھے۔

جماعت کے مقامی کارکنان تمام قیدیوں کے لیے کھانا لے کر آتے۔ قبل اس کے کہ جیل میں ہمارا قیام طویل ہوتا، رہائی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تمام قیدیوں کو مختلف اوقات میں علیحدہ علیحدہ رہا کرنے کا پروگرام تھا۔ میرا نمبر سب سے آخر میں آیا۔ رہا ہو کر جیل کے دروازے سے باہر نکلنے لگا تو جنرل عبداللہ نیازی تیز قدموں سے چلتے ہوئے میرے پاس آئے اور کہنے لگے "آپ کو باہر جا کر میری رہائی کے لیے ضرور کوششیں کرنی ہیں، بھول مت جائیے گا"۔ لاچاری والا رویہ دیکھ کر یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی جنرل عبداللہ نیازی ہے جو سقوطِ ڈھاکہ سے قبل دشمن کی فوجوں کی اپنی لاش پر سے گزرنے کی باتیں کر رہا تھا۔ میں نے تسلی دی "آپ فکر نہ کریں، ضرور کوشش کروں گا"۔ حالانکہ کسی قسم کی سفارش کے بغیر تمام قیدیوں کو رہا کیا جا تا تھا۔ جیل میں مختلف مصروفیات انجام دینے کے دوران اکثر اپنی وکالت کے حوالے سے خیال دامن گیر رہتا کہ نا معلوم میری غیر موجودگی کی وجہ سے کیا صورتِ حال ہو گی۔ اللہ نے یہاں بھی میری دست گیری کی۔ کلائنٹس کیس کی فیس خود دفتر آ کر ادا کر جاتے تھے۔

رہائی کے وقت کارکنان کی ایک بڑی تعداد جیل کے سامنے موجود تھی۔ اپنے ساتھ لے کر ٹرین کے ذریعے کراچی روانہ ہوئے۔ راستے میں جہاں جہاں ٹرین رکتی، لوگ استقبال کے لیے پہلے سے موجود ہوتے۔ کراچی میں کارکنان کو پہلے سے اطلاع مل چکی تھی، اس لیے بہت بڑی تعداد اسٹیشن پر موجود تھی۔ کچھ دنوں بعد جماعت اسلامی نے ناظم آباد پیٹرول پمپ پر ایک بڑے جلسہ عام کا انعقاد کیا۔ انسانوں کا ازدحام تھا اور پتا نہیں چل رہا تھا کہ سڑک کہاں ہے اور میدان کہاں پر ہے؟

عین درمیان میں اسٹیج بنایا گیا تھا۔ جلسے میں جہاں بہت بڑے بڑے سیاسی لیڈر شریک تھے وہیں جنرل نیازی بھی موجود تھے۔

بڑے قد کے اجلے لوگ

1977ء پاکستان کی تاریخ کا ایک بدقسمت سال ثابت ہوا۔ حکومت کے خلاف احتجاج ملک کے اکثر شہروں اور قصبوں تک پھیل گیا۔ قومی اتحاد اور حکومتی نمائندوں کے درمیان مذاکرات کے کئی دور چلے اور قریب تھا کہ کوئی معاہدہ طے پا جاتا کہ 4 اور 5 جولائی کی درمیانی شب فوج نے ذوالفقار علی بھٹو کا تختہ الٹ کر زمام کار سنبھال لی۔ مارشل لا ایک بار پھر ملک کا مقدر ٹھیرا۔ 3 ستمبر 1977ء کو بھٹو صاحب کو گرفتار کرلیا گیا۔ کچھ دن کے بعد جنرل ضیاء نے قوم سے خطاب کیا جو پاکستان ٹیلی ویژن اور ریڈیو سے نشر کیا گیا۔ پروفیسر غفور احمد اور دیگر ذمہ داروں کے ساتھ یہ خطاب سننے کا موقع ملا۔ انہوں نے پہلے تو سیاست دانوں کو جی بھر کر باتیں سنائیں، اس کے بعد تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد کرنے کا فیصلہ صادر فرمایا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ہمیں اندازہ ہوگیا تھا کہ آئندہ حالات کیا رخ اختیار کرسکتے ہیں۔ اس لیے جہاں جہاں جماعت کے بینک اکاؤنٹس تھے، ان سے پیسے نکلوا لیے گئے۔ سماجی سرگرمیوں کی وجہ سے رقم خاصی زیادہ تھی۔ ایک اکاؤنٹ ڈاکٹر افتخار کے ساتھ مشترک تھا، وہ نجی دورے پر بھارت گئے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ اکاؤنٹ سیل ہوگیا۔ لیاقت آباد کے مرکزی میت بس سروس کے دفتر سے تمام میت گاڑیاں ناظم کراچی میں ایک واقف کار کے خالی پلاٹ پر بھجوا دیں۔ پینٹر کو بلایا اور اس سے گاڑیوں اور دفاتر سے جماعت اسلامی شعبہ خدمت خلق کا نام مٹوایا۔ سب پر الخدمت ویلفیئر سوسائٹی لکھوا دیا جو 1976ء میں قائم کی جا چکی تھی۔ اس طرح جماعت اسلامی کی سماجی خدمات کا سلسلہ

جاری رہا۔

ضیاءالحق کے ابتدائی دور میں امیر جماعت کے انتخاب کا مرحلہ پیش آیا۔ 1972ء میں جب مولانا مودودی نے خرابیِ صحت کی وجہ سے امارت کی ذمہ داری سے معذرت کی تھی تو ارکانِ جماعت نے میاں طفیل محمد کو امیر منتخب کرلیا تھا۔ میاں صاحب درویش خدا مست تھے اور قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی زندہ مثال تھے۔ ان جیسا متقی فرد اور اقامتِ دین کا پکا نظریاتی مجاہد کم ازکم میری نظر سے نہیں گزرا۔ ارکان نے بھاری اکثریت سے انہیں دوبارہ امیر منتخب کرلیا۔ جس وقت اعلان ہوا میں کسی کام کے سلسلے میں ان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، اطلاع سن کر میاں طفیل محمد کی زبان سے بے اختیار نکلا! ...انا للہ و انا الیہ راجعون۔ احساسِ ذمہ داری کے باعث ان کی کیفیت عجیب ہوگئی تھی۔ حلف اٹھاتے وقت زاروقطار رو رہے تھے۔

4اگست 1978ء کو جنرل ضیاء نے پاکستان قومی اتحاد کے قائدین کے ساتھ ایک میٹنگ کی اور انھیں وفاقی کابینہ میں شرکت کی دعوت دی۔ اس ملاقات میں یہ طے پایا کہ اکتوبر 1979ء سے قبل ملک میں نئے انتخابات کروائے جائیں گے۔ کچھ دنوں کے بعد قومی اتحاد میں شامل سیاسی جماعتوں کے چوبیس افراد نے وفاقی وزراء کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ ان میں جماعت اسلامی کے پروفیسر غفور احمد، محمود اعظم فاروقی اور چودھری رحمت الٰہی بھی شامل تھے۔ بعدازاں پروفیسر خورشید احمد کو بھی کابینہ میں شامل کرلیا گیا۔

وفاقی وزیر بننے کے بعد پروفیسر غفور احمد کے لیے کراچی جماعت کی امارت کی ذمہ داری کو مزید سنبھالنا ممکن نہیں رہا۔ نومبر 1977ء میں پروفیسر عثمان رمز صاحب نے یہ منصب سنبھالا۔ پروفیسر رمز صاحب کا شمار جماعت کے سینئر رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ وہ 1971ء میں مشرقی پاکستان سے ہجرت کرکے کراچی آئے تھے۔ بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ پروفیسر غفور احمد فروری 1972ء سے اکتوبر 1977ء تک کراچی جماعت کے امیر

رہے، جبکہ ان سے پہلے حکیم صادق حسین صاحب دو سال تک امیر رہ چکے تھے۔

22 ستمبر 1979ء کی رات نو بجے ریڈیو پاکستان اور ٹیلی ویژن سے بانی جماعت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کی انتہائی صدمہ انگیز خبر نشر ہوئی۔ اس خبر کے نشر ہوتے ہی مولانا کے ہزاروں عقیدت مند ان کی قیام گاہ 5 ذیلدار پارک اچھرہ اور جماعت اسلامی کے مرکزی دفتر منصورہ پہنچنا شروع ہوگئے۔ کراچی میں جماعت کے دفاتر پر کارکنان کا تانتا بندھ گیا۔

23 اور 24 ستمبر کے دن غم اور یاس میں ڈوبے ہوئے لوگ منتظر تھے کہ مولانا مودودیؒ کا جسدِ خاکی کب نیویارک سے لاہور پہنچتا ہے۔ مولانا مودودیؒ کے عزیز اور رشتہ دار مولانا کی میت کو لاہور پہنچانے کے لیے ہوائی جہاز کا بندوبست کر رہے تھے۔ اس دوران انہیں حکومتِ ایران کی طرف سے مولانا کی میت کو ہوائی جہاز کے ذریعے لاہور پہنچانے کی پیشکش کی گئی۔ سعودی عرب کے شاہ خالد کی طرف سے بھی اسی قسم کی پیشکش کی گئی۔

مولانا کے اہلِ خانہ ابھی ان تجاویز پر غور کر ہی رہے تھے کہ حکومتِ پاکستان نے بھی جماعت اسلامی پاکستان سے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو حکومت اپنے خرچ پر مولانا مودودیؒ کے جسدِ خاکی کو لاہور لے جانے کا بندوبست کرے۔

تینوں حکومتوں کی طرف سے کی گئی پیشکشوں پر جماعت اسلامی پاکستان کے امیر میاں طفیل محمد، مولانا کے اہلِ خانہ اور جماعت کے رہنماؤں نے مشورہ کیا۔ ان سب نے متفقہ طور پر ایران، سعودی عرب، اور پاکستان کی حکومتوں کا شکریہ ادا کیا اور اپنے خرچ پر مولانا مودودیؒ کا جنازہ نیویارک سے پاکستان لانے کا فیصلہ کیا۔

24 ستمبر 1979ء کو جماعت اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد، مولانا جان محمد عباسی مرحوم و دیگر رہنما کراچی ایئر پورٹ پر موجود تھے کہ مولانا مودودیؒ کا جسدِ خاکی ملکے سرمئی

رنگ کے فولادی بکس میں بند کراچی ائیر پورٹ پر اتارا گیا تو وہاں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ سوگواروں کا ہجوم وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جا رہا تھا۔ اسلامی جمعیت طلبہ اور پی آئی اے کے ملازمین کی یونین پیاسی کے کارکنوں نے مولانا مودودیؒ کی میت کو جہاز سے اتار کر ایک کھلے ٹرک میں رکھ دیا۔

جماعت اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد نے ٹرک میں کھڑے ہو کر مولانا مودودیؒ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ لاکھوں انسان اپنے محبوب قائد کو آنسوؤں اور دل کی گہرائیوں سے ان کی بخشش کے لیے نکلنے والی دعاؤں کا نذرانہ عقیدت پیش کر رہے تھے۔ کراچی ائیر پورٹ ہی سے مولانا مودودیؒ کی میت کو پی آئی اے کے خصوصی جہاز پر منتقل کیا گیا، جس کے ذریعے ان کے جسدِ خاکی کو لاہور پہنچایا گیا۔

اسی روز کراچی میں بلدیاتی انتخابات منعقد ہوئے۔ جماعت اسلامی کی پوری قیادت اور کارکنان انتخابی مہم میں مصروف تھے۔ بانیٔ جماعت کے انتقال کی خبر نے انہیں گہرے صدمے سے دوچار کر دیا۔ لوگوں کی توجہ انتخابی عمل اور پولنگ سے ہٹ گئی، لیکن جماعت کی قیادت نے معاملے کو سنبھالا اور جنازے کے فوری بعد انتخابی میدان میں نکل کھڑے ہوئے۔ الحمدللہ، بہت سارے حلقوں میں ہمارے نمائندے کامیاب ہوئے، لیکن کچھ حلقوں میں کارکنان صدمے کی وجہ سے اس جوش و جذبے سے کام نہیں کر پائے جس کی ضرورت تھی۔

جماعت اسلامی کے اخوت گروپ کو بلدیہ کراچی کے ایوان میں اکثریت حاصل ہوگئی اور لیاری کے رہائشی درویش صفت نظریاتی کارکن عبدالستار افغانی میئر منتخب ہوگئے۔ ڈپٹی میئر کا عہدہ پیپلز پارٹی کے عمر یوسف ڈیڈا کے حصے میں آیا۔ افغانی صاحب اور ان کی پوری ٹیم نے اگلے چار سال تک شہر میں فقید المثال ترقیاتی کام کروائے۔ گو کہ ان کے پاس مالی وسائل بہت کم تھے لیکن ایک دیانت دار، ایماندار، مخلص اور باصلاحیت ٹیم نے ان محدود

وسائل میں بھی شہر کے ہر علاقے کے لوگوں کی بلاتفریق خدمت کی اور گلیوں، سڑکوں اور بازاروں کو روشن اور صاف ستھرا کر کے رکھ دیا۔ شہر کے ہر رفاحی پلاٹ کے گرد چاردیواری بنائی گئی تاکہ ان پلاٹوں کو قبضہ مافیا سے محفوظ رکھ کر عوام کے مفاد میں استعمال کیا جا سکے۔

بلدیاتی نمائندوں کی شب و روز کی محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1983ء کے بلدیاتی انتخابات میں اخوت گروپ نے زیادہ حلقوں سے کامیابی حاصل کی اور افغانی صاحب ایک بار پھر شہر کے میئر منتخب ہو گئے۔ لیکن اس مرتبہ بھی ڈپٹی میئر اخوت گروپ سے منتخب نہ ہو سکا۔ عبدالخالق اللہ والا اس عہدے پر فائز ہوئے۔ عبدالستار افغانی صاحب کے دور کے بے شمار منصوبوں میں سے ایک بڑا منصوبہ اور کارنامہ واٹر اینڈ سیوریج بورڈ کا قیام تھا۔

جنرل ضیاء الحق نے 10 جنوری 1985ء کو ملک میں غیر جماعتی الیکشن منعقد کرانے کا اعلان کر دیا۔ پیپلز پارٹی اور کچھ دوسری جماعتوں نے بائیکاٹ کا راستہ اختیار کیا، جب کہ جماعت اسلامی کی شوریٰ نے میدان خالی چھوڑنے کے بجائے ان انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ الیکشن کمیشن نے اعلان کیا کہ قومی اسمبلی کے انتخابات 25 فروری، جب کہ صوبائی اسمبلی کے 28 فروری کو ہوں گے۔ محمود اعظم فاروقی جماعت اسلامی حلقہ کراچی کے امیر تھے، رکن قومی اسمبلی اور چند ماہ تک وفاقی وزیر بھی رہ چکے تھے۔ مشاورت کے بعد قومی اسمبلی کے لیے سید منور حسن، محمود اعظم فاروقی، مظفر احمد ہاشمی، عثمان رمز، محمود احمد مدنی، شیخ ملک محمد اسلم جنگ، عبدالستار افغانی، محمد حسین محنتی اور سید ذاکر علی، جبکہ صوبائی اسمبلی کے لیے ڈاکٹر اطہر قریشی، اخلاق احمد، عباس باوزیر، اسلم مجاہد، شاہ فیض الحسن، شیخ محبوب علی، جنید فاروقی، بابو غلام حسین بلوچ اور مجھے ٹکٹ دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ میں خود کو اس ٹکٹ کا اہل نہیں سمجھتا تھا، فاروقی صاحب سے بات کر کے معذرت کرنے کی کوشش بھی کی لیکن نظم کا فیصلہ برقرار رہا۔

انتخابی مہم بہت اچھی رہی، کارکنان نے ووٹرز سے رابطوں کی بھی بھرپور کوششیں

گئیں۔ ہمارے امیدوار بھی معاشرے کے جانے پہچانے لوگ تھے، لیکن قومی اسمبلی کے نتائج توقعات کے مطابق نہیں نکلے۔ محمود اعظم فاروقی، سید منور حسن اور میر کراچی عبدالستار افغانی کو شکست ہوئی اور صرف دو امیدوار محمد عثمان رمز اور مظفر ہاشمی کامیاب ہو سکے۔ میرے حلقہ انتخاب پی ایس 81 کے ووٹرز نے مجھ پر اعتماد کا اظہار کیا۔ میرے حصے میں 13966 ووٹ آئے جبکہ مدمخالف مظہر شکیب کو 4912 ووٹ مل سکے۔ ڈاکٹر اطہر قریشی، اخلاق احمد، اسلم مجاہد، عباس باوزیر اور بابو غلام حسین بلوچ بھی اپنے اپنے حلقوں سے جیت گئے۔ حیدرآباد سے عبدالوحید قریشی بھی رکن اسمبلی منتخب ہوئے تھے، اور بعد میں اقلیتی رکن بشیر عالم بھٹی کے اضافے نے بھی ہمارے پارلیمانی گروپ کو مستحکم کر دیا۔ سید غوث علی شاہ وزیر اعلیٰ اور عبداللہ حسین ہارون اسپیکر منتخب ہو گئے۔

غیر جماعتی انتخابات کی وجہ سے اسمبلی میں حزب اختلاف نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ابتدائی کچھ دن تو خیریت سے گزر گئے لیکن جب ہم نے اپنے حلقوں اور کراچی کے مسائل پر بولنا شروع کیا تو غوث علی شاہ زچ ہونے لگے۔ جماعت کے اراکین اسمبلی بھرپور تیاری کے ساتھ اسمبلی میں آتے اور کارروائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ اس زمانے میں آج کی طرح کا میڈیا تو نہیں ہوا کرتا تھا لیکن جنگ، ڈان اور جسارت کی خبروں کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ غوث علی شاہ تنقید کو سخت ناپسند کرتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ ان کی حکومت کے بارے میں کوئی منفی تاثر پھیلے۔ شاید ہر حکمران ہی تنقید سے گھبراتا ہے اور "سب اچھا ہے" کی لوری سننا چاہتا ہے۔ انہوں نے کہنا شروع کر دیا "نعمت صاحب آپ جلدی سے جماعت سے فیصلہ کروائیں، میں آپ کو اپنی کابینہ میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے آپ کے لیے تعلیم کی وزارت منتخب کرلی ہے"۔ ان کی یہ بات سنتا اور خاموش ہو جاتا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ وزارت کا لالچ دے کر جماعت کے کسی رکن اسمبلی کی زبان بندی نہیں کروائی جا سکتی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد انہیں اندازہ ہو گیا کہ یہ بیل منڈھے چڑھنے والی نہیں ہے تو

وہ کھنچے کھنچے بلکہ الرجک سے رہنے لگے۔

14 مارچ 1985ء کو سینیٹ کے الیکشن کے لیے ووٹ ڈالے گئے۔ انتخابات سے قبل کئی کروڑ پتی امیدواروں نے جماعت کے اراکین اسمبلی سے رابطہ کیا اور کہا کہ آپ لوگ غیر جماعتی بنیادوں پر جیت کر رکن بنے ہیں اور سینیٹ کے لیے ووٹنگ بھی خفیہ انداز میں ہوتی ہے، اس لیے ہمیں ووٹ دے دیں۔ بدلے میں پرکشش آفرز دی گئیں۔ مجھ سے تو کسی کو رابطہ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی کیونکہ میں مالی طور پر مستحکم تھا اور لوگ میرے مزاج سے بھی واقف تھے۔ باقی لوگوں سے رابطہ کیا گیا۔ سچ یہ ہے کہ ان دنوں جماعت اسلامی سے وابستگی پر بہت فخر بھی ہوا اور بار بار اللہ کا شکر بھی ادا کیا۔

عثمان رمز، مظفر ہاشمی، ڈاکٹر اطہر قریشی، اخلاق احمد، عبدالوحید قریشی، بابو غلام حسین، اسلم مجاہد، عباس باوزیر اور اقلیتی رکن بشیر عالم بھٹی... کسی کی بھی قیمت نہیں لگائی جا سکی، کسی ایک کے ضمیر کو بھی نہیں خریدا جا سکا۔ اخلاق احمد صاحب فیڈرل بی ایریا میں کرائے کے چھوٹے سے مکان میں رہا کرتے تھے۔ ایک کارکن کی ویسپا اسکوٹر یا منی بس سے اسمبلی آیا جایا کرتے تھے۔ بشیر عالم بھٹی مزدور رہنما تھے اور ایک کچی آبادی میں رہا کرتے تھے۔ وہ بعد میں بھی جب کبھی دفتر جماعت آتے، میں اُن کے احترام میں کھڑا ہو جاتا اور روانگی میں انھیں دروازے تک چھوڑنے جاتا۔ بڑے قد کے اجلے لوگ تھے!

وہ حادثہ نہیں سانحہ تھا

15 اپریل 1985ء کو دوپہر تقریباً ایک بجے دفتر سے گھر آکر کھانا کھا رہا تھا کہ حکیم عبدالوہاب نے فون پر اطلاع دی: کولیمار چورنگی پر ٹریفک حادثے میں سرسید گرلز کالج کی ایک طالبہ جاں بحق ہوگئی ہے، جبکہ اس کی بہن شدید زخمی ہے۔ آپ عباسی ہسپتال آجائیں۔ کھانا ادھورا چھوڑا اور خود گاڑی چلاتے ہوئے ہسپتال پہنچ گیا۔ ایمرجنسی وارڈ میں داخل ہوا تو ایک قیامت بپا تھی، کالج یونیفارم میں ملبوس طالبہ بشریٰ زیدی کی نعش ایک جانب رکھی تھی، دوسری طرف اس کی بہن نجمہ زیدی شدید زخموں کی وجہ سے زندگی اور موت کی کشمکش میں تھی، اور دو جوان بیٹیوں کی حالت دیکھ کر غمزدہ ماں سکتے کی حالت میں تھی۔ بشریٰ زیدی کی ساتھی طالبات اور کالج کا عملہ شدید غم و غصے کی کیفیت میں تھا۔ ہسپتال کے عملے کی کیفیت قابلِ رحم تھی، مشتعل لوگ ڈرائیور کا غصہ ان پر نکال رہے تھے۔ کالج گاؤن میں ملبوس ایک خاتون تیز لہجے میں بولیں: کہاں ہیں وہ صاحب جو اس حلقے سے منتخب ہوئے ہیں، اب کیوں نظر نہیں آرہے؟ میں نے خاتون کی طرف رخ کیا۔ جی فرمایئے!! میں موجود ہوں، بتایئے کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔ انہوں نے جواب بھی نہیں دیا تھا کہ کالج کی چند لڑکیاں اور کچھ نوجوان بھاگتے ہوئے ہسپتال میں داخل ہوئے۔ تھوڑی ہی دیر میں پولیس کی بھاری نفری اندر داخل ہوگئی اور وہاں موجود لوگوں پر بلاتخصیص لاٹھیاں برسانا شروع کردیں، جس سے صورتحال مزید کشیدہ ہوگئی۔ رکن قومی اسمبلی پروفیسر عثمان رمز اور حکیم عبدالوہاب جماعت کے درجنوں کارکنان کے ساتھ وہاں پہنچ چکے تھے۔ میں پولیس کو

روکنے کے لیے آگے بڑھا تو ایک اہلکار مجھ پر چڑھ دوڑا۔ حکیم عبدالوہاب ڈھال بن گئے، جس کی وجہ سے پڑنے والی لاٹھیوں نے ان کا جسم لہولہان کر دیا۔ اس دوران بشریٰ زیدی کے عزیز و اقارب بڑی تعداد میں وہاں پہنچ گئے۔ ان سے پوچھا کہ بچی کے والد کہاں ہیں؟ پتا چلا روزگار کے سلسلے میں سعودی عرب میں مقیم ہیں اور وہ بھی دور دراز صحرائی علاقے میں، جس کا فوری اتا پتا معلوم کرنا مشکل تھا۔ اب کیا کیا جائے؟ سانحے کی اطلاع دیے بغیر چارہ نہیں تھا۔ رابطے کے لیے پتا موجود نہیں تھا۔ اس مشکل مرحلے میں اللہ نے رہنمائی اس طرح کی کہ سعودی عرب میں رہائش پذیر اپنے ایک کلائنٹ کو فون کیا، ساری صورت حال تفصیل سے بتائی اور کہا جس طرح بھی ممکن ہو اس بچی کے والد سے رابطہ کریں اور ان سے میری بات بھی کروائیں۔ اس نے بڑی کوشش کر کے غمزدہ گھرانے کے سربراہ کو تلاش کیا۔ پھر مجھے ان کا فون نمبر دیا۔ بشریٰ زیدی کے والد شبیر زیدی کو فون پر اس اندوہناک حادثے کی خبر سنائی۔ ان سے کہا کہ پہلی دستیاب پرواز سے کراچی پہنچ جائیں۔ وہ رات ڈھائی بجے کراچی پہنچے۔ انہیں ائیر پورٹ پر اپنی گاڑی میں بٹھایا، اور سیدھا عباسی شہید ہسپتال کے مردہ خانے جا پہنچا۔ باپ نے جس طرح جوان بچی کی لاش دیکھی اور نوحہ کیا۔۔ وہ منظر میں زندگی بھر نہ بھلا سکا!

شبیر زیدی کی طبیعت ذرا بحال ہوئی تو آئی سی یو میں لے جا کر بے ہوش نجمہ زیدی کو دکھایا۔ پھر فجر سے کچھ دیر پہلے انہیں گھر لے جا کر چھوڑا۔ حالات معمول پر آنے اور شدت غم میں کمی آنے کے بعد ان کا میرے گھر آنا جانا شروع ہو گیا۔ گفتگو میں بے تکلفی کا مرحلہ آیا تو پتا چلا موصوف کا تعلق بھی میرے آبائی علاقے شاہجہاں پور سے ہے۔ زخمی ہونے والی بچی جب مکمل صحت یاب ہو گئی اور تعلیم مکمل ہونے کے بعد اس کا رشتہ طے ہوا تو وہ شادی کا دعوت نامہ لے کر آئے، خاصا اصرار کرنے لگے کہ آپ کو ہر قیمت پر شرکت کرنی ہے۔

بشریٰ زیدی کی شہادت کا حادثہ شہر کی سطح پر سانحے کی شکل اختیار نہ کرتا اگر انتظامیہ

بروقت حرکت میں آجاتی اور پولیس متعلقہ منی بس ڈرائیور کو فوری گرفتار کر لیتی، نہ کہ غم و غصے کا اظہار کرنے والی طالبات اور دیگر مظاہرین پر ڈنڈے برساتی۔ نتیجتاً اشتعال پھیلتا چلا گیا، یہاں تک کہ احتجاج کرنے والوں کے ہجوم میں بلوائی بھی شامل ہو گئے اور محض چند گھنٹوں میں کئی گاڑیوں کو آگ لگا دی۔ درجنوں افراد کو باقاعدہ نشانہ بنا کر قتل کر دیا گیا۔ یہی معاملہ لوگوں کی املاک کے ساتھ کیا گیا۔ کراچی مقتل کا منظر پیش کر رہا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ شہر کے کئی علاقوں میں کرفیو نافذ کرنا پڑا۔

پہلی مرتبہ مہاجر، پٹھان قومیتوں کی باتیں علی الاعلان ہونے لگیں۔ بنارس، منگھوپیر، پیر آباد، علی گڑھ، قصبہ کالونی اور اورنگی ٹاؤن کے درمیان ایک ان دیکھی خونیں لکیر کھنچ گئی۔ اس تمام عرصے میں وزیر اعلیٰ سندھ سید غوث علی شاہ کا رویہ نہایت غیر ذمہ دارانہ تھا۔ ہنگامے جتنی تیزی سے پھیل رہے تھے اسی قدر مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انتظامیہ کو حرکت میں لانے کے بجائے ان کا سارا انحصار اپنے ہمنوا اراکین کے ذریعے "سب ٹھیک ہے" کا نعرہ بلند کرنے پر تھا۔ انتظامیہ حالات کو کنٹرول کرنے کے بجائے روزنامچے کے انداز میں پریس نوٹ اخبارات کو جاری کر دیتی، اور اس کے اہم نکات یہی ہوا کرتے تھے کہ صورت حال معمول کے مطابق ہے، شرپسندوں سے آہنی ہاتھوں سے نمٹا جائے گا، عوام پُرامن رہیں، وغیرہ وغیرہ۔ انہی دنوں میں نے ایک موقع پر گورنر سندھ لیفٹیننٹ جنرل جہانداد خان سے کہا کہ آپ حادثے کے ذمہ دار منی بس ڈرائیور کو پھانسی دے دیں، لوگوں کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا، پھر حالات بھی پُرامن ہو جائیں گے۔ فرمانے لگے: خان صاحب آپ پھانسی کی بات کر رہے ہیں، ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے میرے تو بس اتنے اختیارات ہیں کہ مارشل لا کی سمری کورٹ کے ذریعے ڈرائیور کا ٹرائل کرواؤں، اور سال، چھ مہینے قید کی سزا دلوا دوں۔ آپ تو وکیل ہیں اور جانتے ہی ہیں کہ ٹریفک حادثے میں قتل خطا کی ایف آئی آر درج ہوتی ہے۔ ان کی بے بسی والی گفتگو سن کر جی کٹ سا گیا۔

کراچی میں لگنے والی آگ کی تپش اسلام آباد کے ایوانوں تک پہنچنے لگی۔ وزیر اعظم محمد خان جونیجو چند وزراء کے ہمراہ کراچی پہنچے۔ حالات کے بارے میں گفتگو کے لیے گورنر ہاوس میں اجلاس طلب کیا گیا۔ اس میں شہر کے تمام اراکین قومی وصوبائی اسمبلی کو بھی بلایا گیا۔ میں اور عثمان رمز تھوڑی تاخیر سے اجلاس میں پہنچے، کیونکہ راستے میں کئی جگہ ٹریفک بلاک ملا تھا۔ سید غوث علی شاہ اختتامی تقریر کر رہے تھے۔ جیسے ہی ان کی گفتگو مکمل ہوئی، میں نے وزیر اعظم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "جناب میں بھی کچھ باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں"۔ "جی فرمایئے" انہوں نے اجازت دی۔ اس پر میں نے کہا "جس وقت کراچی کے مختلف علاقے آگ میں جل رہے تھے اور بلوائیوں کے نرغے میں تھے، اس وقت آپ کے وزیر اعلیٰ کہاں تھے؟ اجلاس سے ایک دن قبل کی بات ہے شہر کے حالات کے حوالے سے جماعت اسلامی ضلع وسطی (عقب عباسی ہسپتال) کے دفتر کی گلی میں جلسۂ عام منعقد ہوا۔ میں اسٹیج پر تقریر کر رہا تھا، شرکاء میں سے ایک صاحب نے چٹ لکھ کر دی جو بغیر دیکھے جیب میں رکھ لی، جلسے کے اختتام کے بعد فرصت ملی تو وہ چٹ پڑھی، اس میں لکھا تھا وہ شرپسند جو جلاؤ گھیراؤ کرنے والوں کی قیادت کر رہے تھے انہوں نے اس وقت وزیر اعلیٰ سید غوث علی شاہ کی کابینہ میں شامل صوبائی وزیر میر نواز خان مروت کے گھر میں پناہ لی ہوئی ہے"۔ پرچی پر درج عبارت میں نے من وعن وزیر اعظم جونیجو کے سامنے پڑھ کر سنا دی۔ وزیر موصوف بھی اجلاس میں موجود تھے، جیسے ہی یہ بات سنی، کھڑے ہو کر فضا میں ہاتھ بلند کر دیے اور اونچی آواز میں کلمہ پڑھ کر اپنی بے گناہی کی قسمیں کھاتے رہے۔ اجلاس کا نقشہ ہی بدل گیا۔ اراکین ووزراء آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ گفتگو کے دوران سید غوث علی شاہ اپنی جانب میری طرف سے انگلی کا رخ کر کے حالات کا مورد الزام ٹھیرانے پر سخت تپ پا تھے۔ جوں ہی موقع ملا کہنے لگے "بھئی نعمت صاحب کو تو ہماری ہر بات بری لگتی ہے"۔

روایتی وعدے وعید اور امن وامان کو بہتر بنانے کی یقین دہانیوں کے ساتھ اجلاس ختم

ہوگیا۔ دوسری طرف حالات تھے کہ کسی طور کنٹرول میں نہیں آرہے تھے۔ کرفیو کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ اخبارات، بیرون ملک مقیم پاکستانی، اپوزیشن، بلکہ خود حکومتی حلقوں میں بھی باتیں ہونے لگیں کہ حکومت صورت حال کو قابو کرنے میں کیوں ناکام ہورہی ہے۔ بعض کی رائے یہ تھی کہ اگر ہم عوام کو جان و مال کا تحفظ فراہم نہیں کر سکے تو ہر طرف سے تھوتھو ہوگی۔ اطلاع ملی وزیر اعظم ایک مرتبہ پھر صورت حال کا جائزہ لینے کراچی تشریف لا رہے ہیں۔ اس مرتبہ وہ شہر میں بسنے والی مختلف قومیتوں سے یکجہتی کے لیے اپنے ہمراہ پنجاب و سرحد کے اراکین اسمبلی اور دیگر ذمہ داران کو لے کر آئے۔ امن و امان کے جائزے کے لیے گورنر ہاؤس میں اجلاس بلایا جس میں شہر کے تمام اراکین قومی و صوبائی اسمبلی کو بھی مدعو کیا گیا۔ طبیعت کچھ ناساز تھی اس کے باوجود میں نے شرکت کا ارادہ کیا۔ اجلاس کی کارروائی شروع ہونے میں کچھ دیر تھی، محمد خان جونیجو گورنر ہاؤس پہنچ چکے تھے اور دوسرے کمرے میں اپنے رفقا سے صلاح مشورے میں مصروف تھے، جب کہ مرکزی ہال جہاں اجلاس ہونا تھا، وہاں حکومتی اراکین بار بار مزاج پرسی کے لیے میرے پاس آتے اور ساتھ ہی پوچھتے

"آج آپ بیار ہیں، تقریر تو نہیں کریں گے نا؟"

مجھے بخار تھا اور گلے میں انفیکشن بھی تھا، ارادہ یہی تھا کہ گفتگو نہیں کروں گا۔ لیکن کارروائی شروع ہونے کے کچھ دیر بعد اورنگی ٹاؤن سے تعلق رکھنے والے حکومتی رکن اسمبلی حسیب ہاشمی نے اپنی تقریر میں وزیر اعلیٰ کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانا شروع کر دیے تو جی تلملا کر رہ گیا۔ اس اعلان کے باوجود کہ حسیب ہاشمی کی تقریر آخری ہے، اس کے بعد کارروائی مکمل کر دی جائے گی، میں اپنی جگہ کھڑا ہوا اور وزیر اعظم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "جناب آج کے اجلاس میں بہت سارے معاملات پر گفتگو ہوئی لیکن میرا خیال ہے کہ اس میں مزید جائزہ لینے کی گنجائش ہے اور اس سلسلے میں، میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ وزیر اعظم اس سے پہلے والے اجلاس میں میری گفتگو سننے کی وجہ سے واقف

تھے،فوراً اجازت دے دی۔ بغیر کسی تمہید کے گفتگو کا آغاز کیا اور وزیر اعلیٰ سندھ سمیت صوبائی کابینہ کی نااہلی اور شہر کے حالات کو بہتر نہ بنانے پر خوب محاکمہ کیا۔ بغیر رکے تقریر کرنے کے دوران زبان دانتوں تلے دب گئی، خون بہتا ہوا قمیص کے کالر تک پہنچ گیا۔ میری تقریر کے بعد غوث علی شاہ تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ وہ صوبے میں امن و امان قائم کرنے کے حوالے سے اقدامات اور حکمت عملی بتانے کے بجائے میری باتوں کا جواب دیتے رہے۔

اس گرماگرمی کے بعد اجلاس ختم ہوا۔ شرکاء باہر آنے لگے۔ ان میں سینیٹر پروفیسر خورشید احمد بھی شامل تھے۔ کپڑوں پر خون دیکھ کر مزاج پرسی کرنے لگے۔ جب کہ وزیر اعظم کے ہمراہ آنے والے اراکین اسمبلی مبارکباد دیتے ہوئے کہنے لگے "نعمت صاحب! آج آپ نے کراچی کی نمائندگی کا حق ادا کردیا۔ حکومتی کیمپ میں ہونے کی وجہ سے ہم مصلحتوں کا شکار رہے"۔ اجلاسوں کی بھرمار حالات کو کنٹرول نہیں کرسکتی تھی۔ بدقسمتی سے اس کی خواہش بھی نظر نہیں آرہی تھی۔

بشریٰ زیدی کی شہادت کے حادثے نے شہر کی سیاست پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ منظم ہنگامہ آرائی کے پیچھے لسانیت اور تعصب کی چنگاریاں تھیں جو بھڑکنے کے لیے مناسب وقت اور ایندھن کی منتظر تھیں۔ انتظامیہ نے کچھ عرصے کے بعد شہر کے معاملات کو بہتر بنالیا اور بظاہر حالات معمول پر آگئے۔ شہر میں بلدیاتی نظام جماعت کے پاس تھا، گو کہ میئر اور کونسلرز کے مالی و انتظامی اختیارات بہت محدود تھے لیکن میئر اور کونسلرز اور اراکین قومی وصوبائی اسمبلی نے شہر کی خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور کراچی کو اس کے جائز حقوق دلانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔

سندھ اسمبلی کے اسپیکر عبداللہ حسین ہارون نے ایک سال تک ہاؤس چلایا۔ پھر ان کے حکومت سے کچھ اختلافات ہوگئے۔ انہوں نے 31 مارچ 1986ء کو اپنی ذمہ داریوں

سے استعفیٰ دے دیا۔ ان کی جگہ مظفر علی شاہ نے عہدہ سنبھال لیا۔ کچھ عرصے کے بعد حسین ہارون کو خیال آیا کہ ہاؤس میں قائد حزب اختلاف کا عہدہ موجود نہیں ہے۔ اس کے بغیر اسمبلی کا ماحول سونا سونا رہتا ہے، کیوں نا اس عہدے کے لیے خود کو پیش کیا جائے۔

انہوں نے ارادہ کیا اور حکمت عملی ترتیب دی، لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی۔ اسمبلی کا بجٹ اجلاس جاری تھا۔ ہم نے دیگر غیر حکومتی اراکین کے ساتھ مل کر بجٹ سیشن کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا۔ اسمبلی سے باہر آنے والوں میں حسین ہارون پیش پیش تھے۔ اراکین اسمبلی کوریڈور میں جمع تھے، حسین ہارون نزدیک آئے اور کہنے لگے "آیئے نعمت صاحب پریس کانفرنس کرتے ہیں"۔ یہ کہہ کر انہوں نے قدم آگے بڑھائے تو دیکھا وہاں بغیر کسی اعلان کے کچھ اخباری رپورٹرز اور فوٹوگرافرز ٹہل رہے ہیں۔ میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ چھٹی حس نے خبردار کیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ فوراً حسین ہارون کی پیش کش کی تائید کرتے ہوئے کہا "ضرور کیوں نہیں، بالائی منزل پر جانے کی زحمت کرنے کے بجائے ہمارا اپنا کمیٹی روم موجود ہے، اسی میں پریس کانفرنس کر لیتے ہیں"۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے تو بقیہ اراکین نے مجھے درمیان والی کرسی پر بٹھا دیا۔ صحافی بھی بیٹھ گئے۔ روزنامہ جنگ کے عارف الحق عارف عین سامنے بیٹھے تھے۔ میں نے بسم اللہ پڑھ کر گفتگو کا آغاز کر دیا۔ اسمبلی میں حکومتی رویہ، حالات، مسائل، بیوروکریسی کے ہتھکنڈوں اور دیگر اہم معاملات پر بات کی۔ حسین ہارون نے صحافیوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ نعمت اللہ صاحب نے جو کہا وہ کافی ہے۔ اگلے دن کے اخبارات میں بجٹ اجلاس کے بائیکاٹ کو نمایاں جگہ ملی اور مجھے لیڈر آف دی اپوزیشن قرار دے دیا گیا۔

صوبائی حکومت کے وزراء اور افسران کی کرپشن اور مالی بے قاعدگیوں کے بارے میں بھی چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں۔ کچھ اخبارات وزیر اعلیٰ پر بھی مالی معاملات میں ملوث ہونے کا الزام لگاتے تھے۔ اچانک خبر ملی کہ صوبائی حکومت نے سندھ شوگر بورڈ کو ختم کرنے

کا فیصلہ کیا ہے۔ بڑی حیرت ہوئی کہ ایک منافع بخش سرکاری ادارے کو کیوں بند کیا جا رہا ہے! ایک دوست کی معرفت چیئرمین سے ملاقات کی اور پوچھا کہ آپ سندھ شوگر بورڈ کیوں ختم کرنا چاہ رہے ہیں؟ انہوں نے چپراسی سے فائلوں کا ایک بنڈل منگوایا اور ان میں سے مختلف خطوط نکال کر دکھاتے ہوئے کہنے لگے "دیکھیے جناب، صنعت کے صوبائی وزیر نے کارپوریشن کو گنا فراہم کرنے کی پیش کش کی اور اس کے عوض 30 لاکھ روپے ایڈوانس وصول کر لیے، کئی مہینے ہونے کو آ رہے ہیں یاد دہانی کے باوجود گنا فراہم کر رہے ہیں اور نہ ہی ایڈوانس کی رقم لوٹا رہے ہیں۔ جب ہم نے تھک ہار کر رقم کی وصولی کے لیے انہیں خط لکھا تو وہ برا مان گئے اور انتقام لینے کے لیے ادارہ ہی توڑنے پر تل گئے"۔ سندھ شوگر بورڈ کے چیئرمین نے جو کتھا کہانی سنائی وہ انتہائی تکلیف دہ تھی۔ کچھ دن کے بعد اسمبلی کا اجلاس بلایا گیا۔ تقاریر شروع ہوئیں۔ اراکین اپنی اپنی باری پر بولتے رہے۔ میرا نمبر آیا تو قصداً دھیمے لہجے میں گفتگو کی اور کہا کہ لوگوں کو چاہیے کہ ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح دیں۔ منافع بخش ادارے ہمارا اثاثہ ہیں، انہیں بند کرنا مناسب نہیں۔ ابھی اس طرح کے دو چار جملے ہی ادا کیے تھے کہ وزیر موصوف اپنی نشست سے کھڑے ہو گئے اور تقریباً چیختے ہوئے کہنے لگے ''مجھے معلوم ہے تمہیں یہ باتیں کس نے بتائی ہیں۔ میں دیکھ لوں گا۔" مزے کی بات یہ کہ گنا فراہم کرنے کے وعدے اور لیے گئے ایڈوانس کو لوٹانے کے متعلق انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ ان کی بات سن کر میں نے اسپیکر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''جناب ابھی تک میں نے اپنی گفتگو میں کسی کا نام نہیں لیا تھا۔ چوں کہ وزیر موصوف نے بات چھیڑ دی ہے تو یہ بتائیں کہ انہوں نے سندھ شوگر کارپوریشن سے تیس لاکھ روپے گنا فراہم کرنے کے لیے ایڈوانس حاصل کیے تھے؟ کہیے ہاں! کیا وعدے کے مطابق گنا فراہم کیا گیا؟ کہیے نہیں۔ پھر جو ایڈوانس لیا تھا وہ واپس کیا؟ کہیے نہیں۔ اس کے بعد کارپوریشن کے چیئرمین نے وصولی کے لیے خط لکھا تو اس قدر ناراض ہو گئے کہ کارپوریشن توڑنے پر تل گئے"۔ اتنا

کہنا تھا کہ سارے وزراء اپنے بدعنوان ساتھی کی پشت پناہی کے لیے ایک ساتھ کھڑے ہوگئے اور چیخ پکار کرنے لگے۔ اس غل غپاڑے کے باوجود میں نے اپنی تقریر جاری رکھی۔ اسمبلی ہال کے ساتھ دوسرے کمرے میں موجود ایک سرکاری افسر اشفاق بلوچ کلوز سرکٹ کیمرے کے ذریعے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ وہ اجلاس کے بعد میرے پاس آئے اور کہنے لگے "نعمت صاحب! آپ کو پتا ہے یہ کون لوگ ہیں؟ رسہ گیر ہیں، اکثر ڈاکو انہی کے پالے ہوئے ہوتے ہیں۔ مخالفین کو قتل تک کروا دیتے ہیں"۔ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولے "یہ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ میں کیمرے میں دیکھ رہا تھا آپ صوبائی وزیر کے خلاف بڑی دیدہ دلیری سے مسلسل بولے جا رہے تھے"۔ قریب کھڑے ڈاکٹر اطہر قریشی نے کہا "بھئی جماعت اسلامی نے ہماری یہی تربیت تو کی ہے کہ حق کے معاملے میں مداہنت سے کام نہ لیں۔" وزیر موصوف نے غوث علی شاہ سے کہہ کر چیئرمین کا تبادلہ کروا دیا۔ اسی دوران سکھر جیل ٹوٹنے کا ناقابل یقین واقعہ پیش آیا، جس پر وقتی طور پر خوب شور و غوغا ہوا۔ اخبارات نے اس واقعہ کو شہ سرخیوں میں جگہ دی، لیکن کسی بڑے ذمہ دار کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ یہ تک کہا گیا کہ جیل ٹوٹنے اور کئی خطرناک مجرموں کے فرار میں وزیر اعلیٰ خود بھی ملوث ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس الزام کو ثابت نہیں کیا جا سکا۔

1986ء میں ہونے والے تین واقعات نے آگے چل کر روشنیوں کے شہر کی ہیئت بدل کر رکھ دی اور طویل عرصے تک اسے تاریکیوں، ہنگاموں، تشدد، جلاؤ گھیراؤ، سرکاری ہسپتالوں اور تعلیمی اداروں کی تباہی، زمینوں پر ناجائز قبضہ، کرپشن، بھتہ خوری اور قتل و غارت گری کا شہر بنا دیا۔

یہ خونِ خاک نشیناں تھا، رزقِ خاک ہوا

8 اگست 1986ء کو نشتر پارک میں مہاجر قومی موومنٹ نے جلسہ کیا۔ الطاف حسین نے اس جلسے میں انتہائی اشتعال انگیز تقریر کی اور سندھ کے شہری علاقوں میں رہنے والے اردو بولنے والوں میں دیگر قومیتوں کے خلاف نفرت پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ یہ جلسہ اس لحاظ سے الگ نوعیت کا تھا کہ اس میں نوجوان اسٹیج پر جدید اسلحہ کی نمائش کر رہے تھے۔

جلسے کے کچھ ہی ہفتے بعد سہراب گوٹھ پر ناجائز قابضین اور منشیات فروشوں کے خلاف قانون نافذ کرنے والے اداروں نے ایک نمائشی آپریشن کیا۔

صرف دو دن بعد کراچی کے علاقوں قصبہ اور علی گڑھ کالونی پر پر اسرار دہشت گردوں نے جدید اسلحہ سے لیس ہو کر وحشیانہ حملہ کر دیا۔ دہشت گردی کی ایسی واردات کراچی کے لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ بدترین انداز میں خون کی ہولی کھیلی گئی اور درجنوں معصوم لوگوں کو قتل کر دیا گیا۔ پورے شہر میں یہ بات پھیل گئی (منظم انداز میں پھیلا دی گئی) کہ پٹھانوں نے مہاجروں پر حملہ کر دیا ہے اور چار سو سے زیادہ لوگوں کو قتل کر دیا ہے۔

شہر میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ نوجوانوں کی ٹولیاں گلیوں اور سڑکوں پر نکل آئیں اور ردعمل سامنے آنا شروع ہو گیا۔ کوئی یہ سننے اور سمجھنے کے لیے بھی تیار نہیں تھا کہ پٹھان اور مہاجر تو کراچی کے مختلف علاقوں میں آباد ہیں اور کئی محلوں میں برسوں سے ساتھ بھی رہ رہے ہیں۔ اگر یہ پٹھان مہاجر فساد ہے تو شہر کے صرف ایک علاقے ہی میں ایسا بھیانک فساد کیوں ہوا ہے؟

فہرست پر جائیے

قصبہ کے سانحے کے فوری بعد جماعت اسلامی کے ذمہ داران اور کارکنان نے متاثرین کے لیے امدادی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ لوگوں کو راشن پہنچایا، شہداء کی تدفین میں تعاون کیا اور زخمیوں کو ہسپتال پہنچانے کا بندوبست کیا۔ جماعت اسلامی کی خواتین بھی ان امدادی سرگرمیوں میں پورے طور پر شریک رہیں۔

الطاف حسین اور ان کے ساتھیوں نے اس سانحے اور لاشوں پر عملی سیاست کا آغاز کیا اور پھر لاشوں اور تشدد کی سیاست ہی ان کی پہچان بن گئی۔ وہ چیختے چلاتے رہے کہ کمشنر کراچی کہاں ہے؟ کمشنر کراچی نے لوگوں کی جان و مال کا تحفظ کیوں نہیں کیا جبکہ پولیس ان کے ماتحت تھی۔ انہوں نے کئی بار دعویٰ کیا کہ حملہ آوروں کی وڈیوز موجود ہیں اور کئی ایک کو شناخت کیا جاسکتا ہے۔ مذکورہ ویڈیوز کسی عدالت میں کبھی پیش نہیں کی گئیں۔

یہ خونِ خاک نشیناں تھا، رزقِ خاک ہوا

اُس زمانے میں بلدیہ کراچی کی مالی پوزیشن کمزور تھی۔ میئر کراچی عبدالستار افغانی صاحب کئی بار صوبائی حکومت کی توجہ اس جانب مبذول کروا چکے تھے کہ ترقیاتی کاموں کے لیے بجٹ میں اضافہ کیا جائے یا صوبائی حکومت کراچی سے جمع ہونے والے موٹر وہیکل ٹیکس میں سے شہر کو معقول حصہ دے۔

سندھ حکومت ایسے کسی مطالبے پر کان دھرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس رویّے سے تنگ آ کر افغانی صاحب نے پُرامن احتجاج کا راستہ اختیار کیا اور 12 فروری 1987ء کو کونسلرز کے ساتھ ایم اے جناح روڈ پر جلوس نکالا۔ وزیر اعلیٰ نے منتخب بلدیہ کو ختم کر دیا اور شہر کے منتخب نمائندوں کو جیل بھیج دیا گیا۔ گرفتار شدگان میں میئر کراچی بھی شامل تھے۔ سینئر بیوروکریٹ سعید صدیقی بلدیہ کراچی کے منتظم بنا دیے گئے۔

30 نومبر 1987ء کو بلدیاتی انتخابات منعقد ہوئے۔ کراچی اور حیدرآباد کے لوگوں نے الطاف حسین کے نعروں اور حقوق کے وعدوں سے متاثر ہو کر اُن کے حمایت یافتہ

امیدواروں کو تاریخی فتح سے ہمکنار کردیا۔ 1979ء اور 1983ء میں کراچی میں جماعت اسلامی کا میئر منتخب ضرور ہوسکا تھا لیکن ڈپٹی میئر دونوں بار دوسری پارٹی کا منتخب ہوا تھا۔ ڈاکٹر فاروق ستار کراچی کے اور آفتاب شیخ حیدرآباد کے میئر منتخب ہوئے تو ڈپٹی میئر بھی اسی گروپ سے تھے۔ اس قدر بھاری اکثریت سے کامیابی کی توقع خود الطاف حسین اور ان کے قریبی ساتھیوں کو بھی نہیں تھی۔

1987ء میں میاں طفیل محمد نے امارت کی ذمہ داری سے معذرت کرلی۔ ارکان نے اکتوبر 1987ء میں قاضی حسین احمد کو نیا امیر منتخب کرلیا۔ قاضی صاحب اس سے قبل مرکزی جنرل سیکریٹری تھے۔ قاضی صاحب نے ایک بار مجھ سے کہا کہ اگر ملک کا مشرقی حصہ ہم سے جدا نہ ہوتا تو یقینی طور پر پروفیسر غلام اعظم صاحب جماعت کے مرکزی امیر منتخب کیے جاتے۔ وہ ہر لحاظ سے اس منصب کے لائق تھے۔ قاضی صاحب پروفیسر غلام اعظم اور جماعت اسلامی بنگلہ دیش کے رہنماؤں سے بہت محبت و عقیدت رکھتے تھے اور ان کا ذکر کرتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسو چھلک جاتے تھے۔

29 مئی 1988ء کو جنرل ضیاء نے آئین کی شق 58-2B کے تحت حکومت کو ختم کردیا اور اسمبلیاں توڑنے کا اعلان کردیا، اور وزیراعظم محمد خان جونیجو اور ان کی کابینہ کو گھر بھیج دیا۔ مجھے رکن اسمبلی کی حیثیت سے پانچ چھ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ بشمول الاؤنسز ملا کرتی تھی۔ وہ ساری تنخواہ بینک میں جمع ہوجایا کرتی تھی۔ رکنیت ختم ہوئی تو پوری رقم نکلوائی اور جماعت کے بیت المال میں جمع کروادی۔

17 اگست 1988ء کو صدر ضیاء الحق کا طیارہ بہاولپور کے نزدیک حادثے کا شکار ہوگیا اور ضیاء الحق سمیت کئی اعلیٰ فوجی افسر اس میں شہید ہوگئے۔ ضیاء الحق کئی شخصی خوبیوں کے مالک تھے۔ انہیں طویل عرصے ملک پر مکمل اختیارات کے ساتھ حکومت کرنے کا موقع ملا۔ انہوں نے ملک کو ایٹمی قوت بنانے کے لیے ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور غلام اسحٰق خان کو

پوری آزادی دی۔ اس اہم منصوبے کو ہر طرح کی مداخلت سے محفوظ رکھا۔ لیکن ضیاء الحق نے بھی دوسرے آمروں کی طرح ملک کی جمہوری سیاسی قوتوں کو کمزور کرنے کی پوری کوشش کی اور اسٹیبلشمنٹ کی نرسری میں نئے اور اپنے پسندیدہ سیاستدانوں کو پروان چڑھایا۔ انہوں نے پیپلز پارٹی کی مخالفت میں سندھ کے شہری علاقوں میں مہاجر قومی موومنٹ کو پنپنے اور پروان چڑھنے کا پورا موقع دیا۔ ان کے ہی دور میں طلبہ تنظیموں پر پابندی عائد کی گئی اور ملک کو لسانی، مسلکی اور علاقائی تعصب کی آگ میں جھونک دیا گیا۔ وہ "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کے فلسفے پر کاربند رہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر؟ اس کا فیصلہ وقت ہی کر سکتا ہے۔

الطاف حسین کی پُرتشدد سوچ اور طرز سیاست کے اثرات سے تعلیمی ادارے کیسے محفوظ رہ سکتے تھے! ان کی طلبہ تنظیم اب ایک مافیا کی شکل اختیار کر رہی تھی اور خود مہاجر قومی موومنٹ کے ذمہ داران اس کے نقصانات کا احساس نہیں کر پا رہے تھے کہ آگے چل کر تشدد کی یہ سیاست خود ان کے لیے سب سے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوگی اور ان کے لوگ آپس میں ایک دوسرے کا قتل کیا کریں گے!

30 اگست 1988ء کو اسلامی جمعیت طلبہ کے رکن اور گورنمنٹ نیشنل کالج کے طالب علم عامر سعید کو اے پی ایم ایس او کے غنڈوں نے اغوا کر لیا اور چند گھنٹوں کے بعد ان کی لاش ملی۔ ان پر بے پناہ تشدد کر کے گولیاں ماری گئی تھیں۔ بد قسمتی سے یہ الطاف حسین کی مافیا کے ہاتھوں جمعیت اور جماعت کے کارکنوں کی آخری شہادت نہیں تھی۔ آنے والے برسوں میں الطاف حسین ایسے دیوتا بن چکے تھے جس کے چرنوں میں آئے روز کسی مظلوم انسان کی قربانی پیش کی جاتی تھی۔

کمشنر کراچی سید سردار احمد بعد ازاں الطاف حسین کی پارٹی کے رکن صوبائی اسمبلی اور سینئر وزیر بنائے گئے۔ جبکہ اگلی کئی حکومتوں میں وفاقی و صوبائی وزارتوں کے مزے لوٹنے

والی پارٹی نے سانحہ قصبہ وعلی گڑھ کی تحقیقات میں عملی دلچسپی نہیں لی اور آج تک کسی ایک مجرم کو بھی نہ گرفتار کیا گیا اور نہ سزا دی گئی۔

نئی نسل کو یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ اس سانحہ سے کس کو فائدہ پہنچا؟ کس کی سیاسی مقبولیت راتوں رات آسمان پر پہنچ گئی؟ اور کس پارٹی کے اراکین بعد ازاں کئی دہائیوں تک وفاقی اور صوبائی کابینہ کے رکن بنتے رہے؟

1988ء اور 1990ء کے انتخابات میں سندھ کے شہری علاقوں سے حسب توقع مہاجر قومی موومنٹ کے اکثر امیدواروں کو کسی سخت مقابلے کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ الطاف حسین کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ پروفیسر غفور احمد جیسے بلند قامت سیاست دان کنور خالد یونس نام کے ایک غیر معروف شخص سے شکست کھا گئے۔ سید منور حسن اور مولانا شاہ احمد نورانی کو بھی عام لوگوں کے ہاتھوں بھاری مارجن سے شکست ہوئی۔ جماعت اسلامی ان دونوں انتخابات میں اسلامی جمہوری اتحاد کا حصہ تھی۔ مہاجر قومی موومنٹ 1988ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت کا حصہ بنی، جبکہ 1990ء میں نواز شریف کی حکومت میں شامل ہوگئی۔ عوام سے جو وعدے 80ء کی دہائی سے کیے جا رہے تھے کہ کوٹہ سسٹم ختم ہوگا اور بنگلہ دیش کے کیمپوں سے مہاجرین کو واپس لایا جائے گا، ان مطالبات پر کراچی و حیدرآباد کے نمائندوں نے کبھی بات تک نہیں کی۔

سرکاری اداروں میں میرٹ کی بربادی اور اپنے عہدیداروں اور کارکنوں کو ملازمتیں دینے کی روایت ڈاکٹر فاروق ستار میئر بنتے ہی ڈال چکے تھے۔ وفاقی اور صوبائی وزارتیں ملنے کے بعد یہ روایت اور مستحکم ہوگئی، بلکہ سندھ کی حد تک تو یہ ہوگیا کہ عام آدمی کے لیے کسی بھی شعبے میں سرکاری ملازمت کا حصول ناممکن ہوگیا۔ سرکاری ملازمتیں پیپلز پارٹی اور الطاف حسین کی پارٹی کے عہدیداروں، ان کے رشتے داروں اور کارکنوں ہی کو ملنے لگیں۔ سرکاری ادارے دیکھتے ہی دیکھتے ان سیاسی پارٹیوں کے دفاتر میں تبدیل ہوگئے۔ سرکاری

اسکول مڈل کلاس اور غریب لوگوں کی ترقی کا واحد سہارا تھے۔ سرکاری تعلیمی اداروں کی تباہی نے غریبوں کے بچوں سے مفت معیاری تعلیم کا سہارا چھین لیا اور نوجوانوں کے ہاتھوں میں ہتھیار تھما دیے گئے۔ یہی حال سرکاری ہسپتالوں کا ہوا۔ اس عرصے میں پرائیویٹ اسکولز، کوچنگ سینٹرز اور نجی ہسپتالوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا۔

دسمبر 1990ء کے پہلے ہفتے میں مجھے جماعت اسلامی ضلع وسطی کا امیر مقرر کر دیا گیا۔ اس سے قبل امیر ضلع متین علی خان صاحب تھے۔ سید حفیظ اللہ ان کے قیم تھے، جبکہ میں اور ڈاکٹر معراج الہدیٰ ان کی ٹیم میں نائب امراء کی حیثیت سے شامل تھے۔

میں نے ڈاکٹر معراج الہدیٰ صدیقی کو اپنا قیم نامزد کیا جبکہ حفیظ اللہ صاحب اور افتخار احمد صاحب کو نائب امیر کی ذمہ داری دی۔ ڈاکٹر معراج اسلامی جمعیت طلبہ کراچی کے ناظم رہے تھے اور جمعیت سے فارغ ہونے کے بعد امیر ضلع متین علی خان صاحب نے انہیں اپنی ٹیم میں شامل کر کے عثمان پبلک اسکول پراجیکٹ کا ذمہ دار بنا دیا تھا جو اس وقت اپنے ابتدائی مراحل میں تھا۔

بے تحاشا مقبولیت اور طاقت نے الطاف حسین اور ان کے ساتھیوں کو بری طرح عدم توازن کا شکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اپنے ہی ساتھیوں کے درمیان اختلافات پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ جماعت اسلامی نے اول روز ہی طے کر لیا تھا کہ اس طوفان کا مقابلہ صبر و استقامت سے کرنا ہے اور ہر ممکن کوشش کرنی ہے کہ دعوتی کام پر توجہ مرکوز رکھی جائے اور خدمت خلق کے ذریعے لوگوں کے دل جیتنے کی کوشش کی جائے۔

2 فروری 1991ء کو قاضی حسین احمد صاحب نے مجھے جماعت اسلامی کراچی کا امیر مقرر کر دیا جبکہ سید منور حسن کو مرکزی نائب قیم کی ذمہ داری دے دی۔ 1991ء میں بحیثیت امیر کراچی کے جن افراد کو میں نے اپنے نظم میں شامل کیا ان میں راشد نسیم قیم، عبدالرشید صاحب اور نور محمد لاکھانی صاحب نائب امیر، عبدالرشید بیگ، شمیم احمد صاحب

اور سید محمد بلال نائب قیم تھے۔ سابق میئر عبدالستار افغانی پبلک ایڈ کے معاملات دیکھا کرتے تھے۔ جس دن ادارے کی گاڑی ان کے گھر بوجوہ نہ پہنچ پاتی، وہ رکشہ یا ٹیکسی کر کے دفتر آتے۔ آٹھ سال تک شہر کا میئر رہنے والا شخص منصب سے ہٹنے کے بعد ذاتی سواری تک نہیں خرید پایا تھا۔ شاہد شمسی سیکریٹری اطلاعات تھے۔ اسامہ اسماعیل مراد کے پاس سیکریٹری الخدمت ویلفیئر سوسائٹی کی ذمہ داری تھی۔ 1994ء میں، میں نے کچھ تبدیلیاں کیں اور محمد حسین محنتی کو قیم نامزد کیا جبکہ سید حفیظ اللہ اور افتخار احمد کو نائب امیر کی ذمہ داری دی۔ معظم علی قادری نائب قیم بنائے گئے۔ سید حفیظ اللہ نائب امیر کے ساتھ ساتھ الخدمت کے سیکریٹری بھی تھے۔ سابق قیم کراچی سید آصف علی صاحب میرے پورے دورِ امارت میں شعبۂ تعلیم کے ذمہ دار رہے۔ الخدمت کے حفظ و ناظرہ قرآن کے مدارس ان کی زیرِ نگرانی تھے۔ جبکہ سعود آباد میں کراچی جماعت کا سب سے بڑا اقامتی دینی مدرسہ جامعہ حنیفیہ بھی انہی کی زیرِ نگرانی تھا۔ 1993ء سے 1996ء کے دوران اس شعبے نے ایک نوجوان رکن جماعت سید نعیم احمد کی کوششوں اور محنت سے سعود آباد، فیڈرل بی ایریا اور اورنگی ٹاؤن میں حنیفیہ پبلک اسکول کے 6 کیمپس قائم کیے۔ سید آصف علی صاحب کراچی جماعت کے سینئر رہنماؤں میں شامل تھے اور انتہائی متقی انسان تھے۔ کراچی میں جماعت اسلامی کا پہلا دفتر ان کے ذاتی مکان میں قائم ہوا تھا۔ وہ روزانہ صبح جامعہ حنیفیہ جاتے اور شام کے وقت ادارہ نورِ حق آیا کرتے تھے۔

کراچی کی امارت کا منصب سنبھالنے کے بعد نہ صرف یہ کہ وکالت کے لیے وقت نکالنا بہت مشکل ہوگیا بلکہ سچ یہ ہے کہ اہلِ خانہ کے لیے بھی مشکل ہی سے وقت نکال پاتا تھا۔ اہلیہ اور بیٹیاں دبے لفظوں میں شکوہ ضرور کیا کرتی تھیں، لیکن میرے پاس اس مسئلے کا کوئی حل نہیں تھا۔ بڑے صاحبزادے وسیم اقبال نے این ای ڈی یونیورسٹی سے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ایک نجی کمپنی میں ملازمت کر رہے تھے۔ عزیزی ندیم اقبال نے ایل

فہرست پر جائیے

ایل بی کیا اور آہستہ آہستہ "نعمت اللہ اینڈ کو" کو سنبھالا اور میرے برسوں پرانے کلائنٹس کو کسی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ کسی بیٹے نے کبھی سرکاری ملازمت کی خواہش ظاہر نہیں کی، کیونکہ سب اچھی طرح جانتے تھے کہ میں کسی سے بھی ان کے لیے سفارش نہیں کروں گا۔ فہیم اقبال اور ناظم اقبال نے پرنٹنگ کا بزنس کیا، لیکن جماعت اسلامی یا الخدمت سے پرنٹنگ کا کام لینے کی انہیں اجازت کبھی نہیں ملی۔

1991ء میں الطاف حسین کے تعلقات اسٹیبلشمنٹ سے خراب ہو گئے اور انہیں راتوں رات ملک سے فرار ہونا پڑا۔ جب ان کے ٹارگٹ کلرز کے خلاف فوجی آپریشن شروع ہوا تو اس وقت جماعت اسلامی نے متوازن اور جمہوری رویہ اپنایا۔ ہر فورم پر آپریشن کی مخالفت کی، کیونکہ ہم سمجھتے تھے کہ کسی بھی سیاسی پارٹی کے خلاف فوجی آپریشن مسائل کا حل نہیں ہے۔ پولیس اور عدالت کے نظام میں بنیادی اصلاحات کے بغیر نہ امن و امان قائم کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی مجرموں کی بیخ کنی کی جا سکتی ہے۔ شہر کا حال یہ تھا کہ کسی بھی تھانے میں دہشت گردوں کے خلاف ایف آئی آر درج نہیں کروائی جا سکتی تھی۔ جرم اگر درجنوں لوگوں کے سامنے دن دیہاڑے بھی ہوا کرتا تو کسی کی مجال نہیں تھی کہ گواہی دیتا۔

الطاف حسین کے قریبی ساتھیوں آفاق احمد اور عامر خان کی مدد سے ایک الگ دھڑا بنوا دیا گیا۔ شہر کی دیواروں پر نعرے لکھوا دیے گئے کہ "جو قائد کا غدار ہے، وہ موت کا حق دار ہے"۔ دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کے لوگوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

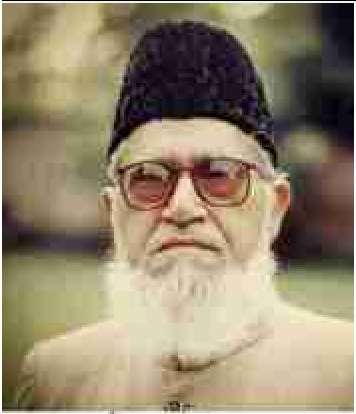

میاں طفیل محمدؒ

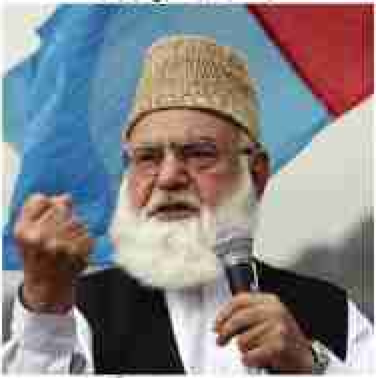

قاضی حسین احمدؒ

سید منور حسنؒ

پروفیسر غفور احمدؒ

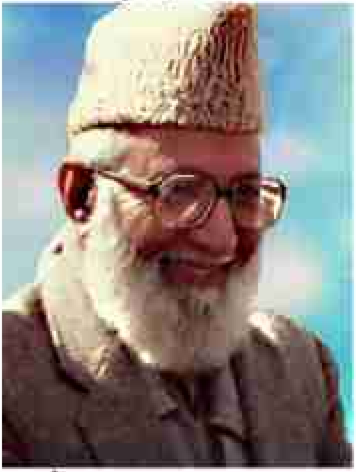

مولانا جان محمد عباسیؒ

اسد اللہ بھٹو ایڈوکیٹ

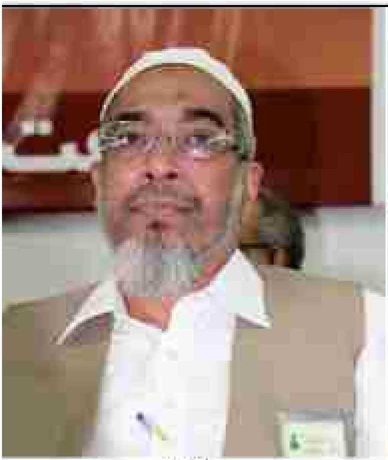

راشد نسیم

سابق میئر کراچی عبدالستار افغانی اور سید عبدالرشید

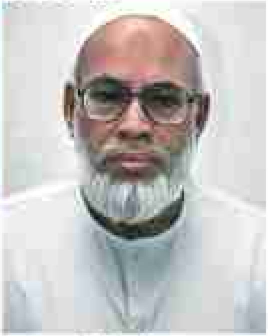

سید حفیظ اللہ

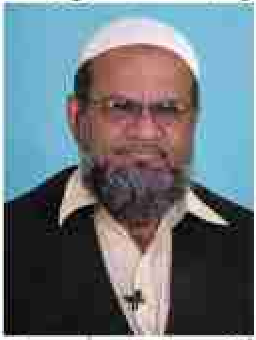

ڈاکٹر معراج الہدیٰ صدیقی

اسامہ اسماعیل مراد

قاضی حسین احمد کے ساتھ ایک یادگار تصویر

تقریبِ عید ملن؛ سید منور حسن اور حافظ نعیم الرحمٰن کے ساتھ

امیر جماعت اسلامی سراج الحق ملاقات کے لیے تشریف لائے

پروفیسر غفور احمد اور عبدالستار افغانی کے ہمراہ پریس کانفرنس کے موقع پر

المرکز اسلامی کے منصوبے کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ خلاق احمد گورنر سندھ ایس ایم عباسی کو بریفنگ دے رہے ہیں

1986 - قصبہ کالونی کے سانحے کے بعد جماعت اسلامی کے رہنماؤں نے سول ہسپتال کراچی میں داخل زخمیوں کی عیادت کی

پاکستان اسلامک فرنٹ۔ نئی سوچ کا عنوان تھا

کراچی جماعت اسلامی کی امارت کی ذمہ داری سنبھالے دو سال ہی گزر رہے تھے کہ ملک کی سیاسی فضا میں بھونچال آ گیا۔ صدر مملکت غلام اسحٰق خان نے آئین کی شق 58-2B کا استعمال کرتے ہوئے وزیراعظم نواز شریف کی حکومت کو برطرف کر دیا۔

یکم مئی 1993، کا دن تھا کہ مجھے کسی نے فون پر اطلاع دی "خان صاحب! عظیم احمد طارق کو قتل کر دیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون"

میں نے پوچھا کہ یہ واقعہ کہاں پیش آیا؟ اطلاع دینے والے نے بتایا کہ دستگیر میں، شاید ان کے سسرال میں۔ یہ سمجھنا کسی کے لیے بھی مشکل نہیں تھا کہ یہ "اپنوں" ہی کی کارروائی تھی۔ وہ علاقہ مہاجر قومی موومنٹ کے مرکز 90 سے تھوڑے ہی فاصلے پر واقع تھا اور الطاف حسین کی پارٹی کا بے حد مضبوط گڑھ تھا۔ ممکن ہی نہیں تھا کہ باہر کا کوئی فرد اس علاقے میں جا کر پارٹی کے چیئرمین کو گھر میں گھس کر قتل کر سکے۔ یہ بات واضح تھی کہ الطاف حسین اور ان کے حواری، آفاق احمد اور عامر خان کی طرح عظیم طارق کو بھی غداروں کی فہرست میں شامل کر چکے تھے۔

عظیم طارق مہاجر قومی موومنٹ کے معتدل مزاج رہنماؤں میں شامل تھے اور قتل و غارت، بھتہ خوری، اور مار دھاڑ والی سیاست کی دبے لفظوں میں مخالفت کرتے تھے، لیکن یہ سوچ الطاف حسین اور پارٹی کے ہارڈ لائنرز کے لیے ناقابل برداشت تھی، جو صرف طاقت کی زبان بولتے اور امن و امان کو ناپسند کرتے تھے۔

مجھے جب کبھی موقع ملا ان کے بزرگوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ کراچی کے نوجوانوں کو اسلحہ سے دور رکھیں۔ ان کے ہاتھوں سے کتاب نہ چھینیں اور پستول نہ تھمائیں۔ ان کی منطق عجیب ہوا کرتی تھی۔ وہ کہتے کہ قبائلی علاقوں میں ہر گھر میں بڑی بڑی بندوقیں ہوتی ہیں، آپ لوگ ان پر اعتراض کیوں نہیں کرتے؟

مجھے ان لوگوں کی اس سوچ پر حیرت ہوتی تھی۔ کراچی کو قبائلی علاقوں سے ملانا کہاں کی تک تھی؟ ہر علاقے اور معاشرے کا الگ کلچر ہوتا ہے۔ قبائلی علاقوں میں لوگوں کے درمیان دشمنیاں ہوتی ہیں جو بعض اوقات نسل در نسل چلتی ہیں اور بے گناہوں کا خون بہتا ہے۔ یہ لوگ کراچی کو بھی خون رنگ دیکھنا چاہتے تھے۔ میں ان سے کہتا تھا کہ یہ اسلحہ ایک دن خود انہی کے خلاف استعمال ہونے لگے گا۔ اور ہم سب نے دیکھا کہ ایسا ہی ہوا۔ الطاف حسین کی پارٹی نے نہ صرف سیاسی مخالفین کو قتل کیا، عام لوگوں کی جانیں لیں بلکہ اپنے ہی بانی ارکان اور لیڈروں کو بھی نہیں بخشا۔ اس لحاظ سے الطاف حسین کی پارٹی نے بے حد سفاکانہ روایات ڈالیں، جن کی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔

نواز شریف حکومت کی برطرفی کے بعد جو کچھ بھی ہوا، اب تاریخ کا ایک ناخوشگوار باب ہے اور اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بھی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ نواز شریف کی حکومت بھی گئی اور غلام اسحٰق خان کی صدارت بھی۔ چیئرمین سینیٹ وسیم سجاد نے قائم مقام صدر کا عہدہ سنبھالا جبکہ امریکہ سے آئے ہوئے عالمی بینک کے سابق ملازم معین قریشی نگران وزیر اعظم بنا دیے گئے۔ خراب شہرت کے آدمی نہیں تھے۔ وہ ایک مہمان کی طرح آئے اور الیکشن کے بعد رخصت ہو گئے۔ یہ کیسی عجیب بات تھی کہ بیس کروڑ آبادی کے ملک میں تین ماہ کے نگران وزیر اعظم کے لیے بھی ہماری اسٹیبلشمنٹ کو ملک کے اندر کوئی موزوں فرد نہیں مل سکا۔ یا یہ کہ دونوں بڑی پارٹیاں کسی مقامی فرد پر اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

جماعت اسلامی کی قیادت نے فیصلہ کیا کہ عوام کو یہ بتانے کی کوشش کی جائے کہ ملک کی دونوں بڑی پارٹیاں اپنے خصائل کے اعتبار سے ایک ہی جیسی ہیں اور چھوٹی یا بڑی برائی کا فلسفہ عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف ہے۔ عوام کے سامنے ایک تیسری اور متبادل سیاسی قوت کا آپشن پیش کیا جائے۔ خرم مراد صاحب اس حوالے سے بہت پُرجوش اور پُرامید تھے۔

جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد نے قوم کے سامنے پاکستان اسلامک فرنٹ کا منشور پیش کیا اور ملک بھر میں اچھی شہرت کے حامل موثر لوگوں کو اس پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی کوشش کی۔ جماعت اسلامی کی نوجوانوں کی تنظیم پاسبان اُس زمانے میں بہت منظم انداز میں کام کر رہی تھی اور اس نے ملک کے بڑے شہروں میں ہزاروں نوجوانوں کو جمع کر لیا تھا۔ ظلم کے خلاف پاسبان کا نعرہ عام آدمی کو بہت اپیل کرتا تھا۔ کراچی میں الطاف شکور، عثمان معظم، مسعود محمود، الطاف آگریا، ڈاکٹر ظفر اقبال جیسے لوگ اس کی قیادت کر رہے تھے۔

1993ء کے انتخابات کی تاریخ کا اعلان ہوا تو جماعت اسلامی نے پاکستان اسلامک فرنٹ کے نام سے الیکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا جسے انتخابی نشان کار الاٹ ہوا۔ قاضی حسین احمد کی ولولہ انگیز قیادت میں ملک بھر میں بے حد جوش و خروش سے انتخابی مہم چلائی گئی۔ راشد نسیم کراچی جماعت کے قیم یعنی جنرل سیکریٹری تھے۔ انہوں نے اس پوری مہم کو شہر میں بہت ہی سائنٹفک اور جدید انداز میں منظم کیا۔ الیکشن سے قبل ایسا ماحول بن گیا کہ ہمارے کئی امیدواروں کی جیت سامنے نظر آنے لگی تھی۔

قاضی حسین احمد نے اپنے آبائی حلقے نوشہرہ کے ساتھ ساتھ کراچی سے بھی قومی اسمبلی کا الیکشن لڑا۔ مہاجر قومی موومنٹ نے نامعلوم وجوہات کی بنا پر قومی اسمبلی کے الیکشن کا بائیکاٹ کیا لیکن صوبائی اسمبلی کے الیکشن میں حصہ لیا۔ لوگ سمجھ گئے کہ اسٹیبلشمنٹ سے اندرون خانہ کوئی ڈیل ہو گئی ہے۔

زبردست انتخابی مہم کا نتیجہ بہت ہی مایوس کن نکلا۔ پورے ملک سے اسلامک فرنٹ کے صرف تین امیدوار رکن قومی اسمبلی منتخب ہو سکے۔ ہم لوگوں کو یہ باور کروانے میں کامیاب نہیں ہو سکے کہ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ نواز میں سے کوئی چھوٹی یا بڑی برائی نہیں ہے۔ اور ملک کو کسی متبادل سیاسی پلیٹ فارم کی ضرورت ہے۔

کراچی سے قاضی حسین احمد، سید منور حسن، عبدالستار افغانی اور خود مجھے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ جبکہ مظفر احمد ہاشمی کو بہت تھوڑے ووٹوں کے مارجن سے فتح نصیب ہوئی اور وہ رکن قومی اسمبلی منتخب ہو گئے۔ قاضی حسین احمد صاحب کو حلیم صدیقی نے شکست دی جو کہ میدانِ سیاست میں نوارد تھے۔ میرے مقابلے میں مسلم لیگ نواز کے دوست محمد فیضی کامیاب ہوئے۔ ان کے حصے میں 17058 ووٹ آئے جبکہ مجھے 10344 ووٹ ملے۔ میں نے نتیجہ آنے کے بعد دوست محمد فیضی سے ملاقات کی اور انہیں مبارک باد دی۔ شہر میں ووٹنگ کا تناسب بہت کم رہا کیونکہ مہاجر قومی موومنٹ نے انتخابات کا بائیکاٹ کیا ہوا تھا، اور بہر حال شہر کے اردو بولنے والوں کی بڑی تعداد پتنگ پر مہر لگانا چاہتی تھی جیسا کہ صوبائی اسمبلی کے الیکشن والے روز ہوا اور 1988ء اور 1990ء کی تاریخ دہرائی گئی۔

الیکشن میں شکست کا ملبہ پاسبان پر گرا دیا گیا اور جماعت اسلامی کی مرکزی شوریٰ نے پاسبان کو ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ مجھ سمیت کئی اراکین شوریٰ اس فیصلے پر مضطرب تھے، لیکن اجتماعیت کے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

پاسبان کے خاتمے کے بعد جماعت اسلامی کی مرکزی شوریٰ نے نوجوانوں میں کام کے لیے شباب ملی کے نام سے تنظیم قائم کی۔ اس کے پہلے مرکزی صدر شمیم احمد خان اور جنرل سیکریٹری حافظ سلمان بٹ تھے۔ کراچی میں ہم نے سید محمد بلال کو صدر مقرر کیا۔ ان کے بعد شاہد شیخ اور ان کے بعد ڈاکٹر پرویز محمود کو یہ ذمہ داری دی گئی۔ پرویز محمود نے لیاقت آباد ٹاؤن کے ناظم کا الیکشن لڑنے تک اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی نبھایا۔

اس الیکشن کے بعد سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ جماعت کے کچھ ذمہ داران نے تحریک اسلامی کے نام سے ایک دھڑا بنالیا۔ ان ذمہ داران میں ہمارے بہت ہی سینئر اور پکے نظریاتی لوگ بھی شامل تھے۔ کراچی سے جلیل خان صاحب اور ڈاکٹر اطہر قریشی بھی ان لوگوں کے ساتھ ہو گئے۔

مولانا مودودی کی تربیت اور ایک دوسرے کے ساتھ تعلق قلبی کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام تر اختلافات کے باوجود بھی ان رفقا کے ادب و احترام میں فرق نہیں آیا۔ ہم سب جانتے تھے کہ اختلاف سوچ اور حکمت عملی کا ہے، اقامت دین کے نظریے پر مکمل یکسوئی ہے اور کوئی بدنیتی یا دنیوی مفاد بھی کسی کے پیش نظر نہیں ہے۔

الیکشن میں عبدالستار افغانی حلقہ این اے 185 سے ہمارے امیدوار تھے۔ دو بار میئر کراچی رہ چکے تھے اور اورنگی ٹاؤن کو بنیادی سہولتوں کی فراہمی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ان کے مقابلے میں پیپلز پارٹی کے محمد آفاق خان شاہد اور مسلم لیگ نواز کے الحاج شمیم الدین امیدوار تھے۔

ہمیں توقع تھی کہ افغانی صاحب آسانی سے یہ مقابلہ جیت جائیں گے، لیکن ایسا نہ ہوسکا اور افغانی صاحب کو 7796 ووٹ ملے۔ وہ تیسرے نمبر پر آئے۔ جبکہ آفاق خان شاہد نے 14866 ووٹ حاصل کر کے کامیابی حاصل کی۔ اس حلقے سے ماضی میں مہاجر قومی موومنٹ کے سلیم شہزاد نے 80 ہزار سے زیادہ ووٹ حاصل کیے تھے۔

افغانی صاحب کی شکست کا جائزہ لیا گیا تو پتا چلا کہ اورنگی ٹاؤن کے اکثر حلقوں سے وہ جیت گئے تھے لیکن قومی اسمبلی کے اس حلقے میں دیہی آبادی کے ووٹ بھی شامل تھے جہاں بلوچی، براہوی اور سندھی بولنے والے لوگوں کی اکثریت تھی۔ یہ کراچی کے قدیم گوٹھ تھے جن میں بنیادی سہولتوں کی بہت کمی بھی تھی اور خواندگی کی شرح بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ سچ یہ ہے کہ ان علاقوں کی طرف جماعت اسلامی نے بھی کبھی توجہ نہیں دی تھی، اور بعد ازاں

وہاں جا کر اندازہ ہوا کہ اکثر لوگ پیپلز پارٹی کے سوا کسی دوسری سیاسی جماعت کا نام تک نہیں جانتے تھے۔

جماعت اسلامی ضلع غربی کے امیر اشرف اعوان نے دیہی آبادی کے نام سے ایک نیا تنظیمی علاقہ بنایا اور عبدالرحیم مروت کو اس کا ناظم مقرر کیا۔ عبدالرحیم مروت نے پیا کی مدد سے ان گوٹھوں میں ہفتہ وار میڈیکل کیمپس کا انعقاد شروع کیا، جبکہ نظم خواتین نے بھی ان گوٹھوں میں جانا شروع کیا اور خواتین کی قرآن کلاسوں کا آغاز کیا۔

کچھ عرصے کے بعد کچھ گوٹھوں میں اسکول قائم کیے گئے جنھیں بعد ازاں گرین کریسنٹ ٹرسٹ نے اپنے زیر انتظام لے لیا اور ان اسکولوں کو ہلال پبلک اسکولز کا نام دے دیا گیا۔

عبدالرحیم مروت نے ان تمام گوٹھوں میں بے حد محنت سے کام کیا اور اگلے چند سال میں کئی افراد کو رکن بھی بنالیا۔ کراچی جماعت اسلامی کے نائب امیر افتخار احمد نے میری ہدایت پر ان گوٹھوں کا تفصیلی دورہ کیا اور سفارش کی کہ حلقہ کراچی اپنے بجٹ میں دیہی آبادی میں دعوتی کام کے لیے بجٹ مختص کرے۔ 1993ء کی انتخابی شکست کے بعد ضلع غربی کے گوٹھوں میں جماعت کے دعوتی کام کا آغاز ہونا، بجائے خود اس بات کا ثبوت تھا کہ کسی معرکے میں ہونے والی شکست تحریک اسلامی کے وابستگان کا حوصلہ پست نہیں کرسکتی۔

ثریک حیات طاہرہ کئی سال سے ہائی بلڈ پریشر اور ذیابیطس کے مرض میں مبتلا تھیں۔ نہایت بلند حوصلہ اور صابر شاکر خاتون تھیں، بیماری کی تکالیف کا زبان سے اظہار نہیں کرتی تھیں۔ عبادات اور گھریلو معاملات میں کوئی فرق پیدا نہیں ہونے دیتی تھیں۔ کبھی شکوہ نہیں کرتی تھیں کہ میں اپنی سیاسی مصروفیات کی وجہ سے گھر کو کم وقت دے پاتا ہوں۔ یہ شکوہ ضرور کرتی تھیں کہ آپ وقت پر دوائیں نہیں کھا پاتے۔ میں بھی ان امراض میں طویل

عرصے سے مبتلا تھا۔ اللہ نے ہمیں فرماں بردار بیٹے بیٹیوں سے نوازا تھا جو ہم دونوں پر جان چھڑکتے تھے۔ وہ اولاد پر سختی کرنے کی قائل نہیں تھیں لیکن نماز کے معاملے میں رعایت نہیں دیا کرتی تھیں۔

26 فروری 1994ء کو مہلتِ عمل ختم ہوگئی اور ہارٹ اٹیک جان لیوا ثابت ہوا۔ سقوطِ ڈھاکہ کے سانحے کے بعد پہلی مرتبہ کسی نے مجھے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے دیکھا تھا۔ شریکِ حیات سے 34 سالہ رفاقت کا اچانک خاتمہ نہ آنکھوں کو برداشت تھا اور نہ ہی دل و دماغ کے لیے قابلِ قبول۔ لیکن اللہ کی رضا پر راضی ہونے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

إنا لله وإنا إليه راجعون

90ء کی دہائی کا کراچی امن و امان کے لحاظ سے دنیا کے بدترین شہروں میں شامل تھا۔ الطاف حسین کے فسطائی گروہ کا شہر پر مکمل کنٹرول تھا۔ جرم اور سیاست ایک ہو چکے تھے۔ کسی بھی طبقے کے لوگ محفوظ نہیں تھے۔ 4 دسمبر 1994ء کو ملک کے معروف صحافی مدیر تکبیر محمد صلاح الدین کو دہشت گردوں نے گولیاں مار کر شہید کر دیا۔ صلاح الدین صاحب کا شمار ملک کے صفِ اوّل کے صحافیوں میں ہوتا تھا۔ وہ ایک بہادر، بے باک اور نظریاتی صحافی تھے۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے کراچی آئے تھے اور ساری زندگی جدوجہد کر کے بہت محنت سے صحافت میں اعلیٰ مقام حاصل کیا تھا۔ وہ طویل عرصے تک جماعت اسلامی کراچی کے روزنامہ جسارت کے بھی مدیر رہے تھے اور اس کے بعد ہفت روزہ تکبیر جاری کیا تھا۔ انہوں نے الطاف حسین اور ان کی پارٹی کے طرزِ سیاست کے خلاف ہمیشہ کھل کر لکھا، اور اس کی سزا کے طور پر گلبہار میں واقع ان کے گھر اور تکبیر کے دفتر کو بھی نذرِ آتش کیا گیا لیکن صلاح الدین صاحب کے قلم کو پابند نہیں کیا جا سکا۔

1995ء میں جماعت اسلامی سندھ کے امیر مولانا جان محمد عباسی نے مجھے بطور نائب امیر اپنے نظم میں شامل کر لیا۔ عباسی صاحب شاندار انسان تھے۔ بردباری، تحمل، خوش

اخلاق اور شائستگی ان کے مزاج کا حصہ تھی۔ وہ بے حد نرم خو انسان تھے اور کسی پر حکم چلانے کے قائل نہیں تھے۔ سندھ میں ہر طبقۂ فکر کے لوگوں سے ان کے بہت اچھے مراسم تھے اور وڈیرے، سردار اور گدی نشین بھی ان کی تکریم کرتے تھے۔

انہوں نے مجھے ضلع ٹھٹھہ، میرپور خاص، عمر کوٹ اور تھرپارکر کی نگرانی سونپ دی اور فرمایا کہ آپ خدمتِ خلق کے میدان میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں لیکن تنظیمی دوروں کے بغیر چھوٹے شہروں اور قصبوں میں دعوتی کام کو مستحکم نہیں کیا جا سکتا، گو صوبائی جماعت کے پاس مالی وسائل کی کمی ہے اور سفر کے لیے اچھی گاڑیاں بھی نہیں ہیں لیکن میری خواہش ہے کہ آپ ان اضلاع کے تنظیمی دورے باقاعدگی سے کیا کریں۔

اُس زمانے میں کراچی کے مخصوص حالات کی وجہ سے جماعت کے بھی ذمہ داران کی مصروفیات بہت زیادہ ہوا کرتی تھیں۔ سندھ کے اضلاع کے دوروں کی مصروفیت کا اضافہ ہوا تو میری طبیعت پر اس کا برا اثر ہوا اور پرانی بیماریوں نے تکلیف دینا شروع کر دی۔ معروف ماہر امراضِ قلب پروفیسر اظہر فاروقی میرے معالج تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ آرام نہیں کریں گے تو بستر سے لگ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل رہا کہ زندگی میں بستر سے لگنے اور سرگرمیوں کو محدود کرنے کی نوبت بہت کم ہی آئی۔

آپ ملین مارچ کر سکتے ہیں؟

1996ء کا سال تھا اور جولائی یا اگست کا مہینہ۔ قاضی حسین احمد صاحب نے ایک موقع پر پوچھا "نعمت صاحب!! آپ ملین مارچ کر سکتے ہیں؟" "جی کیوں نہیں!!" بغیر کسی تاخیر کے میرے منہ سے نکلا۔ "ایک ملین سے زیادہ لوگ ہونے چاہئیں"۔ قاضی صاحب نے اپنی خواہش ظاہر کی۔ ہنگامی طور پر شوریٰ کا اجلاس بلایا۔ 27 دسمبر تاریخ طے کی گئی۔ روٹ کا تعین، حاضری کو یقینی بنانا، تشہیری مہم، خواتین کی بھرپور شرکت سمیت دیگر تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد ہر کام کے لیے کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ پروگرام غیر معمولی نوعیت کا تھا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ اخراجات بھی بہت زیادہ ہوں گے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے "ملین مارچ فنڈ" قائم کیا گیا۔ حلقے اور علاقے کی سطح پر ہنگامی کارکنان کو بھی فعال کیا گیا۔

ریلیوں، مساجد کے باہر اجتماعات اور برادر تنظیموں کی بھرپور شرکت نے مختلف چند دنوں میں کراچی کی فضا کو گرما دیا۔ شاہد شمسی، سرفراز احمد، امین صادق وغیرہ نے سلیم ناز بریلوی کی آواز میں کئی پرجوش ترانے ریکارڈ کروائے۔ شباب ملی کے ذمہ داران اور کارکنان ملین مارچ کی تیاریوں میں پیش پیش رہے۔

20 ستمبر کی شام محترمہ بے نظیر بھٹو کے بھائی میر مرتضیٰ بھٹو اپنے قریبی ساتھیوں سمیت پولیس اہلکاروں کی ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بن گئے۔ اس اندوہناک سانحے نے پورے شہر کی فضا کو سوگوار کر دیا۔ مرتضیٰ بھٹو اپنے بہنوئی آصف علی زرداری کے طرزِ سیاست پر کھل کر تنقید کرتے تھے، اس لیے ان کے قتل کے بعد آصف زرداری کی جانب انگلیاں اٹھیں۔

ایک سینئر اور باخبر صحافی نے مجھ سے کہا: خان صاحب، بھٹو کی حکومت میں پولیس اہلکاروں کے ہاتھوں سگے بھائی کا قتل ثابت کرتا ہے کہ سیاست کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔

اس واقعہ سے ملین مارچ کی مہم بھی وقتی طور پر متاثر ہوئی۔ مارچ والے دن مقررہ وقت سے پہلے خواتین وحضرات کے لیے مختص کیے گئے روٹس سے شرکا کی آمد شروع ہوگئی۔ تبت سینٹر کے برج کو بطور اسٹیج استعمال کیا گیا۔ شام پانچ بجے تک لوگوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوچکی تھی کہ تاحدِ نگاہ سر ہی سر نظر آرہے تھے۔ صحافیوں نے تبصرہ کیا: آپ لوگوں نے سمندر کے کنارے، انسانوں کا سمندر بنا دیا۔ قاضی صاحب بھی اس دوران پہنچ گئے۔ نمازِ عصر ادا کی اور پروگرام کا باقاعدہ آغاز ہوگیا۔ لوگوں کی آمد کا سلسلہ مسلسل جاری رہا۔ مجھے اطلاع دی گئی کہ منتظمین نے بہت سارے قافلوں کو راستے میں روک دیا ہے کیونکہ آگے جانے کے لیے راستے میں گنجائش باقی نہیں بچی تھی۔ مرکز جماعت سے قاضی صاحب کے ساتھ دیگر احباب بھی تشریف لائے تھے۔ انہوں نے مجمع دیکھا تو دنگ رہ گئے۔ مختلف مقررین کے خطاب کے بعد قاضی صاحب تقریر کرنے آئے، اور حمد و ثناء کے بعد فرمایا: "میں نے تو ملین مارچ کا کہا تھا، یہاں تو پورا شہر امڈ آیا ہے"۔ اس جملے سے ہم سب کو بڑی تقویت ملی۔ مغرب کے وقت پروگرام ختم ہوا۔ نماز کے بعد میں کچھ لوگوں سے بات کررہا تھا، ایک صاحب میرے نزدیک آئے اور لپٹ کر روتے ہوئے کامیاب ملین مارچ کی مبارک باد دینے لگے، ساتھ ساتھ کہتے جاتے "نعمت صاحب! اللہ نے کرم فرمایا، محنت رائیگاں نہیں گئی"۔ تمام کارکنان بہت خوش تھے۔ اس تاریخی پروگرام کے بعد بہت سارے حلقہ جات میں استقبالیے دیے گئے اور دعوتی کام نئے عزم کے ساتھ آگے بڑھانے کا عہد کیا گیا۔ ملین مارچ کو ذرائع ابلاغ نے بھی اچھی کوریج دی۔ یہ مارچ کراچی میں جماعت اسلامی کے سیاسی سفر میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

3 فروری 1997ء کو ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ جماعت اسلامی کی شوریٰ نے

ان انتخابات میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ کیا۔ کئی اراکین شوریٰ نے بحث کے دوران اس تجویز کی مخالفت کی اور کہا کہ سیاسی پارٹیوں کو انتخابات کے بائیکاٹ سے بہت نقصان ہوتا ہے۔ شوریٰ کی اکثریت نے بائیکاٹ کا فیصلہ سنا دیا، اور ظاہر ہے کہ کوئی فیصلہ ہو جانے کے بعد وہ جماعت اسلامی کے ہر فرد کا فیصلہ ہوتا ہے، یہی اس اجتماعیت کی روح ہے۔

قاضی صاحب جماعت اسلامی کو ایک عوامی دینی و فلاحی سیاسی جماعت کے طور پر دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ دنیا بھر کی اسلامی تحریکوں کے سربراہان اور قائدین سے مسلسل رابطے میں رہتے ترکی اور تیونس جیسے ممالک میں اسلامی تحریکوں کی پیش قدمی کو نہ صرف قدر کی نگاہ سے دیکھتے، بلکہ چاہتے تھے کہ جماعت اسلامی پاکستان میں ان خطوط پر کام کرے اور نئے لوگوں کو تحریک میں بڑے پیمانے پر شامل کیا جائے۔ ہماری جب بھی ان سے ملاقات ہوتی ان کا یہی کہنا ہوتا کہ جب تک عام آدمی ہماری صفوں میں بلکہ ہماری قیادت کی صفوں میں نظر نہیں آئے گا جماعت اسلامی میدان سیاست میں قابلِ ذکر کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر پائے گی۔

انہوں نے ملک بھر میں ممبر سازی مہم چلانے کا حکم دیا اور خود بھی اس مہم میں بھرپور طریقے سے سرگرم ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ امیر جماعت کی غیر معمولی دلچسپی کی وجہ سے ملک کے ہر شہر اور قصبے میں ارکان و کارکنان نے دن رات محنت کی اور بڑی تعداد میں لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور جماعت اسلامی کی دعوت پہنچائی۔ 6 جون سے 15 جولائی 1997ء تک چلائی جانے والی اس مہم کے اثرات کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کراچی کے علاقے نیو کراچی نے ناظم علاقہ سید رشید احمد کی قیادت میں چالیس ہزار لوگوں کو جماعت کا ممبر بنایا اور ان سے باقاعدہ ممبر سازی کے فارم بھروائے گئے۔ کراچی کے ہر علاقے میں اسی جوش و خروش سے کارکنان نے کام کیا۔

ملین مارچ کے موقع پر قاضی حسین احمد کے ہمراہ، عقب میں شباب ملی کراچی کے صدر ڈاکٹر پرویز محمود موجود ہیں

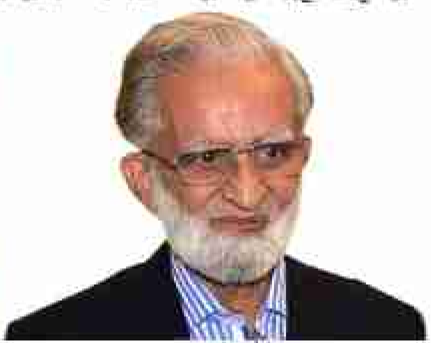

شاہد شمسی

محمد حسین محنتی

نائب امیر کراچی افتخار احمد (درمیان میں)

نیو کراچی کے ناظم علاقہ سید رشید احمد
اور ڈاکٹر معراج الہدیٰ صدیقی

سید محمد بلال

سرفراز احمد

معظم علی قادری

خدمت، صرف رضائے الٰہی کے حصول کے لیے

کراچی کے ضلع غربی میں واقع اورنگی ٹاؤن ملک کی سب سے بڑی کچی آبادی ہے۔ اس علاقے میں تھوڑی بہت آبادی تو 1960ء کی دہائی سے تھی، لیکن اس آبادی میں غیر معمولی اضافہ اُس وقت ہوا جب 1971ء میں سقوطِ ڈھاکہ کے بعد مہاجرین لٹ پٹ کر کراچی پہنچے اور صوبائی حکومت نے انہیں بسانے کے لیے اورنگی ٹاؤن میں رہائشی انتظامات کیے۔

جماعت اسلامی نے مہاجرین کی آبادکاری کے لیے ناقابلِ فراموش کردار ادا کیا۔ کراچی میں آباد دہلی پنجابی سوداگران، چنیوٹ اور میمن برادری سمیت ہر طبقۂ فکر کے لوگوں نے غیر معمولی اتفاق کا ثبوت دیا اور انصارِ مدینہ کی یاد تازہ کردی۔ مہاجرین کی اکثریت خالی ہاتھ آئی تھی لیکن پڑھے لکھے اور بے حد خوددار لوگ تھے۔ فاقے کرلیتے لیکن ہاتھ پھیلانے اور کسی سے کچھ مانگنے سے گریز کرتے۔

اُس زمانے میں وہاں نہ پانی کی سہولت تھی، نہ بجلی اور گیس کی، اور نہ ہی پبلک ٹرانسپورٹ کی۔ علاقہ نیا نیا آباد ہورہا تھا، اس لیے اسکول، ہسپتال وغیرہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

پروفیسر غفور احمد، منور حسن صاحب کو لے کر فجر کے وقت اپنی گاڑی میں اورنگی ٹاؤن جاتے۔ خاموشی سے کچھ مستحق لوگوں کی مالی مدد کرتے اور سیکٹر ساڑھے گیارہ میں جماعت کے تحت تعمیر کیے جانے والے کئی سو مکانات کا جائزہ بھی لیتے تھے۔ عثمان رمز، ڈاکٹر مبین

اختر، ڈاکٹر اطہر قریشی، اشرف اعوان، حکیم عزیز بیگ قاسمی اور نثار احمد صاحب سمیت سینکڑوں لوگ تھے جو اورنگی ٹاؤن میں بسنے والے مہاجرین کی خدمت کے لیے ہمہ وقت مصروف رہتے۔ مجھے بھی ان لوگوں کے ساتھ مہاجرین کی خدمت کی سعادت حاصل ہو رہی تھی۔ جماعت اسلامی کا شعبۂ خدمت خلق نہایت منظم انداز میں مہاجرین کی بلا تفریق خدمت کر رہا تھا اور قرآن وسنت کی تعلیمات کے مطابق لوگوں کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچائے بغیر ان کی ہر ممکن مدد کی جا رہی تھی۔

انہی دنوں میں جماعت اسلامی کراچی نے اورنگی ٹاؤن کے سیکٹر پانچ میں ایک رفاہی ہسپتال کے لیے کے ڈی اے سے پلاٹ حاصل کیا۔ پلاٹ کا رقبہ دو ایکڑ سے زیادہ تھا۔ بعد ازاں اس کے کچھ حصے پر قبضہ ہو گیا اور اس سے متصل پلاٹ عدالت کے حکم پر جماعت کو بمشکل مل پایا۔

1975ء میں اس پلاٹ پر 100 بستروں کے ہسپتال کے قیام کا منصوبہ بنایا گیا۔ یہ کراچی میں صحت کے شعبے میں جماعت اسلامی کا سب سے بڑا منصوبہ تھا۔ اس منصوبے کو عملی شکل دینے کے لیے الخدمت ویلفیئر سوسائٹی کے نام سے ایک ادارہ رجسٹرڈ کروایا گیا۔

الخدمت کو سوسائٹیز ایکٹ XXI,1860 کے تحت 27 جولائی 1976ء کو رجسٹرڈ کروایا گیا۔

اس کے عہدیداران کے نام درج ذیل ہیں:

1۔ پروفیسر سرجن نور الٰہی۔ صدر

2۔ نعمت اللہ خان۔ نائب صدر

3۔ ڈاکٹر افتخار احمد۔ جنرل سیکریٹری

4۔ ڈاکٹر عبدالمجید۔ خازن

5۔ ڈاکٹر اقبال غیور۔ جوائنٹ سیکریٹری

6۔عبدالرحمٰن پچاپرا۔رکن

7۔فضل مبین احمد۔رکن

8۔ڈاکٹر محمد اطہر قریشی۔رکن

9۔افتخار احمد۔رکن

10۔حکیم محمد اقبال حسین۔رکن

11۔محمود احمد مدنی۔رکن

12۔محمد جنید فاروقی۔رکن

13۔ڈاکٹر قاضی محفوظ الحسنین جلیسی۔رکن

14۔محمد عثمان رمز۔رکن

جماعت اسلامی کراچی کے ذمہ داران اور نو تشکیل شدہ الخدمت کے عہدیداران اس ہسپتال کے قیام کے لیے بہت پُر جوش تھے۔ ملک کی معروف آرکیٹیکچر کمپنی کی خدمات حاصل کی گئیں، جس نے ہسپتال کا نقشہ اور ماڈل بنایا۔

ڈاکٹر عبدالمجید صاحب جو کہ دوائیں بنانے والی کمپنی بی قاسم فارما کے مالک تھے، کسی زمانے میں ڈاؤ میڈیکل کالج میں لیکچرر بھی رہے تھے۔ ان کے ایک شاگرد سعودی شہری تھے جو بعد ازاں وہاں کے ڈائریکٹر ہیلتھ ہو گئے تھے۔

سعودی عرب کے فرماں روا شاہ خالد بن عبدالعزیز کی بھی خواہش تھی کہ اورنگی ٹاؤن میں مہاجرین مشرقی پاکستان کے لیے کوئی ہسپتال بنایا جائے۔ اس سلسلے میں ان کی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے بات بھی ہوئی تھی اور انہوں نے کچھ رقم بھی اس مد میں ابتدائی طور پر بھجوائی تھی۔ مجوزہ ہسپتال کا نام شاہ خالد ہسپتال تجویز کیا گیا اور اس کا تعارفی بروشر بھی شائع کروایا گیا۔ پلاٹ پر قبضے اور عدالت میں مقدمے کی وجہ سے منصوبہ غیر معمولی تاخیر کا شکار ہو گیا۔

چند سال کے بعد ڈاکٹر عبدالمجید، ڈاکٹر اقبال غیور اور مجھے اس منصوبے کی مالی معاونت کے حصول کی غرض سے سعودی عرب بھیجا گیا لیکن اس وقت شاہ خالد وفات پا چکے تھے اور ڈاکٹر مجید کے شاگرد وزیر ہیلتھ کے عہدے پر نہیں رہے تھے۔ وفد کو خالی ہاتھ واپس آنا پڑا۔ 1979ء کے بلدیاتی انتخابات اور عبدالستار افغانی صاحب کے کراچی کا میئر منتخب ہوجانے کے بعد جماعت اسلامی کراچی کے ذمہ داران شہر کے بلدیاتی سسٹم کو چلانے میں اتنے مصروف ہوئے کہ ہسپتال کے منصوبے سے توجہ ہٹ گئی۔

90 کی دہائی میں عبدالرشید بیگ صاحب نے اس پلاٹ پر ایک مدرسے کے قیام کا منصوبہ پیش کیا اور نظم کی منظوری کے بعد عمارت کا نقشہ بھی بنوالیا لیکن پھر ایک نئی پیش رفت سامنے آگئی۔ ڈاکٹر فیاض عالم نے جو اُس زمانے میں پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن (PIMA) میں بہت فعال تھے اور اس کی مرکزی شوریٰ کے رکن تھے، 1992ء میں اس پلاٹ پر پیما کے تعاون سے اسپیشلسٹ کلینک اور ڈائگنوسٹک سینٹر کے قیام کی تجویز پیش کردی۔

الخدمت کراچی کے جنرل سیکریٹری اسامہ مراد صاحب تھے، انہوں نے ڈاکٹر فیاض اور ڈاکٹر اورنگزیب کو جو خود بھی اورنگی میں رہا کرتے تھے اور ضلع غربی کے نائب قیم تھے، بتایا کہ الخدمت کراچی ہسپتال کے قیام میں دلچسپی نہیں رکھتی لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ ہم یہ پلاٹ ضلع غربی کے حوالے کردیں اور آپ لوگ ان کے ساتھ مل کر اس منصوبے پر کام کرلیں۔ ڈاکٹر فیاض نے اس منصوبے کو اپنے سر پر سوار کرلیا تھا اور وہ ہر قیمت پر اس منصوبے پر عمل درآمد ہوتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ بالآخر میں نے ضلع غربی کے امیر اشرف اعوان سے بات کرکے ایک کمیٹی بنادی اور ڈاکٹر فیاض کو اس منصوبے کا پراجیکٹ سیکریٹری مقرر کردیا گیا۔

کمیٹی کے اراکین کے نام درج ذیل ہیں

سرپرست: اشرف اعوان

پراجیکٹ سیکریٹری: ڈاکٹر فیاض عالم

اراکین: مظفر احمد ہاشمی اخلاق احمد ڈاکٹر سید احسان اللہ

ڈاکٹر ذکی الدین صابری عبدالغفار عمر ڈاکٹر تبسم جعفری

صفات احمد صدیقی ڈاکٹر اورنگزیب اسحاق خان

میں نے یہ بات صاف طور پر بتادی تھی کہ ہسپتال کے لیے الخدمت کراچی کوئی رقم نہیں دے گی اور کمیٹی کو خود ہی عطیات جمع کرنا ہوں گے۔ ویسے بھی اُس زمانے میں الخدمت کراچی کے سالانہ بجٹ کا زیادہ تر انحصار چرم قربانی کی مہم پر ہوا کرتا تھا اور الطاف حسین کی پرتشدد سیاست نے قربانی کی کھالیں جمع کرنا بھی مشکل بنادیا تھا۔ طاقت کے زور پر لوگوں سے کھالیں حاصل کرنا، بلکہ جمع کرنے والے دیگر گروہوں سے کھالیں چھین لینا بھی عام سی بات تھی۔ دینی مدارس اور ایدھی ٹرسٹ جیسے اداروں کو اس چھینا جھپٹی سے بہت نقصان پہنچا تھا۔ چرم قربانی کی مد سے الخدمت کے کئی منصوبوں کے اخراجات پورے کیے جاتے تھے۔

اس پلاٹ کے ایک کونے پر جماعت اسلامی کا ضلعی دفتر بنا ہوا تھا جس کے ایک کمرے میں الخدمت کی کلینک بھی قائم تھی۔ یہ کلینک 1991ء میں ہنگامی طور پر قائم کی گئی تھی کیونکہ یہ اطلاع ملی تھی کہ مہاجر قومی موومنٹ کے رکن قومی اسمبلی سلیم شہزاد اس پلاٹ کے کونے پر قائم دفتر ضلع کی عمارت کو سرکاری اداروں کی مدد سے مسمار کروانا چاہتے ہیں اور یہ ایشو ابھار رہے ہیں کہ جماعت اسلامی نے رفاہی پلاٹ پر ہسپتال کے بجائے دفتر بنایا ہوا ہے۔ جماعت اسلامی ضلع غربی کے ناظم اور کارکنوں نے اس پلاٹ پر قبضے کی ہر کوشش کو ناکام بنادیا۔

ڈاکٹر اورنگزیب نے اس کلینک کا آغاز کیا۔ بعد ازاں الخدمت نے اس پلاٹ پر میت گاڑی کا بکنگ آفس بھی بنالیا۔ ہسپتال کمیٹی کے ایک رکن ڈاکٹر ذکی الدین صابری کا تعلق امراضِ چشم کے شعبے سے تھا۔ انہوں نے اس کلینک میں ہفتے میں ایک دن امراضِ چشم کی مفت کلینک شروع کردی۔

ہسپتال کا نام تبدیل کر کے الخدمت ہسپتال کردیا گیا اور پہلے فیز کا نقشہ بنوالیا گیا۔ اس مرحلے پر ناظم آباد کے رکن جماعت انجینئر تسنیم قاضی نے بہت تعاون کیا۔ نارتھ ناظم آباد زون کے امیر انصار رضی کے بہنوئی مجید احمد عباسی نے اس منصوبے کے لیے ایک خطیر رقم کا عطیہ دے دیا، جبکہ پیا کراچی کے صدر ڈاکٹر احسان اللہ، پاکستان بزنس فورم کے میاں تنویر احمد مگوں، سعید اسماعیل، ملک نعیم، لیاقت عبداللہ اور محمد عارف نے بھی نہ صرف خود تعاون کیا بلکہ دوسروں سے بھی عطیات جمع کیے۔ جنرل ریٹائرڈ محمد عمر کے ایک صاحبزادے منیر کمال اس زمانے میں فیصل بینک کے کنٹری ہیڈ تھے، انہوں نے بھی ہسپتال کی تعمیر میں معاونت کی۔ شمس الدین خالد ایڈووکیٹ نے مسلم ایڈ کے ٹرسٹی اور اپنے دیرینہ دوست سید تنظیم واسطی سے بات کی اور مسلم ایڈ نے 1994ء میں ہسپتال کے شعبہ امراضِ چشم کے لیے کئی لاکھ روپے کا عطیہ دیا۔

تنظیم واسطی سید منور حسن اور مظفر ہاشمی کے بھی قریبی دوست تھے، اور برطانیہ کے مسلمانوں کی معروف تنظیم یو کے اسلامک مشن کے بھی بانیوں میں سے تھے۔ واسطی صاحب طویل عرصے سے برطانیہ میں مقیم تھے لیکن سال میں ایک دو بار کراچی آیا کرتے اور ادارۂ نورحق آکر ملاقات ضرور کرتے تھے۔ مسلم ایڈ آگے چل کر الخدمت کی ایک بہترین پارٹنر آرگنائزیشن بن گئی اور بہت سارے منصوبوں میں گراں قدر تعاون کیا۔

جماعت اسلامی حلقۂ خواتین نے اس منصوبے میں خصوصی دلچسپی لی اور بڑے پیانے پر عطیات جمع کرنے کی مہم چلائی۔ ہسپتال کی نئی عمارت کا تعمیراتی کام زور شور سے شروع

کر دیا گیا۔

7 تا 9 دسمبر 1994ء کو الخدمت ہسپتال اورنگی میں ایک تین روزہ آئی کیمپ کا انعقاد کیا گیا۔ اب تو مفت آئی کیمپ کی روایت بہت مستحکم ہو چکی ہے لیکن اس زمانے میں الخدمت کے لیے یہ نئی سرگرمی تھی۔ یہ الخدمت کراچی کا پہلا آئی کیمپ تھا جس میں موتیا، کالا پانی اور بھینگے پن کے آپریشن بھی کیے گئے تھے اور موتیا کے مریضوں کو لینس بھی لگائے گئے تھے۔ یہ کیمپ پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن اور سوسائٹی فار دی پریوینشن اینڈ کیور آف بلائنڈنیس کے تعاون سے منعقد کیا گیا تھا۔ اس کیمپ کے روحِ رواں ڈاکٹر شاہنواز منعمی اور ڈاکٹر ذکی الدین صابری تھے۔

1996ء میں الخدمت ہسپتال اورنگی ٹاؤن میں ایک نئی پیش رفت ہوئی۔ ہسپتال میں امراضِ نسواں کا شعبہ قائم کر دیا گیا۔ ڈاکٹر فیاض کی اہلیہ ڈاکٹر صدیقہ نے زچہ و بچہ کی کلینک کا آغاز کر دیا۔ ڈاکٹر صدیقہ کے والد فضل اللہ حسینی ضلع وسطی کے رکن جماعت تھے۔ اس سے قبل کراچی الخدمت کے کسی ادارے میں گائنی کی کلینک نہیں تھی اور نہ ہی کسی خاتون نے الخدمت کے کسی شعبے میں کام کیا تھا۔ کچھ ہی عرصے کے بعد خواتین کا رجوع بہت بڑھ گیا۔

1996 - الخدمت ہسپتال اورنگی ٹاؤن کی
پہلی عمارت کا افتتاح کیا گیا

7 دسمبر 1994 - الخدمت ہسپتال اورنگی ٹاؤن کے پلاٹ پر
مفت آئی سرجیکل کیمپ منعقد کیا گیا

اشرف اعوان اور صفات احمد صدیقی کے ہمراہ
ہسپتال کی کامیابی کی اللہ کے حضور دعا مانگتے ہوئے

پاکستان ڈاکس فورم کے وفد کا ہسپتال کی زیرِ تعمیر عمارت کا دورہ
(دائیں سے) ضیاء حمید، سعید اسماعیل،
تنویر احمد مگوں، ابو سعید، لیاقت عبداللہ اور ابرار مگوں

الخدمت ہسپتال اورنگی ٹاؤن کے
پراجیکٹ سیکریٹری ڈاکٹر فیاض عالم

پیما کے رکن ڈاکٹر نصرت خدا نے ہسپتال کو
الٹراساؤنڈ مشین کا تحفہ پیش کیا۔
ڈاکٹر ہمایوں فرخ بھی اس موقع پر موجود تھے

1996 - ڈاکٹر صدیقہ فیاض نے
الخدمت میں شعبہ امراضِ نسواں کا آغاز کیا

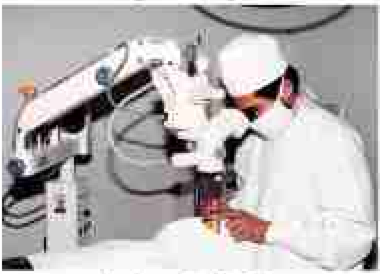

ڈاکٹر ذکی الدین صابری نے
الخدمت ہسپتال میں امراضِ چشم کا شعبہ قائم کیا

فہرست پر جائیے

اہلِ کراچی کا جذبۂ انفاق قابلِ رشک ہے

1994ء میں سندھ میں طوفانی بارشیں ہوئیں جس کی وجہ سے کئی اضلاع میں سیلاب کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ ضلع دادو سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ جوہی اور خیر پور ناتھن شاہ کے درجنوں گوٹھوں میں فصلیں تباہ ہوگئیں اور مکانات زیرِ آب آگئے۔ ہم نے کراچی سے کئی ٹرک امدادی سامان متاثرہ علاقوں میں تقسیم کے لیے روانہ کیا، جبکہ ڈاکٹروں کی ایک ٹیم بھی ادویہ سے لدے ہوئے ٹرک کے ساتھ دادو روانہ کی۔ ٹیم میں ڈاکٹر ظفر اقبال، ڈاکٹر اورنگزیب، ڈاکٹر ذکی صابری، ڈاکٹر خالد اور ڈاکٹر فیاض شامل تھے۔ جماعت اسلامی صوبہ سندھ کے نائب قیم ممتاز سہتو بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس ٹیم نے پانی میں پھنسے ہوئے لوگوں تک پہنچنے کے لیے کشتیوں کا استعمال بھی کیا۔ ہزاروں خاندانوں میں راشن تقسیم کیا گیا، جبکہ سینکڑوں مریضوں کا علاج کیا گیا اور مفت ادویہ فراہم کی گئیں۔ لاکھوں روپے مالیت کی یہ دوائیں کمپنی قاسم اور وائنڈس فارما نے بطورِ عطیہ فراہم کی تھیں۔

یکم مارچ 1997ء کی بات ہے، ادارہ نورحق میں کراچی کے کارکنان کا اجتماع ہورہا تھا، اطلاع آئی کہ "ہرنائی" (بلوچستان) میں زلزلہ آگیا ہے۔ میں نے اعلان کروایا کہ ہرنائی میں زلزلہ آگیا ہے، خواہش ہے کہ ہم کارکنان کی ٹیم لے کر وہاں پہنچیں، اس لیے جو حضرات جانے کے خواہش مند ہیں وہ اپنے ناموں کا اندراج کروادیں۔ اس کے ساتھ امدادی سامان اور رقم کی اپیل بھی کی۔ لوگوں نے بڑی تعداد میں نام لکھوا دیے۔ عبدالرشید بیگ صاحب کو ہرنائی جانے والوں کی ٹیم کا انچارج بنایا گیا۔ متاثرہ علاقے کے

لیے روانہ ہونے سے قبل اخبارات میں تباہی کی خبروں کے ساتھ امدادی سرگرمیوں کے حوالے سے اطلاعات بھی موصول ہوئیں کہ بیرونِ پاکستان سے 5000 کے لگ بھگ خیمے آئے ہیں، جب کہ 1500 خیمے گورنر بلوچستان نے دیے ہیں لیکن ہرنائی سب ڈویژن کے 5 گاؤں میں صرف چند درجن خیمے تقسیم کیے گئے ہیں۔ بعض واقفانِ حال نے یہ بھی بتایا کہ کچھ خیمے ایسے علاقوں میں تقسیم ہوئے جو متاثر ہی نہیں ہوئے تھے۔ اسپیکر بلوچستان اسمبلی نے سبی میں اپنے دو انتخابی حلقوں میں اچھے خاصے خیمے اور امدادی سامان تقسیم کروا دیا۔ ستم ظریفی تو یہ کہ 28 فروری اور یکم مارچ کی درمیانی شب زلزلہ آیا اور حکومت بلوچستان نے 2 مارچ کو سبی میلے کا آغاز کر دیا۔ ایک جانب پانچ روزہ میلے پر کروڑوں روپے خرچ کر کے ناچ گانے کی محفلیں سجائی جا رہی تھیں، اور دوسری طرف پڑوس کے گاؤں دیہات میں بے گور و کفن لاشیں تدفین کی منتظر تھیں۔ جماعت اسلامی کراچی کے کارکنان کے وہاں پہنچنے پر متاثرین نے سُکھ کا سانس لیا۔ جماعت اسلامی سے پہلے وہاں نہ کوئی سیاسی جماعت پہنچی تھی اور نہ ہی کسی لسانی گروہ کے لوگ امدادی کاموں کے لیے پہنچے تھے، اور نہ ہی کوئی این جی او نہیں وہاں نظر آئی۔ زلزلے کی تباہ کاریوں سے آگاہ کرنے اور امدادی سرگرمیوں میں معاونت کے لیے عبدالحق ہاشمی قیم صوبہ بلوچستان، قاضی محمد اسماعیل امیر شہر کوئٹہ، اور فضل الٰہی کے ساتھ گورنر بلوچستان سے ملاقات کی۔ انھیں ساری تفصیلات بتائیں۔ اس کے علاوہ کوئٹہ پریس کلب میں پریس کانفرنس رکھی اور صحافیوں کو زلزلے سے ہونے والے نقصانات کی تلافی کے لیے امدادی سرگرمیوں کے متعلق بتایا۔ 11 مارچ کو کراچی میں ایک پریس کانفرنس کے ذریعے لوگوں سے اپیل کی کہ زلزلہ فنڈ میں مزید عطیات اور سامان دیں۔ الحمدللہ اس پر بہت مثبت ردِعمل سامنے آیا۔ اگلے چند روز میں لاکھوں روپے جمع ہو گئے جبکہ امدادی سامان کا بھی ڈھیر لگ گیا۔ جمعیت قطر الخیریہ اور اسلامک ریلیف ورلڈ وائڈ کا بھجوایا ہوا بہت سارا

امدادی سامان بھی ہمارے ذریعے تقسیم ہوا۔ اس موقع پر حلقۂ خواتین کی کوششیں بھی کسی سے کم نہیں رہیں۔ ہماری بہن ناصرہ الیاس نے غیر معمولی تعاون کیا اور راشن کی مد میں لاکھوں روپے جمع کیے۔ اسلامی جمعیت طلبہ اور جمعیت طلبہ عربیہ کے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد بھی اس مہم میں شامل تھی۔ امیر جماعت اسلامی بلوچستان مولانا عبدالحق بلوچ 6 مارچ سے 12 مارچ تک امدادی کیمپ میں موجود رہے اور امدادی سامان کی تقسیم کے عمل کی نگرانی کی۔ نائب امیر صوبہ مولانا محمد شاہ مینگل اور قیم صوبہ عبدالحق ہاشمی کے علاوہ کوئٹہ کے مولانا ہاشم، عبداللہ ہاشمی، لورالائی کے اسداللہ خان، محمد انور خان، ناکس کے بہاءالدین، ماسٹر امیر محمد شاہ کے علاوہ دیرنائی کے نور محمد شاہ قدم قدم پر ساتھ رہے۔ اس زمانے میں وہاں جماعت اسلامی کا باقاعدہ نظم موجود نہیں تھا۔ ہمارے وہاں جانے اور فلاحی سرگرمیوں کے نتیجے میں کچھ لوگ جماعت کے قریب آئے اور آگے چل کر جماعت کی تنظیم وہاں قائم ہوئی۔

1998ء کا برس تھا اور مارچ کی ابتدائی تاریخیں۔ طوفانی بارشوں نے بلوچستان کے مکران ڈویژن کے مختلف علاقوں میں تباہی مچا دی۔ 36 گھنٹے مسلسل جاری رہنے والی بارش کی وجہ سے سیلاب آ گیا جس کی زد میں آ کر عشر دیہاتوں کے سینکڑوں مکانات اور مویشی بہہ گئے۔ کئی حفاظتی بند ٹوٹ گئے اور تقریباً تین سو سے زیادہ افراد لاپتا ہو گئے۔ ہنگامی بنیادوں پر مخیر حضرات سے تعاون کی اپیل کی۔ اس موقع پر بھی ناظم خواتین نے زبردست کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور مختلف ذرائع سے بڑی مقدار میں امدادی سامان اکٹھا کرلیا۔ کارکنان کا وفد بھیجنے کے لیے امرائے اضلاع کا اجلاس طلب کیا۔ امدادی اشیاء کے نرخ معلوم کرنے، اور خریداری کرنے کے لیے مختلف افراد کی ڈیوٹی لگائی۔ اخبارات میں سیلاب زدگان کی امداد کے لیے اپیل شائع کروائی۔ ہنگامی بنیادوں پر امدادی سامان سے بھرے پانچ ٹرک متاثرہ علاقوں کی طرف روانہ کیے۔ ڈاکٹر محمد خالد اور ڈاکٹر سلطان

مصطفیٰ کی قیادت میں طبی امدادی ٹیم 6 مارچ کو تربت کے لیے روانہ ہوئی۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے مری آباد، کوشقلات، دیہات، ریکانی بینٹ، پنج مروان، زگرانی ڈن، شنزور، تنزگ، ملکی باغ، بلن، کسر، کمر دیہرانی لمب اور دہرانی بینٹ میں ساڑھے تین ہزار کے لگ بھگ افراد کو طبی امداد فراہم کی۔ میں بھی بڑی مقدار میں امدادی سامان اور کارکنان کی ٹیم لے کر تربت پہنچا۔ ابھی حکمت عملی ترتیب ہی دے رہے تھے کہ سامان کس طرح تقسیم کیا جائے کہ بارش کا سلسلہ پھر شدت سے شروع ہو گیا اور متاثرہ علاقوں میں جانے والے راستے بند ہو گئے۔ میں کسی طور کراچی واپس پہنچا تا کہ مزید امدادی سامان وہاں بھجوانے کا انتظام کر سکوں۔ اس دوران خیال آیا کہ ایئر فورس کے پاس C-130 جہاز ہیں، کیوں نہ ان سے تعاون حاصل کیا جائے۔ مناسب سمجھا کہ ازخود کوئی اقدام کرنے کے بجائے قاضی صاحب سے بات کروں۔ فون کیا اور درخواست کی کہ آپ نواز شریف سے رابطہ کریں اور انہیں جہاز فراہم کرنے کا کہیں۔ اُن دنوں قاضی صاحب کچھ معاملات پر نواز شریف سے سخت ناراض تھے، کہنے لگے: "میں خود تو فون نہیں کروں گا! ہاں ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ذاتی حیثیت کے بجائے امیر جماعت کی حیثیت میں وزیر اعظم کو خط لکھوں۔ اگلے دن ایک کھلا خط مختلف اخبارات میں شائع ہو گیا۔ اندازہ تھا جلد کوئی جواب ملے گا، اور ہوا بھی کچھ اسی طرح۔ میں ادارہ نورحق میں بیٹھا کچھ کام نمٹا رہا تھا کہ ایئر فورس کے کچھ افسران وردی میں ملبوس میرے پاس آئے، رسمی سلام دعا کے بعد بغیر کسی تمہید کے کہنے لگے: بتائیے سامان کہاں ہے؟ کارکنان اور نظم خواتین کا شبانہ روز محنت سے اکٹھا کیا ہوا سامان ادارہ نورحق اور کورنگی میں رکھا ہوا تھا۔ انہیں نشاندہی کر دی اور گوادر روانہ ہو گیا۔ افسران مطمئن ہو کر چلے گئے۔ اگلے دن ایئر فورس کے اہلکار ٹرکوں کے ہمراہ دونوں مقامات پر پہنچ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سامان لوڈ کیا، مزید گنجائش نہیں رہی، اور سامان لے کر فیصل ایئر بیس پہنچ گئے جہاں پہلے سے موجود C-130 جہاز میں

سامان لوڈ کروایا اور تربت روانہ کر دیا۔ اب سامان کی وصولی کا مرحلہ آیا تو ایک تنازع کھڑا ہو گیا۔ جہاز میں امدادی سامان کے ساتھ آنے والے اور ہوائی اڈے پر پہلے سے موجود ایئر فورس اہلکار مُصر تھے کہ چوں کہ یہ سامان ہم نے مختلف مقامات سے اٹھایا ہے اور خود اپنے جہاز میں لوڈ کیا ہے، اس لیے یہ سامان ہم خود تقسیم کریں گے۔ عجیب مشکل تھی۔ خیال آیا کسی ذمہ دار افسر سے بات کرنی چاہیے تا کہ سامان حاصل کیا جا سکے۔

ایک کمانڈر سے بات کی اور ساری صورت حال سمجھائی، تب کہیں جا کر امدادی سامان ہمارے حوالے کیا گیا۔ ہمارے طریقۂ کار کی شفافیت نے ایئر فورس کے افسران اور جوانوں کو متاثر کیا۔ کراچی میں موجود باقی سامان دوسری پرواز سے تربت پہنچایا گیا۔ سامان کی ترسیل پر ہمارا ایک روپیہ بھی خرچ نہیں ہوا۔ سامان کی تقسیم کے عمل میں شرکت کے لیے عبدالرشید بیگ کراچی کے پچاس کارکنان کے ہمراہ موجود تھے۔ اس دوران اُن علاقوں کے منتخب نمائندے ہمیں کہیں نظر نہیں آئے۔ انتظامیہ کی کارکردگی بھی تسلی بخش نہیں تھی۔ امدادی سرگرمیوں کے جائزے اور مزید بہتری کے لیے طے کیا گیا کہ ہر روز نماز عشاء کے بعد کراچی اور مقامی کارکنان کا اجتماع کیا جائے، جس میں یومیہ کارکردگی کی رپورٹ متعلقہ ناظم پیش کیا کرے۔ ہماری بہنوں اور بیٹیوں نے بھی اپنا محاذ خوب سنبھال رکھا تھا۔ امت الرقیب صاحبہ، طلعت ظہیر صاحبہ، کرن عارف صاحبہ اور دیگر خواتین پر مشتمل وفد سیلاب سے متاثرہ علاقوں میں مسلسل سرگرم عمل رہا۔ الحمد للہ رفقا، کی غیر معمولی محنت اور بڑے پیمانے پر امدادی کاموں کی بدولت ان علاقوں میں جماعت کے دعوتی کام کا راستہ کھلا۔ مقامی افراد ہمارے کارکنان کے پاس آتے، جماعت اسلامی، اس کے مقصد اور سرگرمیوں کے متعلق سوالات کرتے۔ کچھ نوجوان ان مصروفیات سے متاثر ہو کر رضا کار بن گئے۔ امدادی کاموں میں ہاتھ بٹانے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے سیاسی نمائندوں اور انتظامیہ کو کوسنے بھی دیتے تھے۔

مئی 1999ء میں سمندری طوفان نے ٹھٹھہ اور بدین کے ساحلی علاقوں کیٹی بندر، جاتی، شاہ بندر اور گولارچی کے سینکڑوں گوٹھوں میں زبردست تباہی مچائی۔ 26 گھنٹے تک مسلسل ہونے والی بارش نے بجلی اور ٹیلی فون کا نظام درہم برہم کر دیا۔ 200 کے لگ بھگ لانچیں ماہی گیروں سمیت لاپتا ہو گئیں۔ ڈاکٹر محمد خالد اور ڈاکٹر فیاض کو ابتدائی جائزے کے لیے کیٹی بندر بھیجا۔ ان دونوں نے وہاں نیوی کی جانب سے فراہم کردہ ایک چھوٹی سی بوٹ میں دور دراز علاقوں میں جا کر ہونے والے نقصانات کا جائزہ لیا اور اگلے روز واپس آ گئے۔ الخدمت کے ذمہ داران کے ساتھ میٹنگ کی اور طوفان سے متاثر ہونے والوں کی امداد کے لیے اپیل کی خبر جاری کروائی۔ کراچی کے تمام اضلاع نے مختصر نوٹس پر شہر بھر میں امداد جمع کرنے کے لیے کیمپ لگا دیے۔ اللہ نے اہل کراچی کے دلوں میں انفاق فی سبیل اللہ کا غیر معمولی جذبہ رکھا ہے۔ ہر طبقۂ فکر کے لوگوں نے بھرپور تعاون کیا، رقومات بھی دیں اور راشن سمیت بہت سارا امدادی سامان بھی جمع ہوا۔ 25 مئی سے کیٹی بندر اور جاتی میں امدادی کیمپس لگانے کا فیصلہ کیا۔ امیر صوبہ محترم اسد اللہ بھٹو نے ہدایت کی کہ گولارچی اور بدین میں بھی کیمپس لگائے جائیں اور ان کی نگرانی پر نائب قیم صوبہ ممتاز حسین سہتو کو مامور کیا۔ کیٹی بندر میں کیمپ لگانے اور امدادی سرگرمیوں کی نگرانی کے لیے ڈاکٹر فیاض عالم کی سربراہی میں پندرہ کارکنان کا قافلہ کراچی سے روانہ ہوا، اور اسی دن ایک سڑک کے کنارے کیمپ بھی لگا دیا گیا۔ اس علاقے میں جماعت اسلامی کا نظم موجود نہیں تھا، اس لیے طے کیا گیا کہ پہلے مقامی افراد اور نیوی کے جوانوں کے تعاون سے ہونے والے نقصانات کا سروے کیا جائے، اس کے بعد سامان کی تقسیم کی جائے۔

38 گوٹھوں کے 5124 متاثرہ افراد میں 7500 کلو آٹا، 3 ہزار کلو چاول، 1400 کلو دال مونگ، 1400 کلو چنے، 700 کلو خشک دودھ تقسیم کیا گیا۔ عبدالرشید بیگ صاحب کی سربراہی میں 55 کارکنان پر مشتمل قافلہ کراچی سے جاتی کے لیے روانہ

کیا۔ کوئی مناسب جگہ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے یہاں بھی لب سڑک کیمپ قائم کرنا پڑا۔ کراچی سے کئی ٹرکوں پر پہنچنے والا امدادی سامان 240 گوٹھوں کے 6006 خاندانوں کے 35856 افراد میں تقسیم کیا گیا۔ ہمارے ڈاکٹروں نے سیلاب سے پھیلنے والے وبائی امراض میں مبتلا افراد کے علاج معالجے کے لیے لانچوں کا استعمال کیا اور تقریباً 80 گوٹھوں کے 980 افراد کا علاج کیا۔ جاتی کے میڈیکل کیمپ کے انچارج ڈاکٹر خالد مشتاق تھے جنہوں نے اپنی ٹیم کے ساتھ دور دراز کے گوٹھوں میں جا کر سیکڑوں مریضوں کا علاج کیا۔ الخدمت کی امدادی سرگرمیاں دیکھ کر اکثر مخیر افراد جو سامان تقسیم کرنے متاثرہ علاقے میں آتے، از خود سارا سامان ہمارے کیمپوں کے حوالے کر تے اور واپس چلے جاتے۔ اسلام آباد کی ایک این جی او نے امدادی سرگرمیوں میں ہم سے تعاون طلب کیا اور فی خاندان سامان تقسیم کرنے کی تفصیلات بھی دیں۔ ان کی خواہش کے مطابق تمام سامان کی خریداری اور پیکنگ کراچی میں کروا کر 6 بڑے ٹرکوں کے ذریعے متاثرہ علاقوں میں بھجوایا گیا۔ اس دوران الخدمت کراچی کے دفتر اور اضلاع کے دفاتر میں رات گئے تک کام ہوتا رہا۔ الخدمت کے منیجر نصر اللہ شیخ اور ان کی ٹیم نے شب و روز محنت کی۔ بدین کے مختلف گوٹھوں میں ممتاز جتوئی نے امدادی سامان کی نگرانی کا فریضہ بحسن وخوبی نبھایا اور درجنوں گوٹھوں میں کئی ہزار متاثرین کو امدادی سامان پہنچایا گیا۔

فروری 2000ء میں بلوچستان کے ضلع خضدار کی تحصیل ارنجی میں خشک سالی کے باعث سو سے زیادہ افراد جاں بحق ہو گئے۔ نوید بلوچ نامی نوجوان نے خط لکھ کر حالات سے آگاہ کیا۔ صوبائی نظم نے بھی ان معلومات کی تصدیق کی اور تعاون کی درخواست کی۔ سیکرٹری الخدمت سید حفیظ اللہ اور عبدالرشید بیگ صاحب سے مشورہ کیا اور 21 فروری کو عبدالحلیم بلوچ کی سربراہی میں ایک تین رکنی وفد کو جائزہ لینے کے لیے روانہ کر دیا۔ کراچی میں امداد کی اپیل پر لوگوں نے حسبِ سابق بھرپور تعاون کیا۔ حلقہ خواتین نے بھی

امدادی سامان کے لیے اچھی مہم چلائی۔ عبدالرشید بیگ 9 کارکنان کو ساتھ لے کر آرنجی روانہ ہو گئے۔ وڈھ میں ان کی ملاقات عبدالحلیم بلوچ، محمد ہاشم مینگل اور ضلع خضدار کے قیم علی اکبر سے ہوئی۔ یہ طے پایا کہ مرکزی امدادی کیمپ وڈھ میں لگایا جائے اور راشن و دیگر امدادی سامان کی خریداری خضدار کے بازار سے کی جائے۔ تحصیل آرنجی ضلع خضدار کا وسیع علاقہ ہے۔ اس کی حدود ایک جانب ضلع دادو، جبکہ دوسری جانب ضلع لسبیلہ سے ملتی ہیں۔ وڈھ سے آرنجی کے گوٹھوں تک دو، تین راستے جاتے ہیں جن کا فاصلہ 10 سے 90 کلومیٹر تک بنتا ہے۔ راستے پہاڑوں کے درمیان ہونے کی وجہ سے کچے پکے تھے۔ صرف آرنجی مسجد تک فور ویل ڈرائیو یا بڑے ٹائروں والے ٹرک ہی جا سکتے ہیں۔ امدادی سامان کی تقسیم کے لیے دو ٹیمیں بنائی گئیں، ایک عبدالرشید بیگ صاحب کی سربراہی میں مولانا ہاشم مینگل (وڈھ) اور عبدالستار ریکی (خضدار) پر مشتمل تھی۔ اس ٹیم نے کھوروی اور ملحقہ علاقوں کا دورہ کیا۔ یہاں پر تقریباً 22 گوٹھ تھے۔ بعض ایسے مقامات بھی تھے جہاں گاڑی نہیں جا سکتی تھی۔ سب سے زیادہ نقصان بھی یہیں پر ہوا تھا۔ دوران سفر مختلف افراد سے گفتگو میں ٹیم کے اراکین اموات کی تفصیل بھی معلوم کرتے تھے۔ پتا چلا کہ وہ علاقے جہاں آمد و رفت صرف اونٹوں اور گدھوں سے ہوتی ہے وہاں 127 کے قریب اموات ہوئی تھیں۔ دوسری ٹیم عبدالحلیم بلوچ کی قیادت میں مسجد آرنجی کی طرف روانہ کی گئی۔ راستے میں آنے والے گوٹھوں کا سروے کرنے کے بعد انہیں رات تک واپس آنا تھا، لیکن راستے اس قدر خراب تھے کہ یہ حضرات اگلے دن دوپہر میں واپس پہنچ سکے۔ صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد دو ذیلی کیمپ بنائے گئے۔ ایک کھوروی میں، اس کے ناظم عبدالستار ریکی تھے۔ جب کہ دوسرا کیمپ مسجد آرنجی کے پاس لگایا گیا۔ اس کے انچارج عبدالحلیم بلوچ تھے۔ اول الذکر کیمپ سے 2778 متاثرین کو، اور مسجد آرنجی والے کیمپ سے 3765 متاثرین کو امداد دی گئی۔ متاثرہ علاقوں میں قدرتی آفات اور

دیگر سانحوں میں اللہ رب العزت نے جہاں ایک طرف امدادی سرگرمیوں کو بھرپور طور پر انجام دینے کی توفیق دی، وہیں اس بات کا بھی واضح مشاہدہ ہوا کہ شہروں کی نسبت پسماندہ دیہی علاقوں کے لوگوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا۔ رات دن اپنی خدمت لیئے، اپنی ذاتی یا خاندانی حیثیت اور خوش آئند نعروں کی مدد سے ووٹ حاصل کرنے کے بعد ان علاقوں کے نمائندے عوام کا حال پوچھنا تک گوارا نہیں کرتے، اور عوام کو اپنی رعایا سمجھتے ہیں بلکہ اس سے بھی کمتر!

ٹھٹھہ کے سیلاب متاثرین کے لیے لگائے گئے کیمپ میں
زبیر منصوری اور عبدالرشید بیگ کے ہمراہ مقامی صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے

ٹھٹھہ کے مقام کیٹی بندر میں میڈیکل کیمپ لگایا گیا۔
ڈاکٹر محمد خالد سمیت کئی ڈاکٹروں نے شرکت کی

ٹھٹھہ اور بدین کے سیلاب متاثرین کے لیے
امدادی سامان کی روانگی

بلوچستان کے مختلف اضلاع میں بارشوں اور سیلاب سے متاثرہ لوگوں میں راشن تقسیم کیا گیا

صحرائے تھر - دعوت وخدمت کا استعارہ

ستمبر 1997ء میں ایک روز مولانا جان محمد عباسی صاحب نے مجھ سے کہا کہ ”کسی صاحب نے تھر پارکر میں کنویں کھدوانے کے لیے ستر ہزار روپے دیے ہیں۔ کئی مہینے ہو گئے ہیں لیکن میں مصروفیات کی وجہ سے اب تک یہ کام نہیں کروا پایا ہوں۔ اگر ممکن ہو تو آپ کروا دیں۔“

عباسی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ایک زمانے میں تھر پارکر میں جماعت اسلامی کو منظم کرنے کے لیے بہت محنت کی گئی تھی۔ بدین کے رہنے والے درویش صفت رکن جماعت یوسف آفندی صاحب نے تھر کے مختلف علاقوں مٹھی، ڈیپلو اور چھاچھرو میں دعوتی کام کے ساتھ ساتھ کچھ سیاسی کام بھی کیا تھا اور انتظامیہ سے بات چیت کر کے دینی مدارس کے قیام کے لیے پلاٹ بھی حاصل کیے تھے۔ 1970ء کے انتخابات میں جماعت نے انہیں قومی اسمبلی کے لیے امیدوار بھی نامزد کیا تھا۔ آفندی صاحب نے محدود وسائل اور بہت مختصر سی ٹیم کے ساتھ یہ الیکشن لڑا تھا اور ستر ہزار ووٹ حاصل کیے تھے۔

بدقسمتی سے آفندی صاحب کے بعد صحرائے تھر میں جماعت اسلامی کی تنظیم اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکی۔ تھر مسائل کا شکار علاقہ ہے اور بنیادی سہولتوں سے بالکل محروم ہے۔ ظاہر ہے کہ وہاں کام کرنا ہر فرد کے بس کی بات نہیں ہے۔

میں نے کہا کہ کبھی تھر پارکر جانے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن آپ نے یہ ذمہ داری دی ہے تو ان شاء اللہ وہاں جا کر خود سروے کروں گا اور جہاں زیادہ ضرورت ہوگی، ان گوٹھوں میں

یہ کنویں بنوا دوں گا۔ عباسی صاحب نے کچھ افراد کے نام بتائے اور کہا کہ یہ لوگ آپ کے ساتھ تھر جا سکتے ہیں۔ ان میں میرپور خاص کے عبدالرحیم خان صاحب اور جھڈو کے رکن جماعت عمر خان شامل تھے۔

کچھ دنوں کے بعد میں اپنے ڈرائیور میاں داد اور بیٹے عاصم اقبال کے ساتھ کراچی سے تھر پارکر روانہ ہوا۔ ہم نے راستے سے عبدالرحیم صاحب، عمر خان اور شبیر احمد خان کو بھی ساتھ لے لیا اور تھر کے مرکزی شہر مٹھی جا پہنچے۔

تھر کا پہلا دورہ تین روزہ تھا (23، 24 اور 25 اگست) اور اس کا سارا انتظام عمر خان نے کیا تھا۔ کار پر مٹھی سے آگے کا سفر ممکن نہیں تھا کیونکہ اس زمانے میں مٹھی سے کچھ فاصلے پر پکی سڑک ختم ہو جاتی تھی اور کچے راستوں پر کیکڑا (جنگِ عظیم کے دور کا فوجی ٹرک)، اونٹ یا جیپ سے ہی جایا جا سکتا تھا۔ عمر خان نے کرائے پر ایک جیپ حاصل کی اور صحرا میں ہمارے پہلے باقاعدہ سفر کا آغاز ہوا۔ ڈرائیور نے ٹائروں میں ہوا کم کی جس پر مجھے حیرت ہوئی تو اس نے کہا کہ "مولوی صاحب! ریت میں گاڑی ایسے ہی چلتی ہے"۔

کئی گھنٹوں کی مسافت طے کر کے ہندوستان کے بارڈر سے متصل ایک گوٹھ پہنچے۔ مون سون کا موسم تھا، صبح کے وقت آسمان پر بادل نہیں تھے اور بظاہر بارش کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن دوپہر کے وقت اچانک آسمان پر سیاہ بادل چاروں طرف سے چھانے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

ہم نے کچھ مقامی لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ گوٹھ کی آبادی اور پینے کے پانی کی دستیابی کی صورتِ حال معلوم کی اور اُن سے کنواں بنانے کا وعدہ کر کے مٹھی واپسی کا سفر شروع کیا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اگر بارش زیادہ ہو گئی تو آپ واپس نہیں جا سکیں گے کیونکہ راستے میں جگہ جگہ بہت پانی کھڑا ہو جائے گا۔ بہر حال چند گھنٹوں کے بعد دوبارہ مٹھی پہنچ گئے۔ جیپ پرانے ماڈل کی تھی اور مکمل طور پر بند نہیں تھی۔ سب ہی لوگوں کے کپڑے اور

جوتے بھیگ چکے تھے۔ مٹھی پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔ ہم لوگ اس شہر میں اجنبی تھے، اور وہاں کوئی گیسٹ ہاؤس یا رہائشی ہوٹل ہمارے علم کی حد تک نہیں تھا۔ کوئی ایسا فرد بھی نہیں تھا، جو ہمیں اپنے گھر ٹھہرا سکتا۔ ایک چھوٹی سی مسجد نظر آئی۔ ہم نے مغرب کی نماز ادا کی اور امام صاحب کو اپنی پریشانی بتائی۔ انہوں نے ہمارے قیام کے لیے ایک چھوٹے کمرے میں فرش پر بستر لگوا دیے اور رات کے کھانے کی فراخ دلانہ پیشکش کر ڈالی۔ سچ یہ ہے کہ سب ہی کو زوردار بھوک لگی ہوئی تھی۔ کسی نے بھی انکار نہیں کیا۔ مسجد سے ملحق مدرسے کے بچوں کے لیے جو دال روٹی پکی تھی، اسے صاف ستھرے برتنوں میں لا کر رکھ دیا گیا۔ شدید بھوک میں وہ دال روٹی ہمارے لیے لذیذ بریانی اور قورمے سے کسی طور کم نہیں تھی۔ سفر کی تھکاوٹ کی وجہ سے فرش پر بھی بڑی پرسکون اور گہری نیند آئی اور فجر کی اذان ہی سے آنکھ کھلی۔

تھر کے پہلے دورے سے واپسی پر میں نے وہاں کے مسائل کے حوالے سے ایک پریس کانفرنس کی اور لوگوں سے اپیل کی کہ صحرائے تھر میں کنویں کھدوانے کے لیے الخدمت ویلفیئر سوسائٹی کے ساتھ تعاون کریں۔

صحرائے تھر کا دوسرا دورہ 27 اکتوبر کو ہوا جس میں کراچی سے زبیر منصوری بھی میرے ہمراہ تھے۔ 26 اکتوبر کو تھٹہ میں جماعت کی ممبر سازی مہم کے حوالے سے پروگرامات میں شرکت کی اور 27 اکتوبر کی صبح مٹھی روانہ ہوئے۔ عبدالرحیم خان صاحب، عمر خان قائم خانی اور تھر کے مقامی فرد دریا خان میمو ساتھ تھے۔ اس دورے میں ہم نے ممبر سازی بھی کی، جس کے لیے عمر خان نے کچھ مقامی افراد کے ساتھ مل کر انتظامات کیے تھے اور شہر کے ایک مرکزی مقام پر اسٹال بھی لگوایا تھا۔ عمر خان نے جریدہ "ایشیا" میں اور زبیر منصوری نے "فرائیڈے اسپیشل" میں تھر کے مسائل پر مضامین لکھے۔ اس کے بعد تھر آمد و رفت کا مستقل سلسلہ شروع ہو گیا۔

کچھ عرصے کے بعد عمر خان نے اطلاع دی کہ تین گوٹھوں میں کنویں تیار ہو چکے ہیں

اوران کے افتتاح کے لیے آپ کو تھر آنا پڑے گا۔عمر خان کا فون آیا تو زبیر منصوری ادارہ نورحق میں میرے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔زبیر منصوری نے کہا کہ ڈاکٹر فیاض عالم کو ضرور ساتھ لے چلیں کیونکہ وہ گرین کریسنٹ ٹرسٹ، مسلم ایڈ برطانیہ اور راکنا ریلیف کے ساتھ بھی کام کرتے ہیں،لہٰذا مختلف منصوبوں کے لیے فنڈز کے حصول میں مدد دے سکتے ہیں۔

ڈاکٹر فیاض اس وقت متحدہ کے گڑھ عزیز آباد میں الطاف حسین کی رہائش گاہ 90 کے عقب کی گلیوں میں رہتے تھے۔جب میں علی الصبح میاں داد کے ساتھ ان کو لینے کے لیے ان کی گلی میں پہنچا تو بندوق بردار لڑکے گاڑی کے قریب آگئے۔جب انہوں مجھے دیکھا تو پہچان لیا اور سلام کر کے واپس چلے گئے۔ہم نے راستے سے زبیر منصوری کو لیا اور رنچھوڑ سے عمر خان کو لیتے ہوئے مٹھی پہنچ گئے۔

اس دوران عمر خان پنجھو اور رگھوں میں بھی کنوؤں پر کام شروع کروا چکے تھے، اور کچھ لوگوں کو اپنے ربط میں بھی رکھ چکے تھے۔ربط میں رکھنا جمعیت اور جماعت کی ایک خاص اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو جماعت کی دعوت دی جائے اور اس سے مستقل رابطہ رکھ کر نہ صرف یہ کہ قرآن وحدیث اور دیگر اسلامی کتب کا مطالعہ کروایا جائے بلکہ دعوتی و تنظیمی سرگرمیوں میں بھی شریک کروایا جائے، تاکہ مذکورہ فرد جماعت کے نظام تربیت سے گزر سکے اور اقامتِ دین کے نظریے کو اچھی طرح سمجھ سکے۔

نمازِ عصر کے بعد ہم ریت کے ایک ٹیلے پر بیٹھ گئے۔سب نے تھر پارکر میں دعوتی و فلاحی کاموں کے حوالے سے گفتگو کی۔ڈاکٹر فیاض نے کہا کہ وہ گرین کریسنٹ ٹرسٹ کے ٹرسٹیز میاں تنویر ملکوں، سعید اسماعیل، شمیم پاشا، عبدالغفار عمر، زاہد سعید اور رابر ارگلوں وغیرہ کو تھر کے دورے کے لیے قائل کرنے کی پوری کوشش کریں گے،جبکہ مسلم ایڈ اور راکنا والوں کو بھی پینے کے پانی کے منصوبوں میں معاونت کے لیے لکھیں گے۔اُس زمانے میں نوفل شاہ رخ ان کے ساتھ گرین کریسنٹ ٹرسٹ میں ہوا کرتے تھے اور رپورٹ رائٹنگ اور خط

وکتابت میں بے حد مہارت رکھتے تھے۔ کراچی جماعت کے شعبہ نشر و اشاعت میں انگریزی خبروں کے لیے شاہد شمسی صاحب انہیں بلایا کرتے تھے۔

ڈاکٹر فیاض نے کہا کہ اس صحرائی علاقے میں آپ یا ہم کب تک آتے جاتے رہیں گے؟ لازمی ہے کہ یہاں کوئی مستقل ٹھکانا بنایا جائے اور جس طرح عیسائی مشنریز نے دنیا کے مختلف علاقوں میں تعلیم اور صحت کے شعبوں کے ذریعے اپنے مذہب کو پھیلایا ہے اسی طرح ہم بھی ان دونوں شعبوں میں کام کے ذریعے یہاں نہ صرف فلاحی کام کریں بلکہ جماعت کے دعوتی کام کو بھی منظم کریں۔

اُن کی اس بات سے مجھ سمیت سب ہی نے اتفاق کیا، لیکن اصل مسئلہ مالی وسائل کا تھا۔ جسارت میں کنوؤں کے لیے جو اشتہار دیا گیا تھا، اس سے صرف چند کنوؤں کے لیے رقم آئی تھی۔ الخدمت ویلفیئر سوسائٹی کی آمدنی کا بنیادی ذریعہ قربانی کی کھالوں کی آمدنی تھی جو کراچی کے مختلف فلاحی منصوبوں پر خرچ ہوا کرتی تھی۔

تھرپارکر کے بارے میں کراچی کے عام آدمی کی معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں، اور یہی وجہ تھی کہ بہت کم لوگ اس طرف متوجہ ہو پائے تھے۔ یہ طے پایا کہ کراچی پہنچ کر زاہد سعید اور ابرار گلوں سے مٹھی میں اسکول کے قیام کے لیے میٹنگ کی جائے گی۔

اس دوران ڈاکٹر فیاض اور نوفل شاہ رخ نے مسلم ایڈ برطانیہ اور اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ کے ذمہ داران کو صحرائے تھر کے حالات بذریعہ ای میل لکھ کر بھیجے۔ کچھ لوگوں سے میں نے بھی بات کی، اس طرح کچھ ہی عرصے میں الخدمت کے بینک اکاؤنٹ میں اس مد میں اچھی خاصی رقم جمع ہوگئی۔ گرین کریسنٹ ٹرسٹ نے بھی راشن کی تقسیم اور کنویں بنوانے کے لیے معقول رقم کا عطیہ دیا۔

میں نے جماعت اسلامی کراچی کے نائب قیم اور اپنے دیرینہ رفیق عبدالرشید بیگ صاحب کو کنوؤں کے منصوبے کا نگراں بنا دیا، کیونکہ انہیں سماجی کاموں کا بہت تجربہ تھا اور وہ

ہر کام کے مالی معاملات کا حساب بھی بہت عمدہ طریقے سے رکھتے تھے۔ بیگ صاحب نے تھرپارکر آنا جانا شروع کر دیا اور کلوئی، ڈیپلو، مٹھی، اسلام کوٹ اور نگر پارکر میں بڑی تعداد میں کنویں بننے لگے۔

بیگ صاحب کنووں کی کھدائی میں کوٹھو والوں کو بھی شامل کیا کرتے تھے۔ سیمنٹ اور انجینئر وغیرہ خود فراہم کرتے، جبکہ کھدائی مقامی افراد کی ذمہ داری ہوا کرتی تھی۔ اس طرح بہت کم لاگت میں ایک کنواں تیار ہو جایا کرتا تھا۔ عمر کوٹ کے قریب تھر کا علاقہ چھاچھرو تھا، وہ بھی خاصا بڑا علاقہ تھا اور وہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس وقت تک ہمیں وہاں جماعت اسلامی کے کارکن اور ہمدرد نہیں مل سکے اور وہ علاقہ مٹھی سے بہت فاصلے پر بھی تھا، لہٰذا اس علاقے میں ہم پانی کے چند ایک منصوبے ہی بنا سکے۔

تھر کے تیسرے دورے کے بعد میں نے زاہد سعید اور ابرار گلوں سے ملاقات کی اور انہیں تھرپارکر کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر فیاض ادارے کے منتظم ہیں اور نئے اسکول کھولنے کے ذمہ دار بھی ہیں۔ جمعیت کے سابق ناظم صوبہ عظیم بلوچ بھی اُس دور میں گرین کریسنٹ ٹرسٹ سے وابستہ تھے اور اندرون سندھ کے علاقوں میں اسکول قائم کرنے کے ذمہ دار تھے۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ مٹھی میں ہلال پبلک اسکول کھولا جائے گا جس کے لیے عمارت کرائے پر حاصل کی جائے گی۔

زبیر منصوری نے جامعۃ العلوم الاسلامیہ، منصورہ ہالا سے فارغ التحصیل چار افراد کو مسجد قباء، گلبرگ بلایا (جماعت اسلامی صوبہ سندھ کے دفتر)۔ جب انہیں بتایا گیا کہ مٹھی جا کر رہنا ہے اور اسکول بھی چلانا ہے، تو دو افراد نے موسم کی سختی کی وجہ سے معذرت کر لی، جبکہ میر محمد بلیدی اور محمد صادق رضامند ہو گئے۔ مارچ 1999ء میں مٹھی میں ہلال پبلک اسکول قائم کیا گیا جس کے ایک کمرے میں جماعت اسلامی تھرپارکر کا پہلا دفتر بھی بنایا گیا۔ وہ مٹھی میں قائم ہونے والا دوسرا نجی اسکول تھا۔ 2000ء میں اسلام کوٹ میں دوسرا ہلال

فہرست پر جائیے

اسکول کھولا گیا۔ وہ اس چھوٹے لیکن اہم شہر کا پہلا نجی اسکول تھا۔

میر محمد بلیدی اور محمد صادق نے نہ صرف مٹھی شہر میں بلکہ آس پاس کے گوٹھوں میں بھی جماعت اسلامی کی دعوت پھیلانی شروع کردی۔ اور عمر خان و دیگر لوگوں کے ساتھ مل کر بڑی محنت اور لگن سے کام کرنے لگے۔ دونوں اسکولوں میں بچوں کی تعداد بھی کافی بڑھ گئی کیونکہ اُس دور میں ان دونوں شہروں میں معیاری اور سستی تعلیم کا تصور بھی محال تھا۔

اس دوران ڈاکٹر فیاض نے تھرپارکر میں الخدمت کے پانی کے منصوبوں کو زم زم پراجیکٹ کا نام دے دیا اور عبیداللہ کیہر اور نوفل شاہ رخ کے ساتھ مل کر ایک دستاویزی فلم بھی بناڈالی، جس کی وجہ سے کئی نئے معاونین نے صحرا میں پانی کے منصوبوں میں اپنا حصہ ڈالا۔

11 اور 12 ستمبر 1999ء کو مٹھی میں پیا، گرین کریسنٹ ٹرسٹ اور سوسائٹی فار دی پریوینشن اینڈ ریسٹوریشن آف وژن کے تعاون سے آئی کیمپ منعقد کیا گیا۔ اس کیمپ سے کئی ہزار افراد نے استفادہ کیا۔ کیمپ میں 254 مریضوں کے موتیا کے آپریشن کیے گئے جن میں سے 160 آپریشن فیکو سرجری کے ذریعے کیے گئے جو کہ اُس دور میں آنکھوں کے آپریشن کا جدید ترین طریقہ تھا۔ اگلے سال 10، 11 اور 12 نومبر کو انہی تنظیموں کی معاونت سے ایک بار پھر آئی کیمپ کا انعقاد کیا گیا اور کئی سو مریضوں کی آنکھوں کا بالکل مفت آپریشن کیا گیا۔ دونوں کیمپوں میں ڈاکٹر اسد عالم، ڈاکٹر ذکی الدین صابری، ڈاکٹر شایان شادمانی، ڈاکٹر راؤ محمد نعیم اور ڈاکٹر مسلم مرلطین نے شرکت کی۔

اپریل 2000ء کے آخر میں بلوچستان کے کچھ اضلاع کے ساتھ ساتھ دادو اور تھرپارکر میں زبردست قحط پڑ گیا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق سینکڑوں مویشی اور مور ہلاک ہو گئے جبکہ ہزاروں افراد کو شہری علاقوں کی طرف نقل مکانی کرنی پڑی۔

میں نے ادارہ نورحق میں ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا جس میں عبدالرشید بیگ، ڈاکٹر

فیاض عالم، ڈاکٹر تبسم جعفری، ڈاکٹر محمد خالد، عمر خان، زبیر منصوری، محمد یونس اور اشرف سموں شریک ہوئے۔ اجلاس میں طے کیا گیا کہ صحرائے تھر کے مختلف علاقوں میں مستحقین میں راشن تقسیم کیا جائے گا، جبکہ مختلف مقامات پر اسٹال لگا کر آٹا بھی بہت سستے داموں فروخت کیا جائے گا۔ موبائل میڈیکل کیمپس بھی منعقد کیے جائیں گے تاکہ لوگوں کو ان کے گھروں کے قریب علاج کی سہولت فراہم کی جاسکے۔

عبدالرشید بیگ صاحب نے عمر خان، یونس قائم خانی، میر محمد بلیدی اور محمد صادق کے ساتھ مل کر اس پوری مہم کو نہایت احسن انداز میں چلایا اور بہت ذمہ داری سے دور دراز علاقوں میں مستحقین کا سروے کروایا۔ راشن کی تقسیم میں لوگوں کی عزت نفس کا بہت خیال رکھا گیا اور پوری کوشش کی گئی کہ لوگوں کو لمبی لمبی قطاروں میں کھڑے ہونے کی زحمت نہ کرنی پڑے۔

میڈیکل کیمپس میں کراچی سے ڈاکٹر سلطان مصطفیٰ، ڈاکٹر تبسم جعفری، ڈاکٹر محمد خالد، ڈاکٹر ہمایوں فرخ، ڈاکٹر ذکی الدین صابری، ڈاکٹر سالم غیور اور ڈاکٹر احسن اللہ حسینی شریک ہوئے۔ ڈاکٹر فیاض اپنی اہلیہ ڈاکٹر صدیقہ اور اپنے دو چھوٹے بچوں کو بھی ساتھ لے آئے۔ مئی کے مہینے کی سخت ترین گرمی میں جب میں نے ڈاکٹر صدیقہ کو مٹھی میں دو چھوٹے بچوں کے ساتھ بس سے اترتے ہوئے دیکھا تو میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور دل سے دعا نکلی کہ اللہ ان سب کی کوششوں کو اپنے راستے میں قبول فرمالے، آمین

اس مہم کے دوران جماعت اسلامی کے مرکزی امیر محترم قاضی حسین احمد، امیر صوبہ اسداللہ بھٹو اور سابق رکن قومی اسمبلی مظفر ہاشمی نے بھی مٹھی کا دورہ کیا۔

قاضی صاحب نے کچھ لوگوں کو راشن دیا اور مٹھی میں ایک لائبریری کا افتتاح بھی کیا۔ اس کے بعد ہم سب اسلام کوٹ کی طرف روانہ ہوئے، جہاں پہنچ کر قاضی صاحب نے گندم کی تقسیم کے کام کا جائزہ لیا اور وہاں موجود لوگوں سے حالات معلوم کیے۔ اسداللہ بھٹو

صاحب اور عمر خان نگر پار کر چلے گئے۔

تھر کے مختلف گوٹھوں میں ہم نے العلم پراجیکٹ کا آغاز کیا اور چوبیس اسکول قائم کیے جن کی تعداد اب پچاس سے اوپر ہو چکی ہے۔ لوگوں کو باعزت روزگار کی فراہمی کے لیے بلاسود قرضوں کی ایک اسکیم بھی شروع کی گئی جس کے تحت کئی سو لوگوں کو بیس سے پچاس ہزار روپے کے قرضے دیے گئے۔ ان قرضوں کی واپسی کی شرح 70 فیصد سے بھی زیادہ رہی۔

میر محمد بلیدی اور محمد صادق نے اپنے آبائی علاقوں کو خیر باد کہہ دیا اور اپنی فیملیز کے ساتھ مٹھی میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ سچ یہ ہے کہ اگر یہ دو افراد اس وقت مٹھی آ کر رہنے سے انکار کر دیتے تو صحرائے تھر میں جماعت اسلامی کی تنظیم کا قیام آسان نہ ہوتا۔

گرین کریسنٹ ٹرسٹ، مسلم ایڈ برطانیہ، ہیلپنگ ہینڈ امریکہ اور کراچی کے مخیر حضرات کے غیر معمولی تعاون کی وجہ سے الخدمت کراچی کے پاس 400 کنوؤں کی کھدائی کے لیے رقم جمع ہو گئی۔ عبدالرشید بیگ صاحب نے تجدو کے رکن جماعت اور سماجی کارکن یونس قائم خانی کو کنوؤں کے منصوبے کے لیے اپنا معاون بنا لیا اور سروے کے لیے کلوئی، ڈیپلو، مٹھی، اسلام کوٹ اور نگر پارکر میں مقامی افراد کو بھی شامل کر لیا۔ اس طرح فلاحی منصوبوں کے ساتھ ساتھ جماعت اسلامی کا دعوتی کام بھی ایسے علاقوں میں شروع ہو گیا جہاں کے لوگوں نے کبھی جماعت اسلامی کا نام تک نہیں سنا تھا۔

عبدالرشید بیگ صاحب نہ صرف یہ کہ بہت تجربہ کار اور مشنری جذبہ رکھنے والے سماجی کارکن تھے بلکہ وہ ایک بہت ہی مضبوط کردار کے نظریاتی تحریکی رہنما بھی تھے۔ ہر قسم کی مہمات کو منظم کرنے کی ان جیسی مہارت جماعت اسلامی کراچی کے کسی دوسرے فرد میں نظر نہیں آئی تھی۔

تھر میں الخدمت کی سرگرمیاں

تھرپارکر کے ایک گاؤں میں کنویں کا افتتاح کیا
عمر خان قائم خانی اور یونس قائم خانی بھی موجود تھے۔

صحرائے تھر میں پینے کے پانی کی فراہمی کے منصوبے کو
زم زم پراجیکٹ کا نام دیا گیا

گرین کریسنٹ ٹرسٹ کے روح رواں زاہد سعید

کیکڑا - جنگ عظیم کے دور کا ٹرک

مئی 2000ء مٹھی - کراچی سے آنے والے ڈاکٹروں کی ٹیم

دیرینہ رفیق اور کراچی جماعت کے نائب قیم
عبدالرشید بیگ کے ساتھ تھر کے ایک گاؤں میں

تھر کے ایک دور دراز گوٹھ میں الخدمت کی تحت منعقدہ
میڈیکل کیمپ کا ایک منظر

صلہ شہید کیا ہے، تب وتاب جاودانہ

جب کبھی یہ سوچتا ہوں کہ وہ کون سے سفاک لوگ تھے جنہوں نے کراچی کے ایک نہایت، مہذب، شفیق، مہربان اور انسان دوست مسیحا حکیم محمد سعید کے سینے پر گولیاں مار کر انہیں شہید کر دیا تو ذہن و دل ماؤف ہوجاتے ہیں۔ 17 اکتوبر 1998ء کو جب یہ روح فرسا خبر ملی کہ ہمدرد وقف کے بانی اور سابق گورنر سندھ حکیم محمد سعید کو ان کے مطب کے باہر قتل کر دیا گیا ہے تو آنکھیں آنسوؤں سے تر ہوگئیں۔ ایسا لگا کہ خاندان کے کسی بہت ہی اہم فرد کا انتقال ہوگیا ہے۔ سچ بھی یہی ہے کہ حکیم صاحب کراچی کے ہر خاندان کا حصہ تھے۔ لاکھوں بچوں نے ان کے رسالے نونہال سے استفادہ کیا تھا۔ ان کے ادارے کا مشہور زمانہ شربت روح افزا حقیقی معنوں میں مشروب مشرق بن چکا تھا۔ حکیم صاحب کی علم دوستی کا سب سے بڑا ثبوت مدینۃ الحکمت ہے جہاں ایک بہت بڑی لائبریری، یونی ورسٹی، کالج، اسکول، میڈیکل کالج اور ایسٹرن میڈیسن کالج جیسے اہم ادارے قائم ہیں۔

حکیم صاحب کی رہائش جماعت اسلامی کراچی کے دفتر ادارہ نورحق کے پڑوس میں تھی اور وہ جماعت اسلامی کے بارے میں بہت مثبت رائے رکھتے تھے۔ حکیم سعید شہید نے بھی ہندوستان سے ہجرت کی تھی اور بہت چھوٹی سی دکان میں مطب قائم کر کے لوگوں کی بے لوث خدمت کے سفر کا آغاز کیا تھا جو ان کی زندگی ہی میں ایک شجر سایہ دار بن چکا تھا۔ کراچی کی پرتشدد لسانی سیاست نے اس فرشتہ صفت مسیحا کو بھی نہیں بخشا!

19 جولائی 1999ء کی رات جماعت اسلامی ضلع بن قاسم کے امیر مرزا لقمان بیگ

لانڈھی چراغ ہوٹل پر جماعت کے کارکن محمد نصیر صاحب کی رہائش گاہ پر منعقدہ ایک میٹنگ سے فارغ ہو کر گھر آرہے تھے، گھر سے بمشکل 100 میٹر کے فاصلے پر انہیں پچھ نامعلوم لوگوں نے آواز دے کر روکا۔ بیگ صاحب رک گئے۔ ان لوگوں نے قریب آکر فائرنگ کردی اور فرار ہوگئے۔ بیگ صاحب کو شدید زخمی حالت میں آغا خان ہسپتال پہنچایا گیا لیکن وہ جانبر نہ ہوسکے۔ انہیں گیارہ گولیاں لگی تھیں۔ اس اندوہناک سانحے کی اطلاع ملنے پر میں سب سے پہلے آغا خان ہسپتال پہنچا اور پھر میت کے ساتھ ان کے گھر۔ اگلی رات تک ان کے گھر رہا اور ضلعی شوریٰ کی ہنگامی میٹنگ بھی کی۔ کسی کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ لقمان بیگ جیسے شریف النفس اور خادم خلق کو کون قتل کرسکتا ہے؟ اور اس قتل کے محرکات کیا ہوسکتے ہیں؟ شہادت کے وقت لقمان بیگ کی عمر محض 42 سال تھی اور ان کے تینوں بیٹے نعمان، فرحان اور ثوبان بہت چھوٹی عمروں کے تھے۔ جنہیں اپنے والد کے سایہ عاطفت سے محروم کردیا گیا تھا۔

مرزا لقمان بیگ شہید کے قاتلوں نے سمجھا ہوگا کہ ان کی شہادت سے لانڈھی کورنگی اور دیگر علاقوں میں جماعت اسلامی کی تنظیم کمزور پڑ جائے گی اور کارکنان خوف میں مبتلا ہوکر گھر بیٹھ جائیں گے لیکن یہ محض ان کی خام خیالی تھی۔ لقمان بیگ کی شہادت نے ضلع بن قاسم کے ارکان و کارکنان کے جذبوں کو مہمیز دی اور جماعت کا تنظیمی و دعوتی کام بھرپور انداز میں آگے بڑھتا رہا۔ لقمان بیگ کے بچے اسلامی جمعیت طلبہ سے وابستہ ہوئے اور اہلیہ بھی جماعت میں زیادہ متحرک ہوگئیں۔ یہاں تک کہ 2001ء کے بلدیاتی انتخابات میں ہماری اس بلند حوصلہ بہن رفعت لقمان بیگ نے اپنے علاقے خواجہ اجمیر کالونی یوسی 7، لانڈھی ٹاؤن سے کونسلر کا الیکشن لڑا اور منتخب ہوکر اگلے چار سالوں تک اس علاقے کی خواتین اور بچوں کی خدمت کی۔

دو نئے فلاحی ہسپتالوں کا اضافہ

جون 2000ء کا واقعہ ہے، ایک روز میں ادارہ نورِ حق سے اپنے گھر ناظم آباد جا رہا تھا۔ میاں داد گاڑی چلا رہے تھے اور میرے ساتھ پچھلی سیٹ پر ڈاکٹر فیاض بیٹھے ہوئے تھے۔ ناظم آباد سے گزرتے ہوئے انہوں نے ایک عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ خان صاحب! الخدمت کے لیے یہ ہسپتال خرید لیں۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ اس ہسپتال کی مالکن ڈاکٹر زینت نے ان سے کہا ہے کہ پارٹنر شپ میں یہ ہسپتال چلائیں۔ ڈاکٹر فیاض کی اہلیہ ڈاکٹر صدیقہ 1996ء سے اس ہسپتال میں ڈلیوریز کرواتی تھیں، کیونکہ الخدمت ہسپتال اورنگی میں کئی سال تک لیبر روم اور آپریشن تھیٹرز کی سہولت موجود نہیں تھی۔

ہمارے رکن جماعت محمد صدیق صاحب اس ہسپتال کے انتظامی پارٹنر تھے۔ ان ہی کے تعاون اور ڈاکٹر فیاض کی کوششوں کی وجہ سے اس ہسپتال میں الخدمت نے ڈینٹل اور آئی کلینک قائم کی تھی۔ میں نے ڈاکٹر فیاض سے کہا کہ جماعت میں اس طرح چلتے پھرتے اور اچانک فیصلے نہیں ہوا کرتے۔ مجھے شوریٰ کو اعتماد میں لینا ہوگا۔ آپ ایک پریزنٹیشن بنائیں۔

اُس وقت تک ڈاکٹر تبسم جعفری الخدمت کی ٹیم میں بطور ڈپٹی جنرل سیکریٹری شامل ہو چکے تھے۔ اس دوران ایک واقعہ یہ ہوا کہ اسی محلے میں رہائش پذیر ہمارے رکن جماعت ڈاکٹر عظیم الدین کو معروف صنعت کار ایس ایم منیر کے چھوٹے بھائی ایس ایم

جاوید نے کچھ رقم بطور عطیہ دینے کی بات کی۔ ڈاکٹر عظیم لیاقت نیشنل ہسپتال کے ریڈیالوجی کے شعبے سے وابستہ تھے۔ شاید پانچ لاکھ روپے کی رقم تھی۔ ڈاکٹر عظیم نے یہ بات ڈاکٹر تبسم جعفری کو بتائی۔ طے یہ پایا کہ مسلم ایڈ سے رابطہ کر کے مزید رقم جمع کی جائے اور ناظم آباد ہسپتال میں الخدمت کا پہلا ڈائگنوسٹک سینٹر قائم کیا جائے۔ کچھ عرصے کے بعد کلر ڈاپلر مشین خریدی گئی جس کے لیے مسلم ایڈ نے اس وقت ایک خطیر رقم کا عطیہ دیا۔

کراچی شوریٰ کا خصوصی اجلاس بلایا گیا جس میں ڈاکٹر فیاض نے ہسپتال کی خریداری کے اغراض و مقاصد بیان کیے اور اس کی فزی بلیٹی اراکین کے سامنے رکھی۔ صرف ایک رکن نے اس تجویز کی مخالفت کی جبکہ غالب اکثریت نے اسے مفید منصوبہ قرار دیا۔ ہسپتال کو چند لاکھ روپے ایڈوانس اور بقیہ رقم آسان اقساط میں دینے کی صورت میں خریدنے کی اجازت دے دی گئی۔

16 ستمبر 2000ء کو الخدمت ہسپتال ناظم آباد کے باقاعدہ افتتاح کی ایک سادہ اور پُروقار تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اسی روز ہسپتال میں کلر ڈاپلر مشین کا بھی افتتاح کیا گیا۔ اس تقریب میں ایس ایم منیر، ایس ایم جاوید اور پاکستان بزنس فورم کے چیئرمین میاں تنویر مگوں بھی شریک تھے۔

2001ء کے اوائل میں ضلع بن قاسم کے امیر اور سابق رکن صوبائی اسمبلی اسلم مجاہد کورنگی میں الخدمت کلینک کے قیام کی تجویز لے کر آئے۔ انہوں نے بتایا کہ کورنگی میں اچھی لوکیشن پر 80 گز کا پلاٹ مناسب قیمت پر مل رہا ہے۔ وہ خرید کر اس میں الخدمت کے تحت کلینک کھولا جا سکتا ہے۔

الخدمت کمیٹی فیصلہ کر چکی تھی کہ چھوٹی کلینکس کے بجائے ضلع کی سطح پر ہسپتال بنائے جائیں گے، کیونکہ کلینکس کی سہولت تو عوام کو کراچی کے ہر علاقے میں مل جاتی ہے۔ اسلم مجاہد کو یہ بات بتائی گئی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ کچھ ہی ہفتوں کے بعد 80 گز کے تین پلاٹ خرید کر

میڈیکل سینٹر کی تعمیر کا آغاز کر دیا گیا۔ تعمیراتی کام کے آغاز کے موقع 4 مارچ 2001ء کو ایک پُروقار تقریب منعقد کی گئی جس سے ڈاکٹر فیاض عالم، اسلم مجاہد، سید حفیظ اللہ، راقم اور پروفیسر غفور احمد نے خطاب کیا۔ اسلم مجاہد کے ایک صنعت کار دوست عبدالجبار گاجیانی نے اس موقع پر اس منصوبے کے لیے ایک خطیر رقم کا چیک پیش کیا۔ پیما کے فعال رکن ڈاکٹر راؤ محمد نعیم کو میڈیکل سینٹر کا منتظم مقرر کیا گیا۔

ستمبر 2000 - الخدمت ویلفیئر سوسائٹی نے
ناظم آباد ہسپتال کو خرید لیا

پیما سندھ کے صدر اور الخدمت کے ڈپٹی سیکریٹری
ڈاکٹر نسیم جعفری

1998 - ڈاکٹر اظہر پرویز نے ناظم آباد ہسپتال میں
الخدمت آئی کیئر سینٹر کا آغاز کیا

1997 - ناظم آباد ہسپتال میں ڈاکٹر کلیم خان نے
الخدمت کی پہلی ڈینٹل کلینک کا آغاز کیا

پیما کے رکن ڈاکٹر راؤ محمد نعیم
الخدمت میڈیکل سینٹر کورنگی کے انچارج
مقرر کیے گئے

مارچ 2001 - کورنگی میں الخدمت میڈیکل سینٹر قائم کیا گیا

مقامی حکومتوں کا نیا نظام

جولائی 1999ء میں کارگل جنگ کے اختتام تک وزیرِ اعظم نواز شریف اور فوجی قیادت کے تعلقات کشیدہ ہو چکے تھے۔ اس کے نتیجے میں جو کچھ بھی ہوا، وہ اب تاریخ کا حصہ ہے۔

بہر حال 12 اکتوبر 1999ء کو ایک بار پھر جمہوریت کی بساط لپیٹ دی گئی۔ نواز شریف نے جس جنرل کو سینئرز پر فوقیت دے کر آرمی چیف بنایا تھا یعنی پرویز مشرف، انہوں نے ایک واقعے کو بنیاد بناتے ہوئے تختہ الٹ دیا اور اقتدار سنبھال لیا۔ منتخب وزیرِ اعظم اور ان کے کئی قریبی ساتھیوں کو قید کر دیا گیا۔ ہر فوجی حکمراں کی طرح جنرل پرویز مشرف نے بھی قوم سے خطاب میں حالات کے سدھار کے کئی دعوے اور وعدے کیے، اور حالات کی خرابی کا ذمہ دار سویلین حکومت کو ٹھیرایا۔

23 مارچ 2000ء کو مقامی حکومتوں کے "ڈسٹرکٹ اینڈ لوکل گورنمنٹ" کے نظام کا اعلان کیا گیا۔ اس نظام کے فوائد بیان کرتے ہوئے پرویز مشرف نے کہا کہ نچلی سطح پر اختیارات اور ذمہ داریوں کو منتقل اور عوام کو سستا اور فوری انصاف فراہم کر کے عام لوگوں میں قومی امور میں شراکت کا احساس پیدا کیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی اعلان کر دیا گیا کہ مقامی حکومتوں کے انتخابات دسمبر 2000ء میں مرحلہ وار شروع ہوں گے اور 14 اگست 2001ء تک تمام مراحل کو مکمل کر لیا جائے گا۔ یہ انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر ہوں گے۔ ووٹ ڈالنے کے لیے عمر کی حد 21 سال سے کم کر کے 18 سال کر دی گئی۔

یہ اطلاعات بھی سامنے آئیں کہ قومی مالیاتی کمیشن کی طرح چاروں صوبوں میں صوبائی مالیاتی کمیشن بنائے جائیں گے جو این ایف سی کی طرح اپنے ایوارڈز دیں گے۔ مقامی حکومتوں کے نظام کا خاکہ بنانے اور اسے متعارف کروانے میں ''قومی تعمیر نو بیورو'' کے چیئرمین لیفٹیننٹ جنرل (ر) سید تنویر حسین نقوی نے اہم کردار ادا کیا۔ 23 مارچ کو نئے نظام کو متعارف کراتے وقت انہوں نے پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ ضلعی حکومتیں مالی معاملات میں مکمل طور پر خودمختار ہوں گی۔

مقامی حکومتوں کے اعلان سے ملکی منظرنامے میں ایک بھونچال سا آگیا۔ ایم کیو ایم کی رابطہ کمیٹی کے کنوینر آفتاب شیخ (سابق میئر حیدرآباد) نے ضلعی حکومتوں کے منصوبے کو سندھ کے شہری علاقوں کے خلاف سازش قرار دیا۔

اتحاد برائے بحالی جمہوریت (ARD) نے بھی نئے بلدیاتی نظام کی مخالفت کی۔ اتحاد کے چیئرمین سینئر سیاست دان نوابزادہ نصراللہ خان نے کراچی میں ایک اجلاس کے بعد میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ نئے نظام کے تحت ایک طرف اختیارات کی تقسیم کی بات کی جارہی ہے جبکہ دوسری طرف کراچی میں اختیارات کو مرکزی تحویل میں دینے کے لیے پانچوں اضلاع ختم کرکے ایک ڈویژن کی سطح پر سٹی گورنمنٹ کے قیام کی باتیں کی جارہی ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو کراچی کو دیہی علاقوں سے علیحدہ کرنے کا تصور پیدا ہوگا۔ یہ عمل سندھ کو تقسیم کرنے اور ملک کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہوگا۔ اس اجلاس میں جاوید ہاشمی، اسفندیار ولی، امین فہیم اور دیگر سیاسی رہنما بھی شریک تھے۔

جماعت اسلامی نے بحث مباحثے اور مختلف طبقۂ فکر کے لوگوں سے مشاورت کے بعد اس نظام کو قبول کرکے بلدیاتی انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔

1979ء اور 1983ء میں جماعت اسلامی نے کراچی کے بلدیاتی انتخابات میں اخوت گروپ کے نام سے حصہ لیا تھا، لیکن اس مرتبہ بعض احباب نے رائے دی کہ خدمت

خلق کے میدان میں درجنوں اداروں اور بھرپور سرگرمیوں کی وجہ سے لوگ جماعت کو ''خدمت'' کرنے والی پارٹی سمجھتے ہیں۔ کیونکہ جماعت نے خدمتِ خلق کے شعبے کو اوّل روز سے سیاست سے الگ رکھا ہے اور الخدمت کو ملنے والا ایک روپیہ بھی کبھی تنظیمی یا سیاسی کاموں پر خرچ نہیں کیا گیا، لیکن ہم الخدمت گروپ کے نام سے حصہ لے کر عوام کو یہ پیغام ضرور دے سکتے ہیں کہ بلدیاتی الیکشن کا مقصد شہر کے لوگوں کی خدمت ہے جو کہ جماعت اسلامی بغیر حکومتی وسائل کے بھی کرتی چلی آئی ہے بات میں وزن تھا، اس لیے اکثریت متفق ہوگئی۔

کراچی کو نئے نظام کے تحت سٹی ڈسٹرکٹ قرار دیا گیا تھا مزید تقسیم یہ تھی کہ 178 یونین کونسلز اور 18 ٹاؤن بنائے گئے تھے۔ ایک یونین کونسل میں ناظم اور نائب ناظم سمیت کُل 21 نمائندوں کا چناؤ ہوتا تھا۔ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ جماعت اسلامی میں کوئی بھی فرد کسی تنظیمی یا عوامی عہدے کا امیدوار نہیں ہوتا، بلکہ کسی بھی منصب کی خواہش رکھنے والے فرد کو برا یا غیر تربیت یافتہ سمجھا جاتا ہے۔ بلدیاتی انتخابات کے ہر ہر مرحلے پر اس بات کا اہتمام کیا گیا کہ ارکان و کارکنان کی اکثریتی رائے سے امیدواروں کے نام فائنل کیے جائیں۔

کراچی میں 2 جولائی کو انتخابات کا پہلا معرکہ سجا۔ اس دن یونین کونسل کی سطح پر ووٹ ڈالے گئے۔ الخدمت گروپ یعنی جماعت اسلامی کے نمائندوں نے 65 سے زیادہ یونین کونسلوں میں اکثریت حاصل کر لی، جبکہ پورے شہر میں بڑی تعداد میں کونسلر بھی منتخب ہوئے۔ متحدہ کے عروج کے بعد کسی بھی انتخابی معرکے میں یہ جماعت اسلامی کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ اس کامیابی میں اسلامی جمعیت طلبہ اور جماعت اسلامی کے درجنوں شہداء کا خون بھی شامل تھا، جنہوں نے کراچی میں الطاف حسین کی فسطائی طرزِ سیاست اور دہشت گردی کے سامنے مزاحمت کی تھی۔ 4 جولائی کو ادارہ نورحق سے متصل شہداء گراؤنڈ

میں بعد نمازِ مغرب نمازِ شکرانہ کا اہتمام کیا گیا۔

نئے قانون کے تحت یہ لازمی تھا کہ ٹاؤن اور سٹی کی سطح پر ناظم اور نائب ناظم کے پینل کو پچاس فیصد ووٹ ملیں ورنہ انتخاب کالعدم قرار دیا جا سکتا تھا۔ ابھی سٹی ناظم کے نام کا فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ مختلف سیاسی رہنما ادارہ نور حق آنے لگے، کیونکہ کوئی بھی پارٹی تن تنہا اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ سٹی ناظم اور نائب ناظم کا پینل منتخب کروا سکے۔ الخدمت گروپ سب سے بڑا گروپ تھا لیکن ہمیں بھی کسی کے ساتھ اتحاد کی ضرورت تھی۔ اگلے چند دن بے حد مصروفیت میں گزرے۔ مسلم لیگ (ن) کے ممنون حسین، جمشید احمد خان اور طارق خان ملاقات کے لیے آئے، حاجی حنیف طیب اور نصرت مرزا نے ملاقات کی۔ جمعیت علمائے پاکستان کے محمد احمد صدیقی بھی اپنے وفد کے ساتھ تشریف لائے۔ اس کے بعد مسلم لیگ ہم خیال کے رہنما اور سابق رکن قومی اسمبلی کیپٹن حلیم صدیقی نے مجھ سے ون ٹو ون ملاقات کی اور اپنے گروپ کے ووٹوں کی تعداد بتا کر درخواست کی کہ ہم ان کے گروپ سے نائب ناظم لے لیں، وہ سٹی ناظم کے لیے ہمارے امیدوار کی حمایت کریں گے، بلکہ ناظم اور نائب ناظم کا پینل تو مشترکہ ہوتا تھا۔ نظم کراچی اور امرائے اضلاع نے صورتِ حال پر تفصیلی غور و خوض کے بعد اس آپشن کو بہتر محسوس کیا۔ ہم نے ان سے نائب ناظم کے امیدوار کا نام مانگا۔ انہوں نے فاروق اعوان کا نام پیش کیا۔ وہ ملاقات کے لیے ادارہ نور حق آئے لیکن ان کی تعلیمی اسناد میں کچھ مسئلہ تھا جس کی وجہ سے ان کا نام واپس لے لیا گیا۔

پھر چودھری شجاعت حسین کا فون آیا۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ساتھیوں کی رائے علیم عادل شیخ کے بارے میں ہے۔ اس نام پر ہمارے کچھ لوگوں کو تحفظات تھے، لہٰذا یہ نام بھی مسترد ہو گیا۔ تیسرا نام طارق حسن کا پیش کیا گیا۔ طارق حسن ملاقات کے لیے آئے تو سب نے ان کے بارے میں اچھی رائے قائم کی۔ ان سے کہا گیا کہ اپنی اصل تعلیمی اسناد کے ساتھ آئیں، تو بغیر کسی تاخیر کے لے آئے۔ کینٹ اسٹیشن پر واقع ایک ہوٹل ان

کی آمدنی کا ذریعہ تھا۔ میدان سیاست میں نوآموز ہونے کے باوجود پوری انتخابی مہم میں دل جمعی کے ساتھ شامل رہے۔

2 اگست کو سٹی اور ٹاؤن ناظمین کے انتخاب کے لیے پولنگ ہونی تھی۔ وقت کم رہ گیا تھا۔ جماعت اسلامی کراچی کی شوریٰ نے سٹی ناظم کے لیے چار افراد کے نام مرکز بھیجے تاکہ امیر جماعت ان میں سے ایک نام کی منظوری دے دیں۔ کچھ دن کے بعد قاضی حسین احمد صاحب کا خط موصول ہوا جس میں ہدایت کی گئی تھی کہ میں سٹی ناظم کا الیکشن لڑوں۔ میں نے قاضی صاحب کو فون کیا اور معذرت کرتے ہوئے کہا کہ کراچی جماعت میں کئی جوان العمر اور باصلاحیت افراد موجود ہیں۔ مگر قاضی صاحب کا اصرار تھا کہ سٹی ناظم کے امیدوار آپ ہی ہوں گے۔ انتخابی مہم شروع ہونے سے قبل کراچی کی امارت سے استعفیٰ دے دیا۔ 14 جولائی کو ڈاکٹر معراج الہدیٰ صدیقی نے جماعت اسلامی کراچی کے عبوری امیر کا حلف اٹھایا۔ ڈاکٹر معراج اس سے قبل ضلع وسطی کے امیر تھے۔ بلدیاتی الیکشن میں الخدمت گروپ کے سب سے زیادہ یوسی ناظمین اور کونسلر بھی ضلع وسطی ہی سے منتخب ہوئے تھے۔

انتخاب کے دن سے ایک روز پہلے تک منتخب ناظمین اور کونسلرز سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ پیپلز پارٹی جمہوری پینل کے نام سے میدان میں تھی، اس کے سٹی ناظم کے امیدوار پارٹی کے سیکریٹری اطلاعات اور سابق سینیٹر تاج حیدر تھے۔ جبکہ دیگر امیدواروں میں غریب نواز گروپ کے حاجی حنیف طیب، الخادم گروپ کے صدیق راٹھور اور وطن پرست گروپ کے مولانا احترام الحق شامل تھے۔ لیکن اصل مقابلہ الخدمت اور جمہوری گروپ کے امیدواروں کے درمیان ہی تھا۔

2 اگست کی صبح نو بجے پولنگ کا عمل شروع ہوگیا۔ دن بھر مختلف کیمپوں پر بھاگ دوڑ لگی رہی، مختصر وقت میں کراچی کے تمام پولنگ کیمپس کا دورہ کرنا، شکایات کا بروقت تدارک کروانا... انہی مصروفیات میں دن گزر گیا۔ شام کو نتائج آئے تو کچھ ٹاؤن ناظمین تو

واضح اکثریت سے کامیاب ہوگئے اور باقی ناظمین پچاس فیصد اکثریت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے دوسرے راؤنڈ میں چلے گئے۔

الخدمت گروپ کی طرف سے عبدالوہاب گلشن اقبال ٹاؤن، فاروق نعمت اللہ گلبرگ ٹاؤن، فصیح الدین صدیقی نارتھ ناظم آباد ٹاؤن، شفیق الرحمٰن عثمانی نارتھ کراچی ٹاؤن، ڈاکٹر پرویز محمود لیاقت آباد ٹاؤن، احمد قاسم پاریکھ جمشید ٹاؤن، اعظم علی ملیر ٹاؤن محمد شاہد لانڈھی ٹاؤن اور محمد جمیل خان کورنگی ٹاؤن کے ناظم منتخب ہوئے، جبکہ شاہ فیصل ٹاؤن میں اسلام اللہ صدیقی نائب ٹاؤن ناظم منتخب ہوئے۔

سٹی ناظم اور نائب ناظم کے لیے کاسٹ ہونے والے 3632 ووٹوں میں سے 1757 ہمارے پینل کو ملے جبکہ تاج حیدر کے پینل کو 1136 ووٹ ملے۔ غریب نواز پینل کے امیدواروں حاجی حنیف طیب اور بوستان علی ہوتی 512 ووٹ حاصل کر پائے۔
ہمارے پینل کو برتری حاصل ہوگئی تھی لیکن شرط چونکہ 50 فیصد ووٹ حاصل کرنے کی تھی اور وہ پوری نہیں ہوئی تھی، اس لیے 8 اگست کو دوسرا راؤنڈ ہوا۔ پہلے مرحلے میں ہماری واضح کامیابی کے بعد مزید لوگوں نے ہماری حمایت کا فیصلہ کرلیا۔ ان لوگوں میں مسلم لیگ (ن) کے رہنما طارق خان اور سابق صوبائی وزیر زہیر اکرم ندیم کے صاحبزادے میر اکرم ندیم بھی شامل تھے۔ اورنگی ٹاؤن، لانڈھی، کورنگی اور لیاری کے کچھ چھوٹے گروپوں نے بھی ہماری حمایت کردی۔

8 اگست کو عزیزم محمد طفیل علی اصغر میرے گھر پہنچ گئے، ان کے ہمراہ کچھ نوجوان بھی تھے۔ پوچھا کہ بھلا اتنے سارے افراد کا کیا کام؟ طفیل بولے: آپ ناظم تو بن گئے ہیں بس آج رسم ادا ہونی ہے اور شام کو اعلان ہونا ہے، اس لیے سیکورٹی کے پیش نظر یہ نوجوان ساتھ ہیں۔ مجھے، بلکہ جماعت اسلامی کے کسی بھی ذمہ دار کو سیکورٹی کا کبھی شوق نہیں رہا اور نہ ضرورت تھی، لیکن اس روز ان کے جذبات دیکھتے ہوئے منع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس

دن ہلکی ہلکی بارش بھی ہو رہی تھی۔ جب پولنگ اختتام کے نزدیک پہنچی تو کیمپوں کا دورہ مکمل کر کے واپس ادارہ نور حق جا رہا تھا، راستے میں تھا کہ موبائل فون پر بی بی سی لندن کے شفیع نقی جامعی کا فون آیا۔ کہنے لگے: نعمت صاحب آپ کا انٹرویو کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ راستے میں ہوں، تھوڑی دیر میں ادارہ نور حق پہنچ جاؤں گا، آپ کچھ دیر کے بعد فون کرلیں تو آرام سے بات ہو جائے گی۔ وہ بضد رہے: نہیں آپ کا انٹرویو ابھی اسی وقت کرنا چاہ رہا ہوں۔ شفیع نقی اسلامی جمعیت طلبہ کے پینل پر جامعہ کراچی کی طلبہ یونین کے صدر رہ چکے ہیں اور کراچی جماعت کے اکثر ذمہ داران سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ ان کے اصرار کے بعد انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ مختصر گفتگو کرتا ہوا ادارہ نور حق پہنچا تو پتا چلا کہ پولنگ مکمل ہو چکی ہے اور گنتی آخری مراحل میں ہے۔ ادارے میں بھی باقاعدہ نتائج وصول کرنے کے لیے سیل قائم تھا، جو شہر کے تمام پولنگ اسٹیشنز سے لمحے لمحے کی رپورٹ موصول کر رہا تھا۔ باقاعدہ جلسے کا ماحول بنا ہوا تھا۔ ایک جانب اسٹیج تیار تھا۔ مختلف سیاسی جماعتوں کے کارکنان و قائدین ہار پھول لے کر وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کارکنان کے نعروں میں شدت آگئی۔ جذبات سے مغلوب ہو کر عزیزی ناظم اقبال نے مجھے کاندھوں پر اٹھا لیا۔ حتمی نتیجہ آیا تو پتا چلا ہمارے پینل کو 2060 ووٹ، جب کہ تاج حیدر صاحب کے پینل کو 1511 ووٹ ملے ہیں۔ فضا نعروں اور تالیوں سے گونج اٹھی۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد کارکنان کو مبارک باد دی اور دیگر سیاسی جماعتوں کا شکریہ ادا کیا۔ اسی جلسے میں، میں نے نائب ناظم طارق حسن کو اپنا آٹھواں بیٹا قرار دیا۔ کیپٹن حلیم صدیقی بھی وہیں موجود تھے، انہوں نے اپنی تقریر میں مبارک باد دینے کے ساتھ کہا کہ نعمت صاحب ہم نے اپنا وعدہ پورا کر دیا، اب یہ شہر آپ کی توجہ کا منتظر ہے۔ کارکنان خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے اور یہ خوشی کیوں نہ ہوتی، شہر ایک مرتبہ پھر روشنیوں اور رونقوں کی طرف سفر شروع کرنے والا تھا۔ بہت سے چہرے اجنبی تھے جن کی آنکھوں سے محبت اور

خلوص جھلک رہا تھا، خواتین کی بہت بڑی تعداد وہاں موجود تھی۔ سب کا شکریہ ادا کر کے ارادہ کیا کہ پہلے تاج حیدر صاحب سے ملاقات کروں۔ تاج حیدر ڈیفنس میں ایک فلیٹ میں تنہا رہا کرتے تھے۔ میں محمد طفیل اور چند رفقاء ان کے گھر جانے کے لیے روانہ ہوئے تو راستے میں بغیر کچھ کہے سنے ایک عدد پروٹوکول گاڑی کار کے آگے ہوٹر بجاتے ہوئے چلنے لگی۔ طارق روڈ پر جا کر اندازہ ہوا ہم ڈیفنس کے بجائے کسی اور راستے پر آ گئے ہیں، ڈرائیور میاں داد سے پوچھا: یہ کیا ہے؟ اور ہم کہاں جا رہے ہیں؟ بتانے لگے: یہ سرکاری پروٹوکول والی گاڑی ہے اور یہ ہم کو قائداعظم کے مزار پر حاضری دینے کے لیے لے جا رہے ہیں۔ دنیا دن کی روشنی میں مزاروں پر جاتی ہے، پروٹوکول والے ہمیں رات کی تاریکی میں کیوں مزار قائد لے کر جا رہے ہیں؟ اس نامعقول تجویز کو مسترد کرتے ہوئے میں نے میاں داد سے کہا: اس موبائل کے ڈرائیور سے کہو کہ ہوٹر بجا کر لوگوں کو ہماری جانب متوجہ کرنے کے بجائے اپنا راستہ لے اور ہمیں اپنا کام کرنے دے، اور سیدھا تاج حیدر کے گھر چلو، سنا ہے وہ جلدی سونے کے عادی ہیں۔ ڈیفنس میں ایک عمارت کی دوسری منزل پر واقع ان کے فلیٹ پہنچے، دروازے پر دستک دی، انہوں نے خود دروازہ کھولا، گرمجوشی سے گلے ملے اور مبارک باد دی، اور پھر ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھایا، ہلکی پھلکی گفتگو کے بعد وہ چائے بنانے کے لیے کچن میں چلے گئے، خوش ذائقہ چائے سے انہوں نے ہماری تواضع کی۔ کچھ دیر رکنے کے بعد تاج حیدر سے رخصت چاہی اور واپس گھر کا رخ کیا۔

ناظمِ شہر نہیں - خادمِ شہر

اب مرحلہ تھا حلف برداری کا۔ بتایا گیا کہ تقریبِ حلف برداری بارہ دری میں ہوگی۔ اس سے قبل سابق کمشنر کراچی اور پہلے ڈسٹرکٹ کوآرڈی نیشن آفیسر شفیق الرحمٰن پراچہ رات میرے گھر آئے، قدرے حیرانی ہوئی کہ ایسا کیا معاملہ تھا جس کے لیے انہیں میرے گھر آنا پڑا! ڈرائنگ روم میں رسمی سلام دعا کے بعد شفیق الرحمٰن پراچہ کہنے لگے: "نعمت صاحب آپ کو میری جانب سے مکمل تعاون حاصل ہوگا۔ ان شاء اللہ کسی قسم کی شکایت نہیں ہوگی۔ ہر ممکن کوشش کے باوجود اگر کوئی شکوہ ہو تو بلاتکلف براہِ راست مجھ سے کہہ دیجیے گا"۔ اس کے علاوہ اور بہت ساری باتیں ہوئیں، میں خاموشی سے سنتا رہا، آخر میں، میں نے کہا: "آپ مجھ سے کیا توقع کرتے ہیں؟" اس پر وہ بے ساختہ بولے: "شفقت۔ مطمئن رہیے آپ کے طویل تجربے کو شہر کی تعمیر و ترقی کے لیے استعمال کریں گے اور ایک ٹیم کی طرح کام کریں گے۔" 11 اگست 2001ء کو حلف برداری کا پروگرام طے پایا۔ اُس دن صبح سے ہی موسم ابر آلود تھا۔ تقریب کے شرکاء میں گھر کے چند افراد، ذمہ داران جماعت اور کچھ منتخب نمائندوں کے علاوہ محترم مفتی رفیع عثمانی، قاری رضا المصطفےٰ قادری، ڈاکٹر عبدالرزاق سکندر، علامہ حسن ترابی اور مفتی نظام الدین شامزئی بھی شامل تھے۔ تلاوتِ قرآن اور نعتِ رسولؐ کے بعد ڈسٹرکٹ ریٹرننگ آفیسر آغا محمد رفیق نے طارق حسن سے نائب ناظم کا حلف لیا، پھر مجھ سے حلف پڑھوایا۔ کارروائی مکمل ہونے کے بعد اسٹیج سیکریٹری نے مجھے سٹی ناظم کی حیثیت سے خطاب کرنے کی دعوت دی۔ اس لمحے مجھے عجیب سا خوف محسوس ہوا کہ اللہ نے

سرخرو تو کردیا، کہیں شہر کی نظامت میرے لیے آزمائش نہ بن جائے۔ اس لیے جب ڈائس پر پہنچا تو تقریر کرنے کے بجائے بے اختیار دعا شروع کردی۔ دعائیہ جملوں کے بعد تقریب میں شریک افراد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا: ”میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ ایک ایسے شہر کا ناظم منتخب ہوا ہوں کہ جس شہر کے لوگ مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں۔ کراچی کے بھائیوں، کراچی کی بہنوں، کراچی کے نوجوانوں نے جس محبت کا اظہار کیا ہے میں اس محبت کے جواب میں شاید کچھ اور تو نہ کرسکوں مگر میں آج اللہ کو حاضر و ناظر جان کر یہ حلف اٹھاتا ہوں کہ میں اُن کی خدمت سے کسی قیمت پر دریغ نہیں کروں گا۔ میں اللہ کو گواہ کرکے یہ اقرار کرتا ہوں اور آپ تمام بھائیوں کو بھی گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ یہ حلف جو میں نے اپنے رب کے حضور اٹھایا ہے، میرا یہ عزم ہے، اللہ سے میری دعا ہے کہ اللہ مجھے اس حلف کے تقاضوں کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میری یہ دعا ہے اور آپ سب میرے ساتھ اس دعا میں شریک ہیں کہ: اے اللہ! آج میں نے تیرے حضور کراچی کے لوگوں کے لیے جو وعدہ کیا ہے، جو عہد کیا ہے مجھے اس عہد پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرما۔

اے اللہ! میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ صرف تیری رضا کے لیے کام کروں گا۔ دنیا کے اندر تو نے مجھے سب کچھ دے دیا ہے اور آج اس منصب تک پہنچا دیا ہے کہ جس کا میں اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتا۔ اے اللہ، اے اللہ! میرے لیے یہ تیرا کرم ہے، فضل ہے۔ تو ہی دنیا کے نظام کو چلاتا ہے، تو نے ہی اپنی حکمت، اپنے مصالح اور اپنی مشیت کے مطابق مجھ جیسے ناتواں، مجھ جیسے کمزور، مجھ جیسے کم علم کا کراچی کی نظامت کے لیے انتخاب کیا ہے۔

وہ کراچی جو پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے، وہ کراچی جو منی پاکستان ہے، وہ کراچی جو ہم سب کا محسن ہے۔ اس کراچی نے ہم کو وہ سب کچھ دیا ہے جس کی وجہ سے ہم اس مقام پر ہیں۔ یہ مقام ہم کو پاکستان نے دیا ہے اور اگر خاکم بدہن یہ پاکستان نہ بنتا۔ تو ہم وہ کچھ نہ ہوتے جو آج ہم ہیں۔

میں نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

کراچی کے مسائل سے میں پوری طرح آگاہ ہوں۔ میں اس پاکستان میں، اس کراچی میں 53 سال سے رہ رہا ہوں۔ کراچی میرا شہر ہے، کراچی میری جان، کراچی میرا دل ہے، کراچی کے لوگ، کراچی کے بزرگ، کراچی کی بہنیں، کراچی کی بیٹیاں میرے دل سے بہت زیادہ قریب ہیں۔ میں نے اس منصب کی ذمہ داری صرف کراچی کے لوگوں کے لیے ہی اٹھائی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کراچی کے اندر رہنے والے وہ تمام لوگ جو ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے تھے اور جو پاکستان کے ہر صوبے سے یہاں آکر آباد ہوئے ہیں، میں ان لوگوں کے درمیان ایک پل کی حیثیت اختیار کر جاؤں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس منصب کی ذمہ داریاں اٹھانے کے بعد ان کے زخموں پر مرہم رکھوں۔ ان کے تمام مسائل کو اپنی کوششوں سے، اپنے نائب ناظم کی کوششوں سے اور تمام منتخب نمائندوں کی جدوجہد سے کراچی کے عوام کے تعاون اور دعاؤں سے میں توقع سے زیادہ جلدی حل کروں۔"

سچ یہ ہے کہ ساری تقریر دعا کے لہجے میں مکمل ہوئی، اور اس دوران آنکھوں سے آنسو بھی رواں رہے۔ مفتی رفیع عثمانی پر نظر پڑی تو دیکھا کہ رومال سے آنسو پونچھ رہے ہیں۔ بہت عرصے بعد دوبارہ ملاقات ہوئی تو کہنے لگے: "نعمت صاحب میں ہر فجر کی نماز کے بعد دعا کرتا ہوں تو آپ کا نام ضرور لیتا ہوں۔"

اگلے دن صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ گھر سے ڈرائیور کے ہمراہ کے ایم سی بلڈنگ کی طرف روانہ ہوا۔ اُس وقت ناظم سیکریٹریٹ اس عمارت میں تھا۔ ابھی گھر سے کچھ فاصلے پر تھا کہ حیدری مارکیٹ تھانے کی پولیس موبائل گاڑی کے ساتھ چلنے لگی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ گاڑی روک کر ذرا موبائل کے کسی ذمہ دار افسر کو میرے پاس بلائے۔ پیغام سن کر ایک صاحب نزدیک آئے اور مودبانہ انداز میں کہنے لگے: "جی سر! کیا حکم ہے؟" میں نے کہا: "بھئی مجھے پروٹوکول کی کوئی ضرورت نہیں ہے، آپ لوگ واپس جائیں"۔ جواب ملا:

"سر ہم تو ڈیوٹی کے پابند ہیں، اپنی مرضی سے آپ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہمارے افسر سے بات کر لیں"۔ میں نے کہا: "آپ خود افسران سے رابطہ کریں اور کہیں کہ مجھے کسی سیکورٹی کی ضرورت نہیں ہے"۔ جواب سن کر چلے گئے۔ اس کے بعد دیکھا موبائل گاڑی کے آگے تو نہیں خاصا پیچھے چل رہی تھی۔ دفتر پہنچا تو پہلے سے آنے کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ ڈی سی او بھی پہنچ گئے۔ مختلف محکموں کی فائلیں دیکھیں۔ اس میں انفرا اسٹرکچر اور ایجوکیشن کے محکموں کی فائلوں کی تعداد زیادہ تھی۔ منصب تو سنبھال لیا تھا لیکن اختیارات واضح نہیں تھے۔ ایس ایل جی او مکمل وضاحت نہیں دے پا رہا تھا۔ اس لیے ابہام کی فضا میں نظامت کے پہلے دن کا کچھ وقت گزارا۔ زبیر منصوری اور سٹی کونسلر توصیف میرے پاس آئے۔ پوچھنے لگے: کس طرح پہنچے ہیں؟ بتایا: "جس طرح دفتر جماعت جایا کرتا تھا اسی طرح یہاں آیا ہوں، کیوں کوئی خاص فرق ہونا چاہیے؟" الطاف سے پوچھا، تو کہنے لگے: "نعمت صاحب! حالات آپ کے سامنے ہیں، نہ کوئی سیکورٹی نہ کچھ"۔ میں نے بات سنی اور کوئی جواب دیے بغیر فائلیں دیکھنے لگا۔ اسی دوران ایک پنج ستارہ ہوٹل کے نمائندے سیکریٹریٹ آئے۔ ان کا زبیر منصوری سے ٹکراؤ ہوا۔ پوچھنے لگے: "آج صاحب کھانے میں کیا پسند کریں گے؟" جب انھیں بتایا گیا کہ سٹی ناظم کا کھانا گھر سے آیا کرے گا تو کہنے لگے: "ان سے پہلے جو صاحب یہاں ایڈمنسٹریٹر تھے، ان کے لیے دوپہر کا کھانا ہمارے ہوٹل سے آتا تھا"۔ بعد میں پتا چلا کہ ایک وقت کے کھانے کا بل کئی ہزار روپے ہوا کرتا تھا۔ معاملات کو چلانے کے لیے بہت سارے احباب نے اپنی بے تحاشا مصروفیات میں سے وقت نکال کر میرے ساتھ تعاون کیا۔ جماعت اسلامی کراچی کے نظم نے مختلف شعبہ جات کے لیے کمیٹیاں تشکیل دیں اور کچھ رفقا کو اعزازی طور پر میری ٹیم کا حصہ بنا دیا۔ کمیٹیوں کے معاملات دیکھنے کی ذمہ داری برجیس احمد صاحب کی لگائی گئی۔ برجیس صاحب بلدیہ عظمیٰ کے کونسلر رہ چکے تھے اور طویل عرصے سے کراچی جماعت کے نظم

کا حصہ تھے۔ میری معاونت کرنے والوں میں منتخب اور غیر منتخب دونوں طرح کے لوگ شامل تھے۔ عبدالرشید بیگ، مسلم پرویز، انجینئر سلیم اظہر، انجینئر اظہار الحق، نصر اللہ شجیع، زاہد سعید، عابد الیاس، قاضی صدرالدین، انصار رضی، توصیف احمد، نسیم صدیقی، محمد طفیل، زبیر منصوری، گوہر الاسلام، سیف الدین ایڈووکیٹ، ڈاکٹر فیاض عالم، راشد قریشی اور حنیف اکبر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ایک جانب شہر کے دیرینہ مسائل منہ کھولے توجہ کے منتظر تھے، اور دوسری طرف سابقہ کمشنری نظام میں مختلف محکموں کے افسران کا نئے سسٹم میں ماتحتی قبول کرنے سے انکار۔ نت نئے پیش آنے والے مسائل کی وجہ سے ایس ایل جی او میں ہر تھوڑے دن بعد ترمیم کی جاتی۔ ابتدا میں ایس ایل جی او میں سٹی گورنمنٹ کا دورانیہ تین سال رکھا گیا جو بعد میں بڑھا کر چار سال کر دیا گیا۔ اس میں کے بی سی اے اور واٹر اینڈ سیوریج بورڈ کے متعلق کوئی ذکر نہیں تھا۔ قومی تعمیر نو بیورو کے قانون کے مطابق ابتدائی چھ ماہ آفیشل مدت طے کی گئی تھی، اس دوران ڈپٹی کمشنر اور ان کے اختیارات نچلی سطح پر منتقل ہونے تھے۔ افسران میں بعض ایسے تھے جو اس نئے سیٹ اپ سے ناخوش تھے اور تعاون نہیں کر رہے تھے۔ یہ طے کیا گیا کہ مسائل اور حل کی درجہ بندی کر لی جائے۔ فوری اور چھوٹے پیمانے کے کام یونین کونسل کے ناظمین شروع کر دیں، سیوریج اور چھوٹی سڑکوں کی تعمیر و مرمت وغیرہ... اس کے لیے پہلے سال کے بجٹ میں ہر یونین کونسل کے لیے 34 لاکھ روپے مختص کیے گئے۔ کچھ بڑے کام ٹاؤنز کے سپرد تھے، بلکہ ان کی ذمہ داریوں میں شامل تھے۔ سٹی گورنمنٹ نے میگا پروجیکٹس اور مجموعی انفرااسٹرکچر کی ازسرِ نو بحالی کا بیڑا اٹھایا۔ اس ضمن میں اوّل روز سے ارادہ کیا کہ اپنے پرائے کی تفریق کے بغیر شہر کی خدمت کروں گا۔ الحمدللہ چار برس تک ایسی کوئی شکایت کسی ٹاؤن یا یونین کونسل کو نہیں ہوئی کہ سٹی ناظم کراچی کے علاقوں یا ناظمین کے درمیان کوئی تفریق برتتے ہیں۔ ابتدائی دنوں میں ایک دلچسپ واقعہ

بھی پیش آیا، ہوا کچھ یوں کہ میں اپنے دفتر میں بیٹھا فائلیں دیکھ رہا تھا کہ سیکورٹی گارڈ کمرے میں داخل ہوا۔ شکل پر گھبراہٹ عیاں تھی۔ پھولی ہوئی سانسوں سے کہنے لگا: "بہت سارے لوگوں نے دفتر پر دھاوا بول دیا ہے، اور ضد کر رہے ہیں ناظم صاحب کے پاس جانا ہے، میں نے بہت منع کیا، لیکن وہ گھستے ہی چلے آرہے ہیں"۔ اس کی بات سن کر میں اٹھ کھڑا ہوا اور کہا: "کون لوگ ہیں، انہیں اندر آنے دو"۔ سیکورٹی گارڈ کسی قدر تذبذب کا شکار تھا، میں نے دوبارہ کہا: "آنے دو"۔ اس دوران پانی دو، پانی دو کے نعرے صاف سنائی دینے لگے۔

کمرے سے نکل کر دیکھا تو گہری رنگت اور گھنگھریالے بالوں والے مرد و خواتین کثیر تعداد میں جمع ہیں۔ اندازہ ہو گیا کہ لیاری سے تعلق ہے۔ کمرے کے اندر بلایا۔ کرسیاں کم پڑ گئیں تو کہہ دیا کہ جس کو جہاں جگہ مل رہی ہے بیٹھ جائے۔ کچھ دیر میں شور تھما تو پوچھا کیا مسئلہ ہے؟ اتنا کہنا تھا کہ پھر شور مچ گیا، ایک ہی لفظ سمجھ میں آرہا تھا "پانی"۔ آنے والوں نے شکایتوں کے دفتر کھول دیے۔ سب بول بول کر تھک گئے تو میں نے ان سے کہا: "مجھے سٹی ناظم بنے ہوئے ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا ہے۔ آپ کی شکایات بالکل ٹھیک ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایک دو دن میں خود آپ کے علاقے میں آؤں گا اور صورتِ حال کا جائزہ لے کر فوری طور پر جو ممکن اقدام ہوا وہ کروں گا"۔ میری بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ ایک صحت مند نوجوان کھڑا ہوا اور قدرے بدتمیزی سے کہنے لگا: "سب اسی طرح بولتے ہیں۔ پہلے بھی بہت لوگوں نے وعدہ کیا، لیکن آیا کوئی نہیں"۔ میں نے کہا: "بس ایک دو دن صبر کر لیں"۔ دو دن کے بعد لیاری کے ٹاؤن ناظم عبدالخالق جمعہ اور کچھ دیگر افراد کے ہمراہ ان لوگوں کے علاقے میں پہنچا تو تھوڑی ہی دیر میں اچھی خاصی بھیڑ جمع ہو گئی۔ گلیوں اور گھروں کے اندر جا کر پانی کی قلت کے حوالے سے معلومات لیں، پتا چلا کہ اردگرد کی آبادیوں میں پانی موجود ہے لیکن لیاری کے کئی علاقوں میں ہفتوں ہفتوں پانی نہیں آتا۔

موقع پر ہی افسران کو حکم دیا کہ فی الحال عارضی طور پر پانی کی فراہمی ممکن بنائی جائے اور مستقل بنیادوں پر فراہمی کے لیے منصوبہ بنا کر پیش کیا جائے۔ نئی نظامت سنبھالے ابھی جمعہ، جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے تھے کہ کئی اور مسائل کھڑے ہو گئے۔ ڈومیسائل کون بنائے گا؟ پیدائش و اموات کے سرٹیفکیٹ کہاں سے بنیں گے؟ تعین ہی نہیں ہو رہا تھا یہ کام کون کرے گا۔ ایس ایل جی او اس حوالے سے خاموش تھا۔ دوسری طرف کے ڈی اے اور کے ایم سی جیسے ادارے تو شہری حکومت میں ضم ہو گئے لیکن کے بی سی اے اور واٹر بورڈ کا مسئلہ ابھار رہا۔ اصولی طور پر ان دونوں اداروں کو بھی شہری حکومت کا حصہ بننا تھا لیکن صوبائی حکومت نے ان دونوں محکموں کو شہری حکومت کے سپرد نہیں کیا۔ اُس وقت کے بی سی اے کے چیف کنٹرولر بریگیڈیئر ایس اے ناصر تھے، انہیں صوبائی حکومت کے کچھ اہم افراد کی پشت پناہی حاصل تھی۔ وہ کسی صورت سٹی گورنمنٹ کے ماتحت کام کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔

میں نے بریگیڈیئر ایس اے ناصر کو خط بھی لکھا، لیکن انہوں نے جواب دینے کی زحمت نہیں کی۔ صورت حال یہ ہو گئی تھی کہ کے بی سی اے شہری حکومت کے مدمقابل ایک متوازی ادارہ بن گیا۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے تمام ٹاؤنز کے ڈی ایم اوز کو خط لکھ کر مطلع کر دیا کہ ٹاؤن پلاننگ کے معاملات ٹاؤنز کی سطح پر دیکھے جائیں گے، ایس ایل جی او میں بھی یہی لکھا ہوا تھا۔ ساتھ ہی ایک نوٹیفکیشن کے بی سی اے کے متعلقہ افسران کے لیے نکالا کہ وہ کل سے اپنی ذمہ داریاں ٹاؤنز میں انجام دیں۔ اس پر کھلبلی مچ گئی۔ چیف سیکریٹری سلیم خان تھے، انہوں نے رابطہ کیا اور کہا کہ ہم اس مسئلے پر ہنگامی میٹنگ کال کر رہے ہیں۔ اس میں ساری صورت حال کا جائزہ لیں گے۔ میٹنگ کے بعد چیف سیکریٹری صاحب کہنے لگے: "شہری حکومت کی جانب سے جاری کیے گئے نوٹیفکیشن کی وجہ سے بڑا مسئلہ ہو گیا ہے اور جو کام ہو رہے تھے وہ بھی رک گئے ہیں"۔ مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے: "نعمت صاحب!

براہ مہربانی آپ اس نوٹیفکیشن کو فی الحال واپس لے لیں"۔ یہی کچھ معاملہ واٹر بورڈ کا تھا۔ ادارے کے سربراہ بریگیڈیئر بہرام خان تھے۔ وہ اچھی شہرت کے حامل افسر تھے اور کراچی میں پانی کی فراہمی کے مسائل کے حل میں دلچسپی لیتے تھے۔ ہمارے آنے کے کچھ عرصے بعد ان کا تبادلہ ہوگیا۔ ان کے بعد یکے بعد دیگرے مینجنگ ڈائریکٹر تبدیل ہوتے گئے۔ بریگیڈیئر جاوید اشرف آئے، پھر بریگیڈیئر آصف غزالی آئے، اور ان کے بعد بریگیڈیئر افتخار حیدر آئے، لیکن کوئی بھی اس بات پر آمادہ نہیں تھا کہ سٹی حکومت کی ماتحتی میں خوش دلی سے کام کرے۔

سٹی ناظم بنے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ کرنل طاہر مشہدی نے سٹی ناظم کے انتخاب کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ یہ صاحب بھی الیکشن میں سٹی نظامت کے لیے بحیثیت امیدوار کھڑے ہوئے تھے (بعد ازاں متحدہ قومی موومنٹ کے ٹکٹ پر سینیٹر بھی بنے)۔ سیشن کورٹ میں مقدمہ چل رہا تھا۔ شہری حکومت کے وکیل منظور رتی تاریخوں پر عدالت جاتے تھے۔ یہ سلسلہ جاری تھا اور میں اس کے نتائج سے بے پروا اپنے روزمرہ معمولات کو نمٹانے میں مصروف تھا کہ ایک دن نائب ناظم طارق حسن میرے پاس آئے، دیکھا تو چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ پوچھا: "خیریت تو ہے، کیا ہوا؟" مجھے پتا تھا یہ کیس کے سلسلے میں کورٹ گئے ہوئے تھے، کہنے لگے: "نعمت صاحب! ابھی وکیل سے ملاقات ہوئی ہے، وہ بتا رہے تھے کہ آج جج کا رویہ بدلا ہوا تھا۔ میرے حساب سے وہ کل ہمارے خلاف فیصلہ سنا دے گا۔ اس طرح تو ہماری نظامت......!" طارق حسن کی بات سن کر میں نے کہا: "چھوڑو طارق! اچھا ہے، اس طرح تو ہماری جان چھوٹ جائے گی"۔ میری بات سن کر وہ کہنے لگے: ''میں پریشان ہو رہا ہوں اور آپ مذاق کر رہے ہیں!'' میں نے طارق حسن سے کہا: "جماعت اسلامی نے دو چیزیں سکھائی ہیں۔ عہدے کی خواہش نہ رکھنا، اور اگر خواہش نہ ہونے کے باوجود بھی کوئی عہدہ مل جائے تو اسے امانت سمجھنا اور یہ سمجھنا کہ اللہ

نے آزمائش دی ہے، دوسرے یہ کہ اللہ پر توکل کرنا"۔ طارق حسن پتا نہیں میری ان باتوں کو کتنا ہضم کر پائے، لیکن ان کی بے چینی کم ضرور ہوگئی۔ کچھ دنوں کے بعد عدالت نے ہمارے حق میں فیصلہ دے دیا۔ منظور صاحب نے تبصرہ کیا کہ فیصلہ آپ لوگوں کے نہیں، دراصل کراچی کے حق میں ہوا ہے۔

شہر کے معاملات کو بہتر انداز میں چلانے کا ایک ہی راستہ تھا کہ 178 یونین کونسل ناظمین اور 18 ٹاؤن ناظمین سے مسلسل رابطہ بھی رکھا جائے اور ان کے جن مسائل کا تعلق سٹی گورنمنٹ سے ہو، انہیں میرٹ پر حل کیا جائے، اور کسی طور یہ نہ ہو کہ فلاں ہمارے گروپ کا فرد ہے اور فلاں کا تعلق کسی دوسری سیاسی جماعت یا گروہ سے ہے۔

اس توازن کو برقرار رکھنا آسان کام نہیں تھا۔ شہر کے ہر علاقے کے مسائل گمبھیر تھے اور سال ہا سال سے حل نہیں ہوئے تھے۔ ہمارے پاس کوئی الہ دین کا چراغ نہیں تھا کہ رگڑتے، جن حاضر ہوتا اور ہمارے حکم پر سارے مسائل حل کر دیتا۔ سٹی کونسل میں نائب ناظم طارق حسن اور مسلم پرویز نے نہایت متانت، بردباری اور معاملہ فہمی کا ثبوت دیا اور پوری کونسل کو ساتھ لے کر چلے۔ عبدالرشید بیگ صاحب، قاضی صدرالدین، عابد الیاس، انجینئر عبدالعزیز، ریحانہ افروز، گوہر الاسلام، سجاد دارا، حکیم مجاہد محمود برکاتی، زاہد سعید، حکیم سعادت ابراہیم، پیپلز پارٹی کے نجمی عالم اور سعید غنی اور سینئر رکن کونسل صدیق راٹھور کا کردار بھی لائق ستائش رہا کہ ان سب نے شہر کے مفاد کو اوّلیت دی اور اختلافی امور کو افہام و تفہیم سے حل کیا۔ بجٹ اجلاسوں کے مواقع پر نوک جھونک ضرور ہوتی رہی، لیکن ہر سال کا بجٹ اراکین کی غالب اکثریت کی حمایت و تائید سے منظور ہوتا رہا۔

ٹاؤن ناظمین کے ساتھ میری اور ڈی سی او کی مستقل مشاورت ہوا کرتی تھی۔ ہم ان اجلاسوں میں اہم محکموں کے ای ڈی اوز کو بھی شریک کروایا کرتے تھے۔ تمام ٹاؤن ناظمین شہر کی تعمیر و ترقی کے لیے ہمہ وقت سرگرم رہتے تھے۔ میرے دروازے ان سب

کے لیے ہر وقت کھلے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سب ایک ٹیم اور ایک خاندان کی طرح کام کر پائے۔ اقلیت سے تعلق رکھنے والے منتخب نمائندوں اور خواتین کونسلرز نے بھی اپنی ذمہ داریوں کو بھرپور طریقے سے ادا کیا۔ کئی لوگ پہلی مرتبہ کسی عوامی عہدے پر منتخب ہوئے تھے اور قواعد وضوابط سے کم واقف تھے، لیکن ان میں سیکھنے کا جذبہ بہت تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کراچی کی سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ آگے چل کر پورے ملک کے لیے ایک مثال ثابت ہوئی۔

سٹی گورنمنٹ کے قیام سے کچھ پہلے پورے پاکستان میں وفاقی حکومت کے تحت ایک بہت بڑا اور ہمہ جہت ترقیاتی منصوبہ خوشحال پاکستان پروگرام شروع ہو چکا تھا۔ ہم نے 2004ء کے آخر تک اس پروگرام کے چار مراحل میں کئی ارب روپے کے منصوبے شہر بھر میں مکمل کیے۔ ان میں مختلف سڑکوں کے ساتھ ساتھ گرومندر، نمائش، فائیو اسٹار چورنگی، عائشہ منزل چورنگی، بنارس چوک اور ناگن چورنگی کی امپروومنٹ اور سگنلائزیشن شامل ہیں، جبکہ سیوریج سسٹم کی بہتری کے لیے بھی بہت کام کیا گیا۔ گلشن اقبال ٹاؤن اور جمشید ٹاؤن میں سیوریج کے بہت بڑے حصے کو اسٹورم واٹر ڈرین سے الگ کیا گیا اور سیوریج کا نیا نظام ڈالا گیا۔ اس کے علاوہ پورے شہر میں بڑے پیمانے پر بوسیدہ سیوریج لائنوں کو تبدیل کیا گیا۔ خوش حال پاکستان پروگرام کی نگرانی کے لیے میں نے انجینئر سلیم اظہر کی ذمہ داری لگائی اور ان سے کہا کہ تمام ٹاؤن اور یونین ناظمین کی مشاورت سے منصوبے بنائے جائیں۔ ہر ٹاؤن کو کچرا اٹھانے اور صفائی ستھرائی کے نظام کو بہتر بنانے کے لیے 65 لاکھ روپے کی مشینری، ٹریکٹر ٹرالی وغیرہ بھی دیں۔ کراچی کی 178 یونین کونسلز کو بھی صفائی کے نظام کی بہتری کے لیے ٹریکٹر ٹرالی اور دیگر سامان کا تحفہ دیا گیا۔ خوشحال پاکستان پروگرام کو کامیابی سے ہم کنار کرنے میں منتخب نمائندوں کے ساتھ ساتھ دو افسران نثار سار یو اور محمد شکیب نے غیر معمولی محنت اور لگن سے کام کیا اور اپنے فرائض منصبی پوری دیانت داری کے

ساتھ ادا کیے۔ ترقیاتی منصوبوں میں عوامی نمائندوں اور سرکاری افسران کا مل جل کر کام کرنا ہی کامیابی کی دلیل ہوتا ہے۔ الحمدللہ ہمارے پورے دور میں بیوروکریسی اور مختلف محکموں کے افسران کا تعاون ہمیں حاصل رہا، اور ہم سب نے ایک ٹیم بن کر شہر کی خدمت کی۔

سٹی گورنمنٹ نے اپنے قیام کے بعد جس فلائی اوور پر سب سے پہلے کام شروع کروایا، وہ شاہ فیصل کالونی فلائی اوور تھا۔ اس فلائی اوور کی تعمیر کا ٹھیکہ سٹی گورنمنٹ کے وجود میں آنے سے کچھ عرصے قبل ایک کنٹریکٹر کو دیا جا چکا تھا۔ 15 اگست 2001ء کو صدر پرویز مشرف نے اس منصوبے کا سنگِ بنیاد رکھا۔ منصوبے کی کُل مالیت 27 کروڑ روپے تھی۔

میں نے انجینئر سلیم اظہر اور محکمہ ورکس اینڈ سروسز کے افسران کو ہدایت کی کہ یہ ہمارا پہلا بڑا ترقیاتی منصوبہ ہے۔ اگر ہم نے اس منصوبے کو شفاف انداز میں اچھے معیار کے مطابق مکمل کرلیا تو آگے کے لیے راستہ ہموار ہوجائے گا، اور ٹھیکیدار و افسران ہمارے کام کرنے کے طریقے کو بھی سمجھ جائیں گے۔ میں نے اس پراجیکٹ پر کام کرنے والی کمپنی کے نمائندے کو بھی بلایا اور اس سے کہا کہ ہم اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ آپ کو بروقت ادائیگی ہوتی رہے اور بغیر کسی رشوت کے ہوتی رہے، لیکن ہماری ٹیم کے اراکین کا کام کے معیار سے مطمئن ہونا لازمی ہے، اور یہ بھی کہ ادائیگی سے قبل ہمارے انجینئرز پیمائش وغیرہ بھی لازمی طور پر کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ ان شاءاللہ ہماری کمپنی آپ کی توقعات پر پوری اترے گی، ہم خود بھی چاہتے ہیں کہ اپنے شہر کی خدمت کریں اور معیاری کام کریں، لیکن آپ جانتے ہی ہیں کہ رشوتوں کا ریٹ کتنا "ہائی" ہے۔ مجھے ان کی صاف گوئی نے متاثر کیا۔

شاہ فیصل کالونی کے کئی مکانات اس فلائی اوور کی زد میں آرہے تھے۔ ہم نے ان کے مالکان کو مارکیٹ ریٹ کے مطابق قیمت ادا کی، اور میں نے خود ان تمام افراد کو چیک دیے۔

تا کہ وہ اپنے لیے متبادل رہائش کا معقول بندوبست کر سکیں۔

حیران کن طور پر یہ فلائی اوور 19 کروڑ روپے میں مکمل ہو گیا۔ مکانات کے لیے دی گئی رقم اس میں شامل نہیں تھی۔ شاید سرکاری شعبے میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی اور انوکھی مثال تھی کہ ٹینڈر میں منظور شدہ رقم سے کم میں کوئی منصوبہ مکمل کیا گیا ہو۔ ہمارے یہاں روایت تو اس کے برعکس رہی ہے کہ ترقیاتی منصوبوں میں جان بوجھ کر تاخیری حربے استعمال کیے جاتے ہیں اور ایک منصوبے کی لاگت کہیں سے کہیں جا پہنچتی ہے۔

شاہ فیصل کالونی فلائی اوور منصوبے میں کئی کروڑ کی بچت نے ہماری پوری ٹیم کا حوصلہ بلند کر دیا اور آگے آنے والے ترقیاتی منصوبوں کے لیے مثال قائم کر دی۔ اس فلائی اوور کی وجہ سے شاہ فیصل کالونی کے عوام نے سکھ کا سانس لیا، کیونکہ اب انہیں ریلوے پھاٹک پر انتظار کرنے کی زحمت سے نجات مل گئی تھی۔ ریلوے کی مین لائن ہونے کی وجہ سے وہاں پھاٹک دن اور رات میں کئی بار بند ہوا کرتا تھا اور ٹریفک جام ہونے کی شکایت عام تھی۔

ہم نے روزِ اوّل سے ایک اصول طے کر لیا تھا کہ ترقیاتی منصوبے خواہ کسی بھی علاقے میں ہوں یا کسی بھی نوعیت کے ہوں، آنکھیں بند کر کے منظوری دینے کے بجائے، ٹینڈرز اور معاہدوں سمیت تمام جزئیات کی مکمل جانچ پڑتال کی جائے گی۔

سٹی گورنمنٹ کے مالی حالات اچھے نہیں تھے۔ آمدنی میں فوری اضافہ ناگزیر تھا۔ ایک آسان حل تو یہ تھا کہ ہم شہریوں پر نئے ٹیکسوں کا بوجھ ڈالتے جو پہلے ہی سے کئی طرح کے ٹیکسوں کو بھگت رہے تھے۔ کچھ افسران کی جانب سے نئے ٹیکس متعارف کروانے کی تجویز کو سندِ قبولیت نہیں مل سکی۔ متبادل راستے اختیار کرتے ہوئے سٹی گورنمنٹ نے پہلے مرحلے میں کمرشل جگہوں کی شفاف نیلامی کا فیصلہ کیا۔ اس میں دو تین مقامات بہت اہم تھے جیسے بانس بے ٹرک اسٹینڈ پر پارکنگ کا ٹھیکہ برسوں سے ایک ہی پارٹی کے پاس تھا، اور اس کے عوض وہ کرائے کی مد میں 45 لاکھ روپے سالانہ جمع کراتے تھے۔ مسلم پرویز کی

سربراہی میں آکشن کمیٹی بنادی۔ اس نے مکمل جائزہ لے کر نیلامی کرنے کا اعلان کیا۔ بہت سارے لوگ اس میں شریک ہوئے اور آفرز دیں۔ آخر میں 45 لاکھ روپے سالانہ پر جانے والا ٹھیکہ ایک کروڑ پچھتر لاکھ میں گیا۔ یعنی سابقہ کرائے سے تین گنا زائد۔ نئی پارٹی کامیاب بولی دینے کے بعد جب قبضہ لینے کے لیے وہاں پہنچی تو پرانی پارٹی نے بدمعاشی کا رویہ اختیار کرتے ہوئے انہیں دھمکیاں دیں اور بھگا دیا۔ ذرا سختی کی تو وہ لوگ جماعت اسلامی کراچی کے دفتر پہنچ گئے اور امیر جماعت معراج الہدیٰ صدیقی کو یاد کرانے لگے کہ ہم بھی جماعت اسلامی کے پرانے خیرخواہوں میں سے ہیں اور آپ کے سٹی ناظم تو ہمیں معاشی طور پر تباہ کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ ڈاکٹر معراج نے ان سے معذرت کرلی کہ وہ کسی ناجائز کام کے لیے سفارش نہیں کریں گے۔

اُس وقت ڈی آئی جی کراچی طارق جمیل تھے، انہیں مسئلہ حل کرنے کے لیے کہا۔ پولیس کی بھاری نفری نے قبضہ ختم کرایا۔ اس سے اگلے برس وہ ٹھیکہ 2 کروڑ 40 لاکھ روپے میں گیا۔ جب کہ ہماری مدت ختم ہونے سے قبل کرائے کی مد میں مذکورہ اسٹینڈ سے 2 کروڑ 75 لاکھ سالانہ آمدنی ہو رہی تھی۔ آمدنی کو بہتر بنانے کے لیے کمرشل اراضی کی نیلامی کا معاملہ بھی قابل ذکر رہا۔ اس حوالے سے صدر میں امریکا نو ڈرائی کلینرز کی زمین کی فروخت کا معاملہ بہت نمایاں رہا۔ بہت دنوں تک اخبارات میں اس کا چرچا رہا۔

ہوا کچھ یوں کہ امریکا نو ڈرائی کلینرز سٹی گورنمنٹ کی اراضی پر قائم تھی۔ اس کے مالکان گزشتہ 40 برس سے فقط چند سو روپے ماہانہ کرایہ ادا کرتے تھے، جو کہ محل وقوع کے اعتبار سے نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس کی لیز کی مدت ختم ہوئی تو اس کے مالکان میں سے ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہماری دکان کی لیز ختم ہو رہی ہے، براہ مہربانی اس میں توسیع کردیں۔ میں نے جواب دیا کہ میں اس پلاٹ کی لیز میں توسیع کرنے کے بجائے اسے نیلام کرواؤں گا، آپ بھی نیلامی میں حصہ لیجیے۔ بولی میں آپ

کامیاب ہوگئے تو آپ کام جاری رکھیے گا۔ وہ اعتراض کرنے لگے کہ اس طرح تو پچھلی حکومتوں میں سے کسی نے نہیں کیا۔ نیلامی کے لیے جاری کردہ اشتہار کا اچھا نتیجہ نکلا۔ کافی لوگوں نے اس میں حصہ لیا۔ جب نیلامی ہوئی تو محض چند سو روپے ماہانہ کرایہ دینے والی جگہ 6 کروڑ 75 لاکھ روپے میں فروخت ہوئی۔ کامیاب بولی دینے والے سے پیسے لے کر فوراً قبضہ دے دیا گیا۔ مزے کی بات یہ کہ شہری حکومت کو حاصل ہونے والی یہ معقول آمدنی صوبائی حکومت کو ایک آنکھ نہ بھائی، اس لیے شہر کے مفاد کا دعویٰ کرنے والے عناصر عدالت جا پہنچے اور مقدمہ دائر کردیا کہ سٹی ناظم کو یہ جگہ نیلام کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ کچھ دن کے بعد متحدہ سے تعلق رکھنے والے سینئر صوبائی وزیر سید سردار احمد ایک سیمینار کی صدارت کررہے تھے۔ منتظمین نے مجھے بھی مدعو کررکھا تھا۔ تقریر کے دوران میں نے مالی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے امریکا نو ڈرائی کلینرز کی نیلامی کے معاملے کا حوالہ بھی دیا۔ سردار احمد صاحب جب اپنی صدارتی تقریر کرنے آئے تو انہوں نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "نعمت صاحب کی امانت اور دیانت پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا، اور نہ ہی کبھی اس کی نوبت آئے گی۔ امریکا نو ڈرائی کلینرز کے پورے معاملے سے میں ذاتی طور پر واقف ہوں، اس لیے برملا کہتا ہوں کہ نعمت صاحب کی طرف سے نیلامی کا فیصلہ بالکل درست تھا اور شہر کے حق میں تھا"۔ سٹی گورنمنٹ کی زمینوں کی نیلامی کے ہر عمل کو کرپشن اور شکوک وشبہات سے مکمل پاک رکھنے کے لیے مختلف مواقع پر ہونے والی نیلامیوں میں افسران کے ساتھ عوامی نمائندوں کو بھی شامل کیا۔ معاملات کو شفاف بنانے کے لیے ایک مشاورتی کمیٹی بنائی اور اس سے اگلے مرحلے میں کرپشن کے خاتمے کے لیے ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کی معاونت سے ایک Procurement Manual بنوایا اور اس کے نفاذ کو یقینی بنایا۔

سٹی گورنمنٹ کے پہلے ڈسٹرکٹ کوآرڈی نیشن افیسر شفیق الرحمن پراچہ

سلیم اظہر اور ڈی سی او فضل الرحمن کے ساتھ ایک میٹنگ کے دوران

نائب ناظم کراچی طارق حسن

تعمیر کراچی پروگرام کے حوالے سے منعقدہ میٹنگ۔
ڈی سی او میر حسین علی، سلیم اظہر، اظہار الحق، شعیب صدیقی اور انصار رضی نے شرکت کی

سٹی گورنمنٹ کے لیے جماعت اسلامی کراچی کی
کوآرڈی نیشن کمیٹی کے ذمہ دار برجیس احمد

سٹی کونسل میں الخدمت کے گروپ لیڈر
اور چیف پریزائڈنگ آفیسر مسلم پرویز

سیف الدین ایڈوکیٹ

قاضی صدرالدین

انجینئر عبدالعزیز

گوہر الاسلام

نصراللہ شجیع

زبیر منصوری

توصیف احمد

راشد قریشی

فخر شبیر

حنیف اکبر

شہر کو پانی کی فراہمی کا منصوبہ۔ کے تھری

میرے سٹی ناظم بننے سے کچھ عرصہ قبل وفاقی حکومت نے کراچی کے لیے تین بڑے منصوبوں کی منظوری دے دی تھی۔ لیاری ایکسپریس وے، ناردرن بائی پاس اور کے تھری۔ کے تھری شہر کو انڈس ریور سسٹم سے 100 ملین گیلن پانی روزانہ کی فراہمی کا میگا پراجیکٹ تھا۔ کراچی کو دریائے سندھ سے 100 ملین گیلن پانی کی فراہمی کا ایک منصوبہ کے ٹو (K-2) 1998ء میں واٹر بورڈ نے مکمل کیا تھا۔ لیاری ایکسپریس وے کے منصوبے میں ہماری ذمہ داری متاثرین کی منتقلی اور آبادکاری تک محدود تھی۔ اس منصوبے کو "لیاری ایکسپریس وے ری سیٹلمنٹ پراجیکٹ" کا نام دیا گیا جس کا انچارج ڈی سی او شفیق پراچہ کو بنایا گیا۔ انہوں نے منتخب نمائندوں کے ساتھ مل کر بہت محنت اور دیانت داری سے متاثرین کی فہرست مرتب کی اور متاثرین کو متبادل پلاٹ اور مکان بنانے کے لیے رقومات دی گئیں۔ اس کے بغیر لیاری ایکسپریس وے کا بننا ممکن نہیں تھا کیونکہ ندی کے اندر دونوں طرف کئی ہزار لوگ برس ہا برس سے اپنے خاندانوں سمیت آباد تھے۔ سینکڑوں نے تو پکے مکانات بنائے ہوئے تھے۔

ناردرن بائی پاس کی تعمیر نیشنل ہائی وے اتھارٹی کی ذمہ داری تھی۔ جبکہ کے تھری منصوبہ کراچی واٹر اینڈ سیوریج بورڈ کی ذمہ داری تھا، جو کہ قانونی طور پر سٹی گورنمنٹ کا ماتحت ادارہ بن چکا تھا۔ سٹی گورنمنٹ کے معرض وجود میں آنے سے قبل وفاقی حکومت نے اس میگا پراجیکٹ کے لیے 5534 ملین روپے فراہم کر دیے تھے۔ واٹر بورڈ کے فنجنگ

ڈائریکٹر بریگیڈیئر بہرام خان نے حیران کن طور پر اس منصوبے کے ٹینڈرز کی تیاری میں ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کو بھی شامل کیا تھا۔ کنسلٹنٹ کی تقرری سے پہلے ہی سٹی گورنمنٹ قائم ہوگئی اور مجھے بحیثیت سٹی ناظم اس منصوبے کے حوالے سے بنیادی فیصلوں کا اختیار مل گیا۔ بہرام خان نے مجھے کے تھری منصوبے کے حوالے سے تفصیلی بریفنگ دی اور اب تک کی پیش رفت سے آگاہ کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل سے واٹر بورڈ کا معاہدہ "Integrity Pact" قابلِ ستائش ہے لیکن میری خواہش ہے کہ اسے صرف کے تھری تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ واٹر بورڈ کے تمام منصوبوں میں انہیں شامل کیا جائے۔

میں نے اس ادارے کے ذمہ داران شوکت عمری اور عادل گیلانی سے ملاقات کی اور انہیں اپنی طرف سے فری ہینڈ دینے کی یقین دہانی کروائی۔ واٹر بورڈ اور ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کی مشترکہ ٹیکنیکل کمیٹی نے نیسپاک کنسلٹ کی آفر کی منظوری دے دی اور فائل حتمی منظوری کے لیے میرے پاس آگئی۔ اس دوران ایک عجیب واقعہ ہوا۔ نیسپاک کنسلٹ کے مالک انجینئر سعید احمد نے مجھ سے رابطہ کیا اور کہا کہ خان صاحب کیونکہ میرے آپ سے پرانے تعلقات ہیں اس لیے میں نہیں چاہتا کہ اس منصوبے کی وجہ سے آپ پر یا میری کمپنی پر کوئی انگلی اٹھائے حالانکہ ہماری فیس صرف چھ کروڑ روپے ہے جو کہ ساڑھے پانچ ارب کے منصوبے میں بہت ہی کم رقم ہے۔ میں نے کہا کہ سعید صاحب یہ کام تو میرے سٹی ناظم بننے سے قبل ہی فائنل ہوچکا تھا۔ انہوں نے جواب دیا کہ سفید کپڑے پر بہت چھوٹا داغ بھی نظر آجاتا ہے۔ بہر حال میں نے واٹر بورڈ کے افسران کو ہدایت کی کہ ایک بار پھر جانچ پڑتال کرلی جائے اور باہر کے کچھ ماہرین سے بھی مشاورت کی جائے۔ اس ساری تگ و دو کے بعد بھی قرعہ فال نیسپاک کنسلٹ کے نام ہی نکلا۔

ادارے نے اس منصوبے کے لیے اپنے دو بہت ہی قابل اور سینئر انجینئرز ارشد فاروقی اور اسد اللہ کو نامزد کردیا۔ کے تھری منصوبے میں واٹر بورڈ کے افسران مصباح

الدین فرید، مشکور الحسنین اور شاہد سلیم، جبکہ ہماری ٹیم کے سلیم اظہر، اظہار الحق اور فیضان اللہ خان نے غیر معمولی محنت کی اور کراچی سے محبت کا حق ادا کر دیا۔

واٹر بورڈ اور ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کے درمیان کیے گئے معاہدے Integrity Pact کے نتیجے میں کے تھری منصوبے کے ڈیزائن اور نگرانی کی مد میں 187 ملین روپے بچائے گئے، جبکہ تعمیر اور دیگر مدوں میں 837 ملین روپے کی بچت ہوئی۔ وفاقی حکومت نے اس منصوبے کے لیے 5534 ملین روپے فراہم کیے تھے جبکہ ہم نے پورا کانٹریکٹ 4510 ملین روپے میں ایوارڈ کیا اور اس منصوبے میں 1024 ملین روپے یعنی ایک ارب 24 لاکھ روپے کی بچت کر کے ایک ریکارڈ قائم کر دیا۔ یہ کسی بھی سرکاری ترقیاتی منصوبے میں ناقابلِ یقین بچت تھی جسے صوبائی اور وفاقی سطح پر بھی سراہا گیا اور میڈیا میں بھی طویل عرصے تک اس کا تذکرہ ہوتا رہا۔

کے تھری منصوبے میں جو رقم بچی اس سے کراچی کے جزائر بابا بھٹ اور صالح آباد کو پانی فراہم کرنے کا منصوبہ تیار کیا گیا جس کے لیے سمندر کے اندر پائپ لائن ڈالی گئی اور جزائر تک پانی پہنچایا گیا۔ اس منصوبے کو بھی نیکلو کنسلٹ نے انجینئر بشیر لاکھانی کی سربراہی میں بڑی مہارت سے ڈیزائن کیا تھا اور اس پر عمل درآمد مصطفیٰ کمال کے دورِ میں ہوا۔

کے تھری کے مختلف حصوں کے لیے پندرہ سولہ کانٹریکٹرز کا شفاف طریقے سے انتخاب کیا گیا اور بیک وقت کئی مقامات پر کام شروع کروایا گیا۔ منصوبے پر کام کا عملی طور پر آغاز 28 اپریل 2002ء کو ہوا اور جنرل پرویز مشرف نے کراچی یونیورسٹی کے سامنے ایک پروقار تقریب میں اس کا سنگ بنیاد رکھا۔

کے تھری منصوبے پر تیز رفتاری سے کام جاری رہا اور میری نظامت کے اختتام یعنی 30 جون 2005ء تک اس پر 95 فیصد کام ہو چکا تھا۔ 31 مئی 2006ء کو صدر پرویز مشرف نے اس میگا پراجیکٹ کا باقاعدہ افتتاح کیا اور کراچی کے شہریوں کو مزید

100 ملین گیلن پانی روزانہ کی فراہمی شروع ہوگئی۔

کےتھری کی تکمیل سے پہلے کراچی کو دریائے سندھ سے 480 ملین گیلن پانی روزانہ ملا کرتا تھا، جبکہ حب ڈیم سے نہر کی ٹوٹ پھوٹ کی وجہ سے 30 سے 35 ملین گیلن ہی مل پارہا تھا جبکہ استعداد 80 تا 100 ایم جی ڈی تھی۔ 2002ء میں میری ہدایت پر انڈس ریور سسٹم سے مزید 650 ملین گیلن پانی کے حصول کے لیے کےفور منصوبے کا پی سی ون تیار ہوا جس کی باقاعدہ منظوری حکومت سندھ نے 2003ء میں دی۔

مختلف اقدامات کے حوصلہ افزا نتائج دیکھ کر آپس میں مشاورت کی کہ کرپشن اور مالی بے ضابطگیوں کی روک تھام سمیت وہ تمام اقدامات کیے جائیں جن سے شہری حکومت کی آمدنی بہتر ہو، اور اس کی ابتدا اپنی ذات سے کی جائے۔ نظامت سنبھالے ابھی کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ ایک افسر فائل ہاتھ میں لیے میرے کمرے میں داخل ہوئے اور کہنے لگے کہ سر اس پر دستخط کردیں۔ دیکھا تو سٹی ناظم کے صوابدیدی فنڈ کی فائل ہے۔ سالانہ بجٹ میں سے یہ مخصوص رقم سٹی گورنمنٹ کے ملازمین کو قرض دینے کے لیے مختص کی گئی تھی، اور اس کی تقسیم کا طریقہ یہ تھا کہ 30 فیصد رقم ناظم کی مرضی سے، جبکہ باقی رقم قرعہ اندازی کے ذریعے تقسیم کی جاتی تھی۔ جو صاحب میرے پاس فائل لے کر آئے، اُن سے کہا کہ آج سے ناظم کا صوابدیدی فنڈ ختم کریں اور کُل رقم کی تقسیم کے لیے قرعہ اندازی کروائیں۔ پھر مسلم پرویز سے کہا کہ اس صوابدیدی اختیار کو مستقل بنیادوں پر ختم کرنے کے لیے کونسل میں قرارداد لے کر آئیں اور منظور کروائیں۔ بدقسمتی سے ہر تھوڑے دنوں کے بعد کسی نہ کسی پراجیکٹ میں کوئی بدعنوانی یا بے قاعدگی سامنے آجاتی۔ کوآرڈی نیشن کمیٹی کے ساتھی آگاہ کرتے اور مسئلے کے حل کی تجاویز بھی دیتے۔ بروقت اقدامات سے بہت سارے فوائد حاصل ہوئے جیسے بھینس کالونی میں بیرون شہر سے مویشی لائے جانے پر انٹرنس کا ٹھیکہ!!

شہری حکومت کے اس شعبے کے ذمہ دار افسر نے اپنا دفتر بھی بھینس کالونی میں قائم

کر رکھا تھا۔ روزانہ کتنے جانور آ رہے ہیں؟ اور کتنی رقم وصول کی جا رہی ہے؟ صرف انہی کے علم میں تھا۔ بس اتنا پتا تھا کہ سال کے آخر میں 20 سے 25 لاکھ روپے انٹری فیس کی مد میں شہری حکومت کو ملتے ہیں۔ ایک کمیٹی بنائی اور سروے کروایا تو اندازہ ہوا کہ بھینس کالونی میں آنے والے مویشیوں میں نصف سے بھی کم تعداد کی فیس شہری حکومت کو مل رہی ہے۔ یہ نظام سال ہا سال سے چل رہا تھا۔ فیصلہ کیا گیا کہ اگلے برس کے لیے انٹری فیس کے ٹھیکے کے لیے نیلامی ہوگی اور منتخب نمائندوں کی نگرانی میں ہوگی۔ ٹھیکے کی کھلی نیلامی کی آخری پیش کش ایک کروڑ 20 لاکھ روپے آئی۔ کامیاب ہونے والے کو ٹھیکہ پیر دکر دیا گیا۔

میں نے ابتدا میں ہی طے کر لیا تھا کہ ذاتی اخراجات کم سے کم رکھوں گا۔ آمد ورفت کے لیے کسی بڑے لاؤ لشکر کے بجائے ایک کار کو استعمال کیا۔ کوشش یہ ہوتی تھی پروٹوکول کے نام پر گاڑیوں کا قافلہ میرے ساتھ نہ ہی چلے تو بہتر ہے، کیوں کہ اس طرح ڈرائیورز کی تنخواہیں اور پیٹرول کے اخراجات حکومت کو برداشت کرنا پڑتے تھے۔ اکثر اوقات اپنے ذاتی ڈرائیور کے ہمراہ جو گزشتہ کئی برس سے میرے ساتھ ہے، دفتر چلا جاتا۔ اگلے مرحلے میں افسران کی گاڑیوں کے لیے جاری ہونے والے پیٹرول کے لیے بھی قاعدہ مرتب کروایا گیا جس سے اس مد میں خاطر خواہ بچت ہوئی۔ ابتدائی معاملات کی درستی کے ساتھ ترقیاتی کاموں کی طرف توجہ دی اور اس سلسلے میں ڈرگ روڈ سے ڈرائیو ان سینما تک راشد منہاس روڈ فیز I کی تعمیر کا آغاز کیا گیا۔ ہم نے طے کیا تھا کہ اب جو بھی بڑی سڑک بنے گی وہ امریکن کوالٹی اسٹینڈرڈز AASHTO کے مطابق بنائی جائے گی۔

یہ سڑکوں کی تعمیر کا تسلیم شدہ بین الاقوامی معیار ہے۔ اس طریقہ کار میں سڑک کی تین سطحیں ہوتی ہیں۔ بیس، سب بیس اور اوپری تہہ، اور ساتھ ہی برساتی نالے کے لیے سروس کوریڈور کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ یوٹیلٹی سروسز کی لائنوں کو بھی ایک جگہ اکٹھا کیا جاتا ہے، اس لیے اگر عام سڑک پر 30 لاکھ روپے فی کلومیٹر خرچ آتا ہے تو AASHTO معیار کے

مطابق بنائی جانے والی سڑک پر دو گنا سے زائد خرچ آتا ہے۔ عام سڑک بمشکل تین سے چار سال گزار سکتی ہے، جب کہ یہ سڑکیں پندرہ سے بیس سال تک بڑی ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہیں ہوتیں۔ راشد منہاس روڈ کی تعمیر کے معیار کو صحافیوں نے دیکھا اور اس کی تعریف کی۔

کارساز روڈ کی تعمیر جاری تھی، درمیان میں اسلحے کی نمائش (IDEAS) کا وقت آ گیا، چونکہ ایکسپو سینٹر کے لیے آمد و رفت اسی راستے سے ہوتی تھی اور وقت بہت کم رہ گیا تھا، اس لیے ٹھیکیدار نے جلد کام مکمل کرنے کے لیے تارکول زیادہ جلا دیا اور جیسے تیسے سڑک بنا دی۔ اس طریقے سے تارکول میں چپکنے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔ اس وقت تو مجبوراً برداشت کیا گیا، لیکن نمائش مکمل ہوتے ہی سڑک دوبارہ توڑ کر از سرِ نو تعمیر کروائی گئی۔ اس معاملے میں ہماری ٹیم میں شامل پاکستان انجینئرز فورم کے ارکان، منتخب نمائندے اور افسران سب کا کردار سراہے جانے کے قابل ہے کہ سب ایک ویژن کے تحت کام کر رہے تھے، اور ترقیاتی کاموں کے معیار پر کوئی سمجھوتا نہ کرنے کا عزم مصمم تھا۔

مسائل، وسائل اور مختلف چیلنجز کے سمندر میں تیز رفتاری سے آگے بڑھتی ہوئی ناؤ کچھ عرصے بعد اس وقت منجدھار میں پھنس گئی جب صدر پرویز مشرف نے ملک میں ریفرنڈم کروانے کا فیصلہ کیا۔ اطلاعات تو مل رہی تھیں کہ صدر پرویز مشرف ریفرنڈم میں حمایت کے لیے ناظمین کو استعمال کرنا چاہتے ہیں، لیکن میں نے ان خبروں پر کوئی خاص توجہ نہیں دی اور کوئی پروا کیے بغیر اپنے کاموں میں مصروف رہا۔ کچھ دنوں بعد پیغام ملا کہ "اسلام آباد تشریف لائیے۔ صدر نے پاکستان بھر سے ناظمین کو دارالحکومت بلوایا ہے"۔ وہاں پہنچ کر دیکھا تو سماں ہی کچھ اور تھا۔ کیا سیاسی، کیا غیر سیاسی... سارے ناظمین ایک ہی صف میں کھڑے تھے۔ میٹنگ میں پروگرام کے مطابق صرف پرویز مشرف کو تقریر کرنی تھی، اس لیے مائیک سنبھالتے ہی بغیر کسی تمہید کے اپنے مطلب پر آئے اور پُراعتماد لہجے میں کہنے لگے: "آپ لوگ جن جن شہروں سے آئے ہیں وہ میرا حلقۂ انتخاب

فہرست پر جائیے

ہیں، اس لیے ریفرنڈم میں آپ حضرات میرے لیے حمایت کی مہم چلائیں گے"۔ اسی طرح کی چند باتیں انہوں نے مزید کہیں اور خطاب مکمل کر کے فوراً وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ناظمین واپس اپنے شہروں کو چلے گئے۔ کراچی پہنچتے ہی میں سیدھا گورنر ہاؤس گیا محمد میاں سومرو سے ملاقات کی اور صاف لفظوں میں کہا کہ آپ وفاق کے نمائندے ہیں اس لیے یہ معاملہ آپ کے علم میں لانا ضروری سمجھا کہ صدر مشرف نے اسلام آباد میں پاکستان کے تمام ناظمین کو بلوا کر ریفرنڈم میں حمایت کرنے کے لیے کہا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس ریفرنڈم مہم کے سلسلے میں پاکستان کے تمام بڑے شہروں میں جلسے ہوں گے اور اسٹیج پر صدر کے ساتھ مقامی ناظم کو بھی بیٹھنا پڑے گا۔ اب جب کہ میں نظامت کا ابتدائی عرصہ مکمل کر چکا ہوں تو اچانک پولیٹکل ناظم کی حیثیت اختیار کرلوں، یہ میرے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ میرے لہجے کے قطعی انداز کو سومرو صاحب نے محسوس کرلیا۔ کہنے لگے: "اس وقت آپ غصے میں ہیں اور جذباتی ہو رہے ہیں۔ اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے"۔ وہ اپنے تئیں یہ گمان کر رہے تھے کہ کچھ وقت گزرنے کے بعد صورت حال تبدیل ہو جائے گی۔ جوں جوں ریفرنڈم کا وقت نزدیک آ رہا تھا، مجھ پر اس کی حمایت کے لیے دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ گورنر محمد میاں سومرو اور چیف سیکریٹری بھی اپنے اپنے انداز میں اصرار کر رہے تھے۔ ریفرنڈم سے کچھ دنوں پہلے نیشنل اسٹیڈیم میں ایک کرکٹ میچ ہو رہا تھا۔ بحیثیت سٹی ناظم مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ میچ کے اختتام پر کور کمانڈر کراچی طارق وسیم غازی سے آمنا سامنا ہو گیا۔ رسمی سلام دعا کے بعد کہنے لگے: "نعمت صاحب! کل میرے دفتر تشریف لائیے، ساتھ چائے پیتے ہیں"۔ اگلے روز ان کے دفتر پہنچا۔ ملاقات ہوئی تو طارق وسیم غازی نے پہلے تو ادھر ادھر کی باتیں کیں، پھر اچانک گفتگو کا رخ تبدیل کرتے ہوئے کہنے لگے: "نعمت صاحب! ہم نے سنا ہے آپ ریفرنڈم کی حمایت سے گریزاں ہیں"۔ "جی! آپ نے بالکل درست سنا ہے"۔ میں نے انہیں جواب دیا۔ "یہ بات میرے ضمیر کے خلاف ہے

کہ میں غیر سیاسی ناظم ہو کر صدر کو سیاسی بنیادیں فراہم کروں۔ محض اصول کی خاطر جماعت اسلامی سے 40 سالہ وابستگی کے باوجود امارت سے استعفیٰ دے دیا، جب کہ اس سسٹم میں میری مدت تو محض چار سالہ ہے"۔ یہ باتیں سن کر طارق وسیم غازی کہنے لگے: "پھر ہمیں سوچنا پڑے گا کہ ایسے ناظمین جو ریفرنڈم میں ہمارے ساتھ تعاون نہیں کر رہے ہیں انہیں کس طرح فارغ کیا جائے!" میں نے طارق وسیم غازی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا I can give you my resignation right now....." آپ کو مجھے فارغ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میں ابھی استعفیٰ دے دیتا ہوں"۔ اس بات پر کور کمانڈر ٹپٹا گئے، فوراً بات سنبھالتے ہوئے کہنے لگے: "آپ میری بات سمجھے نہیں، میرے کہنے کا مطلب کچھ اور تھا"۔ "آپ نے جو بات کہی، اس کا یہی جواب تھا" میں نے کہا۔ ماحول کی تلخی کو دور کرنے کے لیے کہنے لگے: "آپ جذباتی ہو رہے ہیں۔ آرام سے اس بارے میں سوچیے گا"۔ ہماری ملاقات تو ختم ہو گئی لیکن مسئلہ اپنی جگہ جوں کا توں رہا، بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ مجھے ٹھنڈے دماغ سے فیصلہ کرنے کا مشورہ دینے والے خود بوکھلاہٹ کا شکار ہو گئے اور مضحکہ خیز حرکتیں کرنے لگے۔ انہی دنوں کا واقعہ ہے کہ تہران کی سٹی کونسل نے دورے کی دعوت دی جو میں نے قبول کر لی۔ اس بات کا علم صوبائی حکومت کو ہوا تو انہوں نے ریفرنڈم کی حمایت نہ کرنے کی "پاداش" میں این او سی جاری کرنے سے انکار کر دیا۔ این او سی جاری کرنے کا اختیار صوبائی حکومت کے پاس تھا۔ میں نے بھی کہا: ٹھیک ہے آپ مجھے اجازت نہیں دے رہے تو میں نہیں جاتا۔ حکومت ایران نے مجھے مہمان کی حیثیت سے بلایا تھا اس لیے دورے پر جا رہا تھا، ورنہ مجھے کوئی شوق نہیں تھا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ چند ہی دنوں بعد ریفرنڈم کے سلسلے میں ایک جلسۂ عام منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ مجوزہ پروگرام کے متعلق پتا چلا کہ اسٹیج پر صدر پاکستان پرویز مشرف کے ساتھ سٹی ناظم کی حیثیت سے مجھے بھی بیٹھنا ہوگا، جب کہ ریفرنڈم کے بارے میں میری رائے صوبائی اور

وفاقی حکومت کے ذمہ داران پہلے سے جانتے تھے کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے میں جلسے میں شرکت نہیں کروں گا۔ انہیں خدشہ لاحق ہو گیا کہ ناظم کراچی شہر میں موجود بھی ہوں اور اسٹیج پر موجود نہ ہوں تو خواہ مخواہ سبکی ہو گی، پھر میڈیا والے ایشو بنائیں گے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ مجھے ایران جانے کی اجازت دے دی جائے۔ پھر ایک رات گورنر سندھ میاں محمد سومرو بغیر کسی پروٹوکول کے میرے گھر آئے، رسمی سلام دعا کے بعد کہنے لگے: "ریفرنڈم کے سلسلے میں گورنر ہاؤس میں صدر پرویز مشرف کے ساتھ ایک میٹنگ رکھی ہے۔ اس میں پورے صوبے کے تحصیل و سٹی ناظمین شرکت کریں گے۔ لہٰذا آپ ضرور تشریف لائیے گا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ وہ کچھ دیر رکے اور رخصت ہوتے وقت پھر یاد دہانی کرائی۔ اُس وقت تک پورے صوبے بلکہ پاکستان کے اکثر ناظمین کے علم میں یہ بات آ گئی تھی کہ میں ریفرنڈم کی حمایت نہیں کر رہا۔ خیر! مقررہ دن ناظمین کی میٹنگ میں شرکت کے لیے گورنر ہاؤس پہنچا تو وہاں پہلے سے موجود ناظمین نے دیکھتے ہی نعرے لگائے "ناظم صاحب آ گئے۔ ناظم صاحب آ گئے"۔ غالباً انہوں نے گمان کیا کہ ریفرنڈم کی حمایت پر میرے اور صدر مشرف کے درمیان کوئی ڈیل ہو گئی ہے۔ دوسری طرف پروگرام کے منتظمین کا خیال تھا کہ میں اپنی رائے کی وجہ سے پروگرام میں شرکت نہیں کروں گا۔ اس لیے اسٹیج پر میرے بیٹھنے کے لیے کرسی موجود نہیں تھی۔ فوراً کرسی رکھوائی گئی۔ پروگرام کا آغاز ہوا۔ صدر مشرف نے ریفرنڈم کے ثمرات پر ایک مفصل تقریر کی۔ اس کے بعد سوالات کا سیشن شروع ہوا۔ درمیان میں کسی نے سوال کی پرچی بھیجی تو صدر مشرف نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا: نعمت اللہ صاحب اس سوال کا جواب دیں گے۔ اور پرچی میری جانب بڑھا دی۔ سوال کا جواب دیا۔ پروگرام تھوڑی دیر مزید جاری رہا۔ اختتام پر میں اپنے سیکریٹری اور سٹی کونسلر توصیف کے ہمراہ اجلاس والے کمرے سے باہر جانے کے لیے تیز قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا، کیوں کہ تہران کی فلائٹ کا وقت بھی نزدیک تھا۔ ابھی چند قدم ہی آگے

بڑھا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی "نعمت صاحب، نعمت صاحب!" پیچھے مڑ کر دیکھا تو گورنر سندھ کے پرنسپل سیکریٹری بریگیڈیئر اختر ضامن مجھے روکنے کے لیے آوازیں لگا رہے تھے۔ تیزی سے میرے نزدیک پہنچے اور بغیر کچھ کہے ہاتھ پکڑ کر مجھے دوسرے دروازے پر لے آئے جہاں پرویز مشرف کو ناظمین سے ملاقات کرتے ہوئے رخصت ہونا تھا۔ غالباً ان کی شدید خواہش تھی کہ اس آخری موقع پر ریفرنڈم کی حمایت کی کوئی صورت بن جائے۔ لیکن صدر مشرف ملاقات کر کے چلے گئے، میرا ارادہ بدستور برقرار رہا۔ اس لیے پرنسپل سیکریٹری کی آخری کوشش بھی رائیگاں چلی گئی۔ ان کے رخصت ہوتے ہی میں بھی سیدھا ایئرپورٹ پہنچا اور ایران کے لیے روانہ ہوگیا۔ وہاں تقریباً دس دن قیام کیا۔ اس دوران تہران سٹی کونسل کے میزبانوں نے غیر معمولی انداز سے میزبانی کی، اور سب لوگوں کی طرف سے بے انتہا محبت اور عزت دی گئی۔ پروگرام کے اختتام پر مختلف تاریخی مقامات بالخصوص مشہد کے دورے کا خصوصی اہتمام کیا گیا۔ واپس آیا تو پتا چلا کہ ریفرنڈم میں سوائے میرے پاکستان کے تمام ناظمین پرویز مشرف کے دست و بازو بنے ہوئے تھے۔ ریفرنڈم میں ایک اصولی موقف اپنانے اور اس پر جمے رہنے کی وجہ سے جماعت کے کچھ حلقوں میں میرے متعلق قائم یہ تاثر بھی ختم ہوگیا کہ میں نظامت کے عہدے کی وجہ سے پرویز مشرف کی بے جا حمایت کرتا ہوں۔ جبکہ اصل بات یہ تھی کہ پرویز مشرف میری نظر میں کراچی کی ترقی کے خواہاں تھے۔ ابتدا میں متحدہ اور الطاف حسین کی طرزِ سیاست کے سخت مخالف تھے لیکن 2002ء کے الیکشن کے بعد نامعلوم وجوہات کی بنا پر وہ کراچی کی تباہی کے سب سے بڑے ذمہ داروں کے سب سے بڑے سرپرست بن گئے۔

ریفرنڈم کے چند ماہ بعد اسلام آباد میں پرویز مشرف کے ساتھ ایک میٹنگ ہوئی۔ بعد میں ان سے ون ٹو ون ملاقات ہوئی تو مسکراتے ہوئے کہنے لگے: "نعمت صاحب! آپ نے تو ریفرنڈم میں میری مخالفت کی تھی۔ آپ کا تعلق جماعت اسلامی سے ہے اس وجہ سے

تا!" میں نے جواب دیا: "یہ فیصلہ میرے ضمیر کے خلاف تھا اس لیے حمایت کرنا ممکن نہیں تھا"۔ اس پر پرویز مشرف قدرے بے تکلفی سے کہنے لگے: "ارے! چھوڑیے ان باتوں کو، میں تو مذاق کر رہا تھا۔ میں ان باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔"

10 اکتوبر 2002ء کو ملک میں عام انتخابات منعقد ہوئے۔ جماعت اسلامی، جمعیت علمائے اسلام اور جمعیت علمائے پاکستان اور چند دیگر مذہبی جماعتوں نے ان انتخابات میں متحدہ مجلس عمل کے پلیٹ فارم سے حصہ لیا، جس کا انتخابی نشان کتاب تھا۔ افغانستان پر امریکی حملے کے بعد لوگوں میں بہت غم و غصہ تھا اور ان کی بڑی تعداد یہ سمجھ رہی تھی کہ امریکہ اور مغربی ممالک مسلمانوں کو دہشت گرد اور شدت پسند قرار دے کر تباہ کرنا چاہتے ہیں جیسا کہ افغانستان کے ساتھ کیا گیا ہے اور ماضی میں عراق پر جھوٹے الزامات لگا کر اسے تباہ کیا جا چکا ہے۔ کراچی میں 178 یونین کونسلوں، 18 ٹاونز اور سٹی گورنمنٹ کے تحت گزشتہ ایک سال میں ہونے والے ترقیاتی کاموں کا بھی لوگوں پر بہت اچھا اثر ہوا تھا۔ ان کے مسائل کے حل کے لیے گلی محلوں میں منتخب نمائندے موجود تھے جو باآسانی ان کی دسترس میں تھے۔ سچ یہ ہے کہ لوگ متحدہ کی طرز سیاست سے پریشان تھے لیکن ان کے سامنے کوئی متبادل بھی نہیں تھا اور انہیں یہ یقین بھی نہیں تھا کہ ہم جس پارٹی کو ووٹ دیں گے، نتیجہ بھی اسی کے حق میں سنایا جائے گا اور پولنگ پرامن انداز میں ہوگی۔

اکتوبر 2002ء کے الیکشن سے پہلے ماحول خاصا بہتر ہو چکا تھا۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے آزادانہ ماحول میں ووٹ ڈالے۔ گو کہ سہ پہر تین بجے کے بعد کئی جگہوں پر دھاندلی کا بازار گرم کر دیا گیا، لیکن اُس وقت تک کئی حلقوں میں صورت حال واضح ہو چکی تھی۔

میڈیا کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اہل کراچی نے متحدہ کو کئی حلقوں میں مسترد کر دیا ہے۔ کراچی میں مجلس عمل نے قومی و صوبائی اسمبلی کی کئی نشستیں جیت لیں۔ جماعت اسلامی کے

رہنما محمد حسین محنتی، عبدالستار افغانی، اسداللہ بھٹو اور لئیق خان رکن قومی اسمبلی، جبکہ نصراللہ شجیع، یونس بارائی اور حمیداللہ خان رکن صوبائی اسمبلی منتخب ہو گئے۔ کئی حلقوں میں ہمارے امیدوار بہت کم ووٹ سے ہارے بلکہ ہروائے گئے، کیونکہ شام کے وقت متحدہ نے اپنے روایتی طور طریقے اپنا کر پولنگ اسٹیشنز پر قبضے کر لیے تھے اور پولنگ کے عملے کو یرغمال بنا کر من مانے نتائج جاری کروانے لگے تھے۔

سندھ اسمبلی میں پیپلز پارٹی نے سب سے زیادہ نشستیں حاصل کیں لیکن پس پردہ قوتوں نے کچھ اراکین اسمبلی کے ضمیروں کا سودا کر کے اکثریتی پارٹی کو اقتدار سے محروم رکھا، اور متحدہ اور کچھ دیگر گروپوں کو ملا کر اکثریت حاصل کر لی گئی۔ علی محمد مہر وزیر اعلیٰ بنا دیے گئے۔

یہاں سے نئے انداز کے مسائل کا آغاز ہو گیا۔ متحدہ قومی موومنٹ نے من پسند وزارتیں حاصل کر کے شہری حکومت کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنا شروع کر دیں۔

تعمیر کراچی پروگرام

تباہ حال شہر کی از سر نو صورت گری کرتے ہوئے ابھی ایک برس مکمل کیا تھا اور دوسرے سال کی منصوبہ بندی کر رہے تھے کہ خوفناک بارش نے شہر کے بوسیدہ انفرا اسٹرکچر کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔ کئی قیمتی جانیں بھی ضائع ہوئیں۔ اخبارات کے ذریعے نقصانات، اور تباہ حال سڑکوں و گلیوں کی تصاویر عوام و خواص تک پہنچیں تو صدر پرویز مشرف کراچی آئے۔ انہوں نے گورنر ہاؤس میں بارش سے پیدا ہونے والی صورت حال کے جائزے کے لیے اجلاس طلب کیا۔ گورنر سندھ عشرت العباد اور میرے علاوہ مختلف محکموں کے افسران بھی شامل تھے۔ پرویز مشرف نے معلومات حاصل کیں۔ پوچھا یہ نوبت کیوں کر پیش آگئی کہ سارا شہر بارش کی وجہ سے درہم برہم ہو گیا؟ مشکلات کا ذکر آیا۔ افسران نے وسائل کی قلت کا رونا روتے ہوئے مسائل کا ذکر کیا۔ کچھ نے تجاویز پیش کیں۔ اس کے علاوہ اور بہت ساری باتیں ہوئیں۔ سب لوگوں کی گفتگو سن کر اجلاس کے آخر میں صدر پرویز مشرف نے کوئی حتمی بات کرنے کی بجائے کہا: "میں کراچی کا بذریعہ سڑک تفصیلی دورہ کرنا چاہتا ہوں"۔ اس اجلاس سے پہلے سے میرے ذہن میں یہ بات موجود تھی کہ کئی وفاقی ادارے کراچی کی زمین، بندرگاہ اور انفرا اسٹرکچر استعمال کرتے ہیں، لیکن اس شہر کی تعمیر و ترقی کے لیے دھیلا خرچ کرنے کے روادار نہیں ہیں۔ اگر تمام ادارے اپنی جانب سے تھوڑا تھوڑا حصہ شامل کریں تو صورت حال بہت بہتر ہو سکتی ہے۔ اس لیے کوئی ایسا قاعدہ مرتب ہونا چاہیے کہ ان اداروں کے سربراہان پابند ہوں کہ وہ حاصل ہونے والی آمدنی کا کچھ حصہ

کراچی کی تعمیر و ترقی کے لیے خرچ کریں۔ گو کہ یہ سوچ میری تھی، لیکن اس خاکے میں رنگ بھرنے کی تجویز واٹر بورڈ کے ایم ڈی جاوید اشرف نے پیش کی تھی۔ ایک موقع پر انہوں نے مجھ سے کہا: "آپ کراچی پورٹ ٹرسٹ سے پیسے کیوں نہیں لیتے؟" وہ چونکہ خود بھی کے پی ٹی میں رہ چکے تھے اس لیے ادارے کے مالی حالات سے آگاہ تھے۔ کہنے لگے کہ کے پی ٹی کے پاس 20 ارب روپے کی اضافی رقم موجود ہے۔ تھوڑی کوشش کریں، زیادہ نہ سہی تین چار ارب روپے تو شہر کی تعمیر و ترقی کے لیے حاصل کریں۔ جاوید اشرف کی تجویز عمدہ تھی، ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ اسٹیک ہولڈر تو بہت سارے ہیں، پیسے صرف کے پی ٹی سے کیوں لیے جائیں، باقی اداروں سے بھی کیوں نہیں؟ اس دوران صدر پرویز مشرف کے دوبارہ کراچی آنے کا پروگرام بن گیا۔ ابھی ان کے کراچی آنے میں کچھ دن تھے کہ اس سے پہلے وزیر اعظم میر ظفر اللہ خان جمالی کراچی آئے۔ گورنر اور وزیر اعلیٰ کے ساتھ میں بھی ان کے استقبال کے لیے ایئر پورٹ پہنچا۔ وہ خصوصی طیارے سے باہر نکلے تو پہلے سے موجود ایک ہیلی کاپٹر میں وزیر اعظم ظفر اللہ جمالی اور میں سوار ہوئے اور دوسرے ہیلی کاپٹر میں گورنر سندھ اور وزیر اعلیٰ۔ کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹے تک بارش کی تباہ کاریوں کا فضائی جائزہ لیا۔ وزیر اعظم کراچی کی صورت حال پر افسوس تو کرتے رہے لیکن ہماری توقع کے برخلاف کسی پیکیج کا اعلان نہیں کیا۔ دورہ مکمل کر کے وہ واپس اسلام آباد چلے گئے۔ اور کوئی ایک ہفتے بعد پرویز مشرف دوبارہ کراچی آ گئے۔ اس مرتبہ شہر کا زمینی دورہ ان کے پروگرام میں شامل تھا۔ اگلے دن دورے کا آغاز گورنر ہاؤس سے ہونا تھا، اس لیے صبح سویرے اپنی تیاریاں مکمل کیں۔ ملاقات کے دوران جو باتیں پرویز مشرف سے کرنی تھیں انہیں ذہن میں تازہ کر لیا۔ صبح 9 بجے گورنر ہاؤس پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر بعد پرویز مشرف بھی وہاں پہنچ گئے۔ اُس وقت ان کی سیکورٹی اتنی سخت نہیں تھی جتنی اُن پر ہونے والے خودکش قاتلانہ حملے کے بعد ہوئی۔ تمام لوگ اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ میں

پرویز مشرف کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی میں صدر مشرف اور میرے علاوہ صرف ان کا اے ڈی سی تھا۔ قافلہ پہلے مولوی تمیز الدین خان روڈ پہنچا، وہاں صورت حال کا جائزہ لے کر پی آئی ڈی سی ہاؤس سے ہوتے ہوئے شارع فیصل پہنچے۔ وہاں سے جب COD کو عبور کرتے ہوئے نوتعمیر شدہ راشد منہاس روڈ پہنچے تو صدر مشرف دیگر شاہراہوں کی نسبت اس کی پختگی بہت بہتر دیکھ کر بڑے خوش ہوئے۔

میں نے ان سے کہا کہ شہر میں کراچی پورٹ ٹرسٹ، پی آئی اے، اسٹیل ملز اور ریلوے سمیت کئی وفاقی ادارے موجود ہیں۔ ہماری اطلاع کے مطابق صرف کے پی ٹی کے پاس 20 ارب روپے موجود ہیں۔ میں نے ان اداروں کے سربراہان کو توجہ دلانے کے لیے پریس کانفرنس کی، مختلف اپیلیں کیں، اخبارات میں بیانات دیے لیکن کوئی کراچی پر ایک روپیہ خرچ کرنے کو بھی تیار نہیں ہے۔ اس پر صدر مشرف کہنے لگے: "آپ نے ان اداروں کے سربراہان سے براہ راست بات کی؟" میں نے جواب دیا: "لوگ نہ میری بات مانتے ہیں، نہ مانیں گے"۔ "بھلا وہ کیوں؟" پرویز مشرف نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ان کی بات پر میں نے کہا: "آپ پوچھتے ہیں تو صاف صاف بتاتا ہوں کہ کسی ادارے کا سربراہ بریگیڈیئر ہے، تو کسی ادارے کا سربراہ میجر جنرل، کسی آرگنائزیشن کا سربراہ ایڈمرل ہے تو کسی ادارے کا نگراں کرنل... یہ لوگ میری بات کیوں سنیں گے؟" یہ سن کر انہوں نے لمبی سی ہوں بھری، پھر کہنے لگے: "اچھا! میں ایک ہفتے بعد دوبارہ کراچی آؤں گا اور اس مسئلے کو بھی حل کرتا ہوں"۔ اس دوران ایک مفصل بریفنگ تیار کی گئی۔ اظہار الحق، سلیم اظہر اور ڈی سی او میر حسین علی نے دو روز تک صبح سے لے کر رات گئے تک اس پر کام کیا اور مختلف محکموں کے ای ڈی اوز سے تجاویز لے کر انہیں حتمی شکل دی۔ ہم نے تمام ٹاؤن ناظمین سے بھی تجاویز لے کر ان سب کو مرتب کیا۔ پرویز مشرف پروگرام کے مطابق کراچی پہنچ گئے اور گورنر ہاؤس میں اجلاس طلب کرلیا۔ وہیں پر مختلف

اداروں کے سربراہان کو بھی طلب کرلیا گیا۔ اجلاس میں ہم نے "تعمیر کراچی" کے نام سے پیش کی جانے والی بریفنگ میں صدر مشرف کو بتایا کہ ملک کو 70 فیصد ریونیو دینے والے اس شہر کے انفرا اسٹرکچر کی بحالی پر ہمارے تخمینے کے مطابق 29 ارب روپے خرچ ہوں گے۔ انہیں ایک ایک پراجیکٹ کے متعلق بڑی تفصیل سے بتایا۔ صدر مشرف بغور دیکھتے اور سنتے رہے اور اس منصوبے کو سراہتے ہوئے کہنے لگے: "مجھے نعمت اللہ صاحب کا آئیڈیا پسند آیا۔ کراچی کے گمبھیر مسائل سے مجھ سمیت ہر شخص واقف ہے۔ اور یہ تعمیر کراچی پروگرام شہر کی ترقی کے لیے بہت مددگار ثابت ہوگا"۔ انہوں نے اس پروگرام کی منظوری دے دی جس کے مطابق 29 ارب روپے کے ترقیاتی پیکیج میں وفاقی حکومت 8 ارب روپے، صوبائی حکومت 3 ارب روپے، شہری حکومت 6 ارب روپے اور دیگر اسٹیک ہولڈرز 12 ارب روپے دینے کے پابند تھے۔ تعمیر کراچی پروگرام میں فوری، درمیانی اور طویل المدتی پراجیکٹس شامل تھے، جنہیں ایک سے چار سال میں مکمل کیا جانا تھا۔ تعمیر کراچی پروگرام کی تکمیل کے لیے منصوبوں کی تقسیم زونز کی سطح پر کی گئی تھی۔

زون ا، بن قاسم، گڈاپ اور لانڈھی ٹاؤن، پاکستان اسٹیل، پورٹ قاسم اتھارٹی اور ایکسپورٹ پروسیسنگ زون پر مشتمل تھا۔ ان اداروں کے ذمے قائد آباد جنکشن پر 8 کروڑ روپے لاگت کے فلائی اوور کی تعمیر، پورٹ قاسم تا پاکستان ریفائنری براستہ ابراہیم حیدری سڑک کی 20 کروڑ روپے کی لاگت سے تعمیر، کراچی کے لیے سالڈ ویسٹ مینجمنٹ کا منصوبہ ایک ارب دس کروڑ روپے، اور مہران ہائی وے کے بقیہ کام کی 5 کروڑ روپے سے تکمیل تھی۔ زون II ملیر ٹاؤن، شاہ فیصل اور گلشن اقبال ٹاؤن پر مشتمل تھا، ان کے ساتھ سول ایوی ایشن اتھارٹی، پی آئی اے، ملٹری لینڈ اینڈ کینٹ اور نیشنل لاجسٹک سیل (وزارت دفاع) تھے۔ ان اداروں کے ذمے 65 کروڑ روپے کی لاگت سے دھابیجی پاور پلانٹ کی تعمیر، ملیر میں 30 کروڑ سے سڑکوں کی تعمیر، فارم سے مارکیٹوں تک جانے

والی سڑکوں کی 20 کروڑ روپے سے تعمیر، شاہ فیصل کالونی کے نزدیک ملیر ریور برج کی تعمیر، اور یونیورسٹی روڈ کی 30 کروڑ روپے سے تعمیر تھی۔ زون III سائٹ، اورنگی، بلدیہ، گلبرگ، لیاقت آباد، نارتھ ناظم آباد، اور نارتھ کراچی ٹاؤنز پر مشتمل تھا۔ ان کے ساتھ سائٹ ایسوسی ایشن آف انڈسٹریز اور پاکستان ریلوے شامل تھے۔ ان اداروں کو شاہراہ پاکستان اور شاہراہ اورنگی کو بالترتیب 60 کروڑ اور 50 کروڑ روپے کی لاگت سے ازسرِنو تعمیر کرنا تھا۔ 40 کروڑ کی لاگت سے میونسپل اینڈ لینڈ فل سائٹ کو ٹھیک کرنا تھا۔ اور اس کے علاوہ 50 کروڑ روپے سے سیوریج ٹریٹمنٹ پلانٹ کی تنصیب کرنی تھی۔ زون IV میں کورنگی، صدر، جمشید، کیماڑی اور لیاری ٹاؤن شامل تھے۔ ان ٹاؤنز میں تعمیر و ترقی کے لیے کراچی پورٹ ٹرسٹ (وزارت مواصلات)، آئل کمپنیز (وزارت پیٹرولیم)، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، اسٹیٹ بینک، جینکس (وزارت تجارت) اور منسٹری آف ورکس شامل تھے۔ ان کے ذمے کورنگی روڈ پر ملیر ندی پر 30 کروڑ سے پل کی تعمیر، ٹینو چورنگی قیوم آباد فلائی اوور کی 20 کروڑ روپے سے تعمیر، 45 کروڑ روپے سے شاہراہ غالب کو بنانا، 20 کروڑ روپے سے ایمرجنسی رسپانس سینٹر کا قیام، ایم اے جناح روڈ، مولوی تمیز الدین خان روڈ اور آئی آئی چندریگر روڈ کی 54 کروڑ سے ازسرِنو تعمیر، ایک ارب روپے مالیت کی مشینری اور دیگر ساز و سامان کی خریداری، 90 کروڑ روپے سے ڈی سیلی نیشن پلانٹ کی تنصیب، ملیر اور لیاری ندی کی بحالی پر ایک ارب 20 کروڑ خرچ کرنا تھا۔ زون V میں کورنگی، لانڈھی، فیڈرل بی ایریا اور نارتھ کراچی کے صنعتی علاقوں کو شامل کیا گیا تھا۔ ان کے ساتھ ایکسپورٹ پروموشن بیورو کو معاونت کرنی تھی۔ ان کے ذمے مذکورہ صنعتی علاقوں میں سیوریج، پانی، برساتی نالوں اور سڑکوں کی بحالی پر ایک ارب روپے خرچ کرنا تھا۔ اس کے علاوہ ایک ارب 50 کروڑ روپے کی مالیت سے ٹریٹمنٹ پلانٹ لگانا بھی ایکسپورٹ پروموشن بیورو کی ذمہ داری تھی۔ زون VI پورے شہر

پر مشتمل تھا۔ اس میں اولڈ انفرا اسٹرکچر کی مرمت کے لیے 6 ارب 56 کروڑ روپے، نئے پل، فلائی اوور، سڑکیں، نئے علاقوں کے لیے سیوریج سسٹم پر ایک ارب روپے خرچ کرنے تھے۔ جب کہ 2 ارب 71 کروڑ 50 لاکھ روپے سے پرانے سیوریج سسٹم کو بحال کرنا تھا۔ اس کے علاوہ شہر میں موجود ندی، برساتی نالوں اور سیوریج نالوں کی بحالی پر 2 ارب 2 کروڑ، اور پانی کے نظام کو درست کرنے کے لیے 3 ارب روپے شہری، صوبائی اور وفاقی حکومت کو مل کر خرچ کرنے تھے۔ گلشن اقبال ٹاؤن اور جمشید ٹاؤن کے کئی بڑے علاقوں میں سیوریج کا کوئی نظام ہی وجود نہیں رکھتا تھا۔ بارش کے پانی کے لیے بنائے گئے اور قدرتی نالوں کو ہی سیوریج کے لیے برسہا برس سے استعمال کیا جا رہا تھا۔ کیونکہ شہر میں بارشیں کم ہوتی ہیں اور ہمارے پورے دور میں یونین کونسل اور ٹاؤن کی سطح پر کچرے کو گھروں اور گلی محلوں سے اٹھا کر لینڈ فل سائٹس تک پہنچانے کا نظام پوری طرح فعال تھا، اس لیے برساتی نالوں کی صورت حال زیادہ ناگفتہ بہ نہیں تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس سنگین مسئلے کا مستقل حل تو نکالنا تھا، لہٰذا ہم نے ان علاقوں میں سیوریج اور ڈرینج سسٹم کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کے منصوبے کو بھی تعمیر کراچی پیکیج کا حصہ بنایا۔

گورنر ہاؤس میں ہونے والے اجلاس کے اگلے روز کے پی ٹی کے چیئرمین وائس ایڈمرل احمد حیات نے مجھے فون کیا اور کہنے لگے: "ناظم صاحب! تعمیر کراچی کا منصوبہ تو بہت بڑا ہے۔ کل جو میٹنگ ہوئی اس کے منٹس تیار ہونے اور دیگر چیزیں شامل ہو کر فائل اسلام آباد جانے اور واپس آنے میں خاصا وقت لگ جائے گا، جب کہ میں اس پروگرام میں اپنا حصہ فوراً شامل کرنا چاہتا ہوں، اس لیے میری خواہش ہے ایک مشترکہ میٹنگ کر لی جائے تاکہ فوری طور پر کام شروع کیا جا سکے"۔ میں اگلے دن ان کے دفتر چلا گیا۔ دیکھا تو وہاں پہلے سے چیئرمین کے پی ٹی نے سول ورکس کے افسران کو بلا رکھا تھا۔ باہمی مشاورت سے کچھ چیزیں طے کی گئیں۔ انھوں نے کلفٹن پر شہر کے پہلے انڈر پاس منصوبے پر فوری

طور پر کام شروع کروانے کا عندیہ دے دیا۔ ہم نے ان سے کہا کہ ڈینو چوک فلائی اوور بھی بہت اہم منصوبہ ہے اور اس پر بھی جلد کام شروع کروایا جائے۔ احمد حیات صاحب نے کہا کہ انڈر پاس منصوبہ ہم خود مکمل کروائیں گے، یعنی ڈیزائن سے لے کر ٹینڈرنگ تک ساری ذمہ داری کے پی ٹی کی ہوگی۔ میں نے کہا کہ مانیٹرنگ ہمارے لوگ کریں۔ وہ سمجھ گئے کہ میں معیار پر کوئی سمجھوتا کرنے والا فرد نہیں ہوں۔ انہوں نے ایک فرمائش اور کی کہ انڈر پاس کا نام کے پی ٹی انڈر پاس ہوگا۔ اس پر کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا! بلکہ یہ تو اس ادارے کا حق تھا۔ ویسے بھی ہمیں نام سے زیادہ کام سے غرض تھی۔ انہوں نے ڈینو پاک فلائی اوور اور کچھ دیگر منصوبوں کے لیے تین ارب روپے کی خطیر رقم مختص کرنے کا وعدہ کرلیا۔ کے پی ٹی کے چیئرمین کے بعد پاکستان اسٹیل ملز کے چیئرمین کرنل افضل سے رابطہ کیا۔ میں نے انہیں تجویز پیش کی کہ آپ اپنے حصے کے پراجیکٹ کی تعمیر کا اعلان کسی عوامی اجتماع میں کریں۔ اس سے ایک طرف تو عوام خوش ہوں گے، دوسرے شہر میں موجود وفاقی اداروں کے متعلق عمومی رائے بھی تبدیل ہوگی۔ انہوں نے آمادگی ظاہر کی۔ کچھ دنوں بعد شہری حکومت کے زیر اہتمام قائد آباد کے مقام پر ایک جلسہ عام کا انعقاد کیا گیا۔ کرنل افضل بھی آئے۔ انہوں نے وہاں قائد آباد فلائی اوور، اور نیشنل ہائی وے اور سپر ہائی وے کے درمیان لنک روڈ کی تعمیر کا اعلان کیا۔ یہ پراجیکٹس ابتدائی مراحل میں تھے کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ بعد میں اسٹیل ملز کے چیئرمین بریگیڈیئر عبدالقیوم بنے۔ انہیں مذکورہ پراجیکٹس کی یاددہانی کروائی تو انہوں نے لنک روڈ کے پراجیکٹ کے لیے معذرت کی اور کہا کہ ادارہ مالی مسائل سے دوچار ہے۔ ہم صرف قائد آباد کا پل بناسکیں گے۔ پی آئی اے کے چیئرمین احمد سعید سے ملاقات کی اور ان کے حصے کے کام کے متعلق یاددہانی کراتے ہوئے کہا کہ یونیورسٹی روڈ آپ کو بنوانی ہے۔ اس پر وہ کہنے لگے کہ بھئی سڑک تو آپ بنوائیں ہم آپ کو پیسے دے دیں گے۔ انہوں نے پی آئی اے کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ بلائی اور

اس میں طے کیا کہ پی آئی اے 30 کروڑ روپے شہری حکومت کو دے گا۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے وعدے کے مطابق رقم سٹی گورنمنٹ کے حوالے کر دی۔

تعمیر کراچی پروگرام کی ایک اہم بات یہ بھی تھی کہ ہم نے اس میں کراچی کے ماسٹر پلان کے لیے بھی بجٹ رکھا تھا۔ اس سلسلے میں ای ڈی او ماسٹر پلان عتیق بیگ، ای ڈی او ورکس شعیب صدیقی اور ہماری ٹیم نے بہت محنت کی اور 2003ء میں ہم نے کنسلٹنٹس کی پری کوالی فکیشن کے اشتہارات اخبارات میں شائع کروا دیے۔ شہر کے لیے آخری ماسٹر پلان 70ء کی دہائی میں بنایا گیا تھا جس پر اس کی روح کے مطابق کبھی عمل نہیں ہو سکا تھا، اور بدقسمتی سے شہر بغیر کسی منصوبہ بندی کے ہر سمت پھیلتا چلا گیا تھا اور مسائل کا گڑھ بن گیا تھا۔

شہر کی تعمیر و ترقی کے لیے ضروری تھا کہ ایم کیو ایم اور جماعت اسلامی کے درمیان کشیدگی کم ہو کیونکہ اس کا براہ راست منفی اثر کراچی کے ترقیاتی منصوبوں پر پڑ رہا تھا۔ کراچی جماعت کے نظم سے مشاورت کے بعد گورنر سندھ ڈاکٹر عشرت العباد سے ملاقات کی اور ان سے کہا کہ سندھ گورنمنٹ ہسپتال نیو کراچی میں ایک فلاحی ادارے نور فاؤنڈیشن برطانیہ کے تعاون سے ڈائی لیسس سینٹر بنایا گیا ہے، مجھے اس کے افتتاح کی دعوت دی گئی ہے لیکن میری خواہش ہے کہ اس پراجیکٹ کا افتتاح آپ کریں۔ وہ حیران ہوئے اور بخوشی آمادگی ظاہر کر دی۔ پروگرام والے روز ہسپتال میں لگائے گئے پنڈال میں پہنچا تو سماں ہی کچھ اور تھا۔ نشستوں پر بیٹھے ہوئے اکثر لوگ ہاتھوں میں متحدہ قومی موومنٹ کے پرچم لہرا رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ کوئی سیاسی جلسہ منعقد ہو رہا ہے۔ وقفے وقفے سے نعرے لگ رہے تھے "عشرت بھائی زندہ باد...... فلاں بھائی زندہ باد......" میں نے رابطہ آفیسر کو بلایا اور پوچھا کون کون خطاب کرے گا؟ اس نے جیب سے پرچی نکال کر دکھائی۔ اس پر متحدہ قومی موومنٹ کے اس علاقے کے ایم این اے، ایم پی اے، حتیٰ کہ سیکٹر انچارج کا نام بھی لکھا ہوا تھا۔ رابطہ آفیسر کے چہرے سے بے بسی ٹپک رہی تھی۔ میں نے اس کے

ہاتھ سے پرچی لے کر پھاڑ دی اور دوسری پرچی پر از سر نو خطاب کرنے والوں کے نام لکھے اور کہا کہ یہ سینٹر ایک فلاحی ادارے نے ہماری درخواست پر بنایا ہے، اس پروگرام کو سیاسی رنگ نہ دیا جائے تو بہتر ہے۔ تھوڑی دیر میں گورنر سندھ بھی پنڈال میں داخل ہوئے اور اسٹیج پر بیٹھ گئے۔ مجھے تقریر کی دعوت دی گئی تو سب سے پہلے فلاحی ادارے کے سربراہ کا شکریہ ادا کیا اور پھر گورنر سندھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "مجھے معلوم ہے کہ آپ کا تعلق ایم کیو ایم سے ہے اور آپ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ میرا تعلق جماعت اسلامی سے ہے۔ میری خواہش ہے کہ متحدہ قومی موومنٹ اور جماعت اسلامی کے مابین کشیدگی گلی محلوں سے بڑھ کر شہری حکومت کے ایوان تک نہ پہنچے، اور ہم ایک دوسرے کے ساتھ مل کر شہر کی خدمت کر سکیں"۔ اپنی گفتگو مکمل کرنے کے بعد گورنر سندھ کو خطاب کی دعوت دی، انہوں نے سب سے پہلے سپاس نامہ پیش کرنے والے شخص کو بلوایا، اس نے سپاس نامہ پیش کیا، اس کے بعد ڈاکٹر عشرت العباد نے بہت مناسب انداز میں تقریر کی اور کہا کہ خان صاحب کی اس بات سے مکمل اتفاق ہے کہ یہ ہم سب کا شہر ہے اور شہر کی خدمت کے لیے ہمیں سیاسی وابستگیوں سے بلند ہو کر سوچنا پڑے گا۔ گورنر نے ڈائی لیسز سینٹر کا افتتاح کیا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اس واقعے کے کچھ عرصے بعد ڈاکٹر عشرت العباد نے گورنر ہاؤس میں متحدہ قومی موومنٹ کے اراکین قومی وصوبائی اسمبلی کو بلایا۔ مجھے اور ڈی سی او کو بھی اس اجلاس میں مدعو کیا گیا۔ تقریباً سب ہی نے میرے اور شہری حکومت کے خلاف شکایتوں کے ڈھیر لگا دیے۔ پہلے تو میں سنتا رہا، اس کے بعد واضح لفظوں میں کہا: "اس طرح تو کام نہیں چلے گا بلکہ کشیدگی بڑھے گی۔ اگر کسی ایم این اے، ایم پی اے کو شکایت ہے تو میرے دفتر آئیں اور بات کریں۔ جائز مسائل کے حل کے لیے میرے دروازے ہمیشہ کھلے ملیں گے"۔ اراکین قومی وصوبائی اسمبلی کہنے لگے: ہم بھی تو منتخب ہو کر آئے ہیں۔ افسران ہماری بات نہیں مانتے۔ گورنر سندھ کو اندازہ ہو گیا کہ مسئلہ کیا ہے اور کیوں ہے؟ اجلاس ہو گیا لیکن متحدہ

کے اراکین اسمبلی اور سیکٹر انچارجز کے رویوں میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔

نئے سسٹم کو متعارف کرانے، رکاوٹوں کو دور کرنے، اور ترقیاتی کاموں کے جائزے کے لیے صدر پرویز مشرف گاہے بگاہے کراچی آتے رہتے۔ اس موقع پر کور کمانڈر کراچی طارق وسیم غازی بالعموم ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ میٹنگوں میں شرکت کے دوران اکثر ہونے والی ملاقاتیں بے تکلفی میں تبدیل ہوگئیں، جب کہ اس نظام کے مرکزی کردار لیفٹیننٹ جنرل تنویر نقوی بھی صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے میٹنگ کال کرتے اور منتخب نمائندوں کی کارکردگی سے آگاہی حاصل کرتے۔ مختلف پروگرامات میں متواتر آمد کے باعث ان سے بھی اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہوگئی تھی۔ صاحب مطالعہ فرد تھے اور دنیا کے مختلف ملکوں کے بلدیاتی نظام کے بارے میں خاصی معلومات رکھتے تھے۔ طارق وسیم غازی کو سسٹم کی پیچیدگیوں سمیت صوبائی حکومت کی جانب سے کھڑی کی جانے والی رکاوٹوں کا علم تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً جنرل پرویز مشرف کو اس حوالے سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ انہی دنوں کی بات ہے پرویز مشرف نے گورنر ہاؤس میں صوبائی حکومت میں شامل متحدہ قومی موومنٹ کے وزراء اور اراکین صوبائی اسمبلی کا اجلاس طلب کیا، مجھے بھی مدعو کیا گیا۔ پرویز مشرف متحدہ قومی موومنٹ کے وزراء کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگے: "بھئی آپ لوگ نعمت صاحب کو کام کیوں نہیں کرنے دیتے؟ وہ کام کرنا چاہتے ہیں اور اچھے سے کر بھی رہے ہیں۔ آپ لوگ بلاوجہ کیوں رکاوٹ کھڑی کر رہے ہیں؟" اس بات پر ایک وزیر کہنے لگے: "پتا نہیں نعمت صاحب کو ہم سے کیا پرخاش ہے کہ وہ ہر وقت ہمارا ہی تذکرہ کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ ہم نے ان کی پارٹی کے لیڈر پروفیسر غفور احمد کے داماد کو ای ڈی او ریونیو بنادیا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا تعاون کریں؟" (وزیر موصوف جس افسر کا تذکرہ کر رہے تھے، انہیں اس شرط پر ای ڈی او لگایا گیا تھا کہ سٹی ناظم کے بجائے صوبائی حکومت کے احکامات پر چلیں گے) یہ بات سن کر پرویز مشرف بھی لمحے بھر کو جھنکے اور اپنے سیکریٹری

سے کہنے لگے: یہ نوٹ کریں۔ لیکن انہوں نے کچھ کہا نہیں۔

ریفرنڈم میں صدر پرویز مشرف کی حمایت نہ کرنے پر کور کمانڈر کراچی طارق وسیم غازی کے ساتھ ہونے والی تلخی کچھ ملاقاتوں کے بعد خوشگوار تعلقات میں تبدیل ہوگئی۔ وہ نہ صرف میرا احترام کرتے بلکہ ہمارے کاموں کی مکمل تائید و حمایت بھی کرتے تھے۔ صوبائی حکومت کی جانب سے کھڑی کی جانے والی رکاوٹوں کو دور کروانے کی کوشش بھی کرتے۔ بظاہر نرم مزاج دکھائی دینے والے طارق وسیم غازی اصول و ضوابط کے معاملے میں سخت ڈسپلن کے قائل تھے۔ لمبی گفتگو کے بجائے چند جملوں میں اپنا مدعا بیان کرنے میں انہیں خاصی مہارت تھی۔ ایک مرتبہ ان کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ انہوں نے اپنے سیکریٹری کو کہا: "کمال سے کہو کہ ڈی آئی جی ٹریفک کے لیے تین نام بھیجے"۔ اس وقت کمال شاہ آئی جی سندھ تھے اور طارق وسیم غازی ڈی آئی جی ٹریفک یامین خان سے مطمئن نہ ہونے کی وجہ سے انہیں عہدے سے ہٹانا چاہ رہے تھے، اس لیے کوئی لمبی چوڑی تمہید باندھنے کے بجائے انہوں نے محض دو چار جملوں کا پیغام آئی جی سندھ کو بھجوا دیا۔ ایک ڈی آئی جی کی تبدیلی اس طرح ہوئی جیسے کوئی خاص بات ہی نہیں تھی۔ کراچی کی تعمیر و ترقی کے حوالے سے اکثر کہا کرتے کہ ان کاموں کو رکنا نہیں چاہیے۔ پھر ایک مرحلہ ایسا آیا کہ مسلسل رکاوٹوں کی وجہ سے میں بھی زچ ہوگیا۔ انہی دنوں گلوبل فورم کی جانب سے روم (اٹلی) میں دوسری سالانہ گلوبلائزیشن کانفرنس میں مدعو کیا گیا۔ سارا پروگرام طے ہو چکا تھا۔ پتا چلا صدر مشرف بھی عین اسی دن کراچی پہنچ رہے ہیں جس دن میری روم روانگی تھی، اور ان کے پروگرام میں کراچی سے تعلق رکھنے والے اراکین صوبائی و قومی اسمبلی کے علاوہ مجھ سے ملاقات بھی شامل تھی۔ دورے پر جاؤں یا میٹنگ میں شرکت کے لیے رکوں؟ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ طارق وسیم غازی کو دورے کا بتایا تو کہنے لگے: "آپ کا دورہ اہم ہے لیکن میری رائے یہ ہے کہ آپ کو صدر صاحب

سے لازماً ملاقات کرنی چاہیے۔ اس کا کوئی حل نکالتے ہیں"۔ طارق وسیم غازی نے ذاتی کوشش کے ذریعے پرویز مشرف کے پروگرام میں ترمیم کروائی اور وہ وقت مقررہ سے پہلے کراچی پہنچے۔ مجھے اطلاع مل گئی تو سیدھا آرمی ہاؤس پہنچا۔ وہاں صدر پرویز مشرف سے ون ٹو ون تفصیلی ملاقات ہوئی۔ اپنے ساتھ صوبائی حکومت کی جانب سے کھڑی کی جانے والی رکاوٹوں اور بدعنوانیوں کے ٹھوس شواہد پر مشتمل کچھ فائلیں لے کر گیا تھا۔ انہیں ایک ایک کر کے دیتا گیا، ساتھ ہی ہر فائل کے مندرجات میں سے چیدہ چیدہ نکات بتاتا گیا۔ وہ ہر فائل کو دیکھتے اور ایک جانب رکھتے جا رہے تھے۔ اس دوران انہوں نے کوئی سوال نہیں کیا۔ ابھی ہماری میٹنگ جاری تھی کہ پرویز مشرف کے اے ڈی سی کمرے میں داخل ہوئے اور ایک پرچہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے اسے غور سے پڑھا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے: "نعمت صاحب! یہ باغ ابن قاسم کا کیا معاملہ ہے؟ سنا ہے آپ اس کی تعمیر میں بلا ضرورت تاخیر کر رہے ہیں؟" اسی طرح کی ایک دو باتیں مزید کہیں۔ میں نے ان کی بات سن کر کہا: "آپ کے پاس یہ شکایت محمود ہارون لے کر آئے ہوں گے۔ معاملہ دراصل کچھ اس طرح ہے کہ وہ اس پارک کی تعمیر کے خواہش مند تھے اور چاہتے تھے کہ اس کے لیے متعین طریقہ کار کو بروئے کار لائے بغیر محض زبانی کلامی معاملہ طے کر کے پارک کی تعمیر کا ٹھیکہ ان کی مرضی کے آدمی کو دے دوں۔ اس طرح کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ میں اس کی تعمیر کے لیے باقاعدہ ٹینڈر جاری کرواؤں گا۔ جو بہتر پیش کش دے گا وہی پارک تعمیر کرے گا۔ بس اتنی سی بات ہے"۔ میری یہ باتیں سن کر پرویز مشرف نے وہ پرچہ ایک جانب ڈال دیا اور کہنے لگے: "آپ جو کر رہے ہیں وہ بالکل ٹھیک ہے"۔ ملاقات ختم ہو گئی لیکن صوبائی وزراء کی مداخلت ختم نہیں ہوئی۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی!

ریفرنڈم میں ایک طاقتور صدر کی حیثیت سے سامنے آنے والے صدر پرویز کراچی

کی تعمیر وترقی کے خواہش مند ہونے کے باوجود 2002ء کے عام انتخابات کے بعد دہری مشکل میں پھنس گئے۔ ایک جانب وہ کراچی کی تعمیر وترقی میں رکاوٹ پسند نہیں کرتے تھے، تو دوسری طرف اس حوالے سے کی جانے والی کوششوں کو تہہ وبالا کرنے میں مصروف اپنی اتحادی جماعت کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے دونوں پلڑوں میں توازن قائم کرنا ان کے لیے مشکل ہو رہا تھا، حالانکہ وہ پاکستان اور بیرونِ ملک اپنے وضع کردہ سسٹم کے متعلق فخریہ انداز میں بتاتے ہوئے کراچی میں ہونے والے ترقیاتی کاموں کو بطور نمونہ پیش کرتے اور بتاتے کہ وہ اس طرح کا ترقیاتی کام پورے ملک میں کرانے کے خواہش مند ہیں۔

متحدہ کی جانب سے سٹی گورنمنٹ کے ترقیاتی منصوبوں میں کس سطح سے رکاوٹیں ڈالی جا رہی تھیں، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ تعمیر کراچی پروگرام کی منظوری کے بعد ہم نے نئے مالی سال کے بجٹ میں صوبائی حکومت سے درخواست کی کہ وہ اپنے حصے کی رقم میں سے دو ارب روپے شہر کے مختلف ترقیاتی منصوبوں کے لیے شامل کر دے۔ صوبائی حکومت نے اپنے وعدے کے مطابق ایسا کر دیا لیکن اس رقم کے سٹی گورنمنٹ کو اجراء کے لیے مروجہ طریقہ کار کے مطابق صوبائی وزارت منصوبہ بندی وترقیات کی اجازت درکار تھی۔ میں نے سلیم اظہر سے کہا کہ وہ شعیب بخاری سے رابطہ کریں جو اس محکمے کے وزیر تھے۔ شعیب بخاری تھے تو متحدہ کے پرانے اور پکے آدمی لیکن خاندانی پس منظر بہت اچھا تھا اور شہر کی تعمیر وترقی خاص طور پر ہمارے شفاف طریقہ کار سے کچھ متاثر بھی تھے۔ سلیم اظہر نے اسمبلی بلڈنگ میں ان سے ملاقات کی۔ انہوں نے دو ارب روپے کے منصوبوں کی منظوری سے اصولی اتفاق کرتے ہوئے فائل وزارت خزانہ میں بھجوا دی۔ اس دوران متحدہ کے دیگر لوگوں کو اطلاع مل گئی، انہوں نے لندن میں الطاف حسین کو سارے معاملے کی تفصیل بتائی۔ الطاف حسین نے سخت برہمی کا اظہار کیا اور

شعیب بخاری کے ایک قریبی ساتھی نے ہمیں بتایا کہ بخاری صاحب کو متحدہ کے مرکز 90 طلب کر کے سخت سرزنش کی گئی۔ بہر حال اس وقت کے وزیر خزانہ سردار احمد صاحب کے ذریعہ ایک عجیب و غریب حکم نامہ جاری کروایا گیا اور اپنے ہی صوبائی وزیر کی منظوری کو منسوخ کر دیا گیا۔ وزارت خزانہ سے ڈی سی او کو خط بھیجا گیا کہ وزارت خزانہ کی تحریری اجازت کے بغیر سٹی حکومت اس بجٹ کو خرچ نہیں کر سکتی۔ شعیب بخاری اور سردار احمد دونوں نے مجھ سے اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے معذرت کی اور کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ درست نہیں ہے اور شہر کے لیے نقصان دہ ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ اس کام میں رکاوٹ بہت اوپر سے ڈالی گئی ہے جہاں کسی کا بس نہیں چلتا۔ اس کے بعد مزید خرابی اس طرح کی گئی کہ اچھی شہرت کے حامل افسران کے تبادلے کرنا شروع کر دیے۔ ان کی جگہ کرپٹ اور داغ دار شہرت کے حامل افراد کو عہدوں پر لاکر بٹھانا شروع کر دیا۔ حالانکہ سندھ لوکل گورنمنٹ آرڈیننس میں واضح لکھا تھا کہ تین سال سے پہلے کسی افسر کا تبادلہ نہیں ہوگا، اس کے باوجود ورکس اینڈ سروسز میں ایک ہی برس کے دوران تین افسران تبدیل کر دیے گئے۔ اپنی مرضی کے افسران کو کنٹرول کرنے کے لیے گورنر ہاؤس میں اجلاس منعقد کیے جاتے تھے۔ وزیر بلدیات محمد حسین کے بعد وسیم اختر مشیر بلدیات بنائے گئے۔ بدقسمتی سے انہوں نے بھی معاملات کو مثبت انداز میں چلانے کی کوشش نہیں کی۔ سٹی گورنمنٹ کے اہم افسر شعیب صدیقی کا ٹرانسفر کر دیا گیا۔ شعیب صدیقی ای ڈی او ورکس اینڈ سروسز اور تعمیر کراچی پروگرام کے پراجیکٹ ڈائریکٹر تھے۔ محنتی اور فرض شناس ہونے کے ساتھ اپنے کام میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کا تعلق کراچی سے تھا، اور شہر میں مختلف اہم انتظامی عہدوں پر رہنے کی وجہ سے وہ کراچی کے گمبھیر مسائل سے بخوبی واقف تھے۔ شعیب صدیقی کو عمدہ کارکردگی کے باوجود ہٹا دیا گیا۔ مقصد واضح تھا کہ ہمارے کاموں میں رکاوٹ ڈالی جائے اور ترقی کی رفتار کو سست کیا جائے۔

ان کے بعد صوبائی حکومت نے سرفراز علی شاہ کو ای ڈی او ورکس کی حیثیت سے ہمارے پاس بھیج دیا۔ ابتدا میں ای ڈی او ورکس کے ساتھ ہماری انڈر اسٹینڈنگ نہیں بن سکی۔ مجبوراً گزارہ کرنا پڑ رہا تھا۔ تعمیر کراچی پروگرام کے پراجیکٹ ڈائریکٹر کی پوسٹ خالی تھی۔ ہم نے کے بی سی اے کے کنٹرولر رؤف اختر فاروقی کو یہ ذمہ داری سونپ دی۔ صوبائی حکومت کو ایک مرتبہ پھر اپنے اختیارات یاد آ گئے۔ انہوں نے ایک نوٹیفکیشن جاری کر کے رؤف اختر فاروقی کو کام کرنے سے روک دیا۔ مجبوراً انہوں نے چارج چھوڑ دیا۔ ان کے جانے کے بعد یہ عہدہ بھی سرفراز علی شاہ کو دینا پڑا۔ رؤف اختر فاروقی کو صوبائی حکومت نے متحدہ کے دباؤ پر ہٹا دیا تھا، مصطفیٰ کمال انہیں دوبارہ لے آئے اور شہر کے کئی اہم پراجیکٹس ان کی زیر نگرانی مکمل ہوئے۔ اس مثال سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ متحدہ کے لوگوں کی طرز سیاست کیسی تھی؟ وہ شہر کے مفادات کو اپنی مخصوص عینک سے دیکھا کرتے تھے۔

شہر کے دو ترقیاتی ادارے ملیر ڈیولپمنٹ اتھارٹی اور لیاری ڈیولپمنٹ اتھارٹی بھی شہری حکومت کا حصہ تھے، لیکن صوبائی حکومت کے ذمہ داران کی نظر میں یہ محکمے سونے کی کان کی طرح تھے جن کا کنٹرول وہ کسی طور ہمارے حوالے کرنے پر تیار نہیں تھے۔ جن افسران کو ان محکموں میں لگایا جاتا وہ بظاہر میرے ماتحت تھے لیکن حکم صوبائی حکومت کا مانتے تھے۔ نہایت صبر اور مصلحت سے کام لیتے ہوئے کسی نہ کسی طرح ان افسران کو تعاون کرنے پر راضی کیا گیا، اور اس معاملے میں شفیق پراچہ کے بعد ڈی سی او بننے والے میر حسین علی نے بہت اچھا کردار ادا کیا۔ میر حسین علی خاموش طبع آدمی تھے لیکن ماتحت افسران سے کام لینے کی اچھی صلاحیت رکھتے تھے۔ ہم نے ملیر ڈیولپمنٹ اتھارٹی کی اسکیم نیو ملیر ہاؤسنگ سوسائٹی کے پلاٹ شفاف انداز سے قرعہ اندازی کے ذریعے الاٹ کیے۔ کئی بار الاٹمنٹ آرڈرز دینے کے لیے تقاریب کا انعقاد کیا گیا جس میں گورنر سندھ ڈاکٹر عشرت العباد کو بھی

مدعو کیا گیا۔ہاکس بے اسکیم سال ہا سال سے توجہ کی منتظر تھی۔ہم نے خوش حال پاکستان اور اے ڈی پی کی اسکیموں کے تحت وہاں ترقیاتی کاموں کا آغاز کروایا۔

میری خواہش تھی ان دونوں بڑی سرکاری ہاؤسنگ اسکیموں میں جلد از جلد ترقیاتی کاموں کی تکمیل کے ذریعے انہیں عام لوگوں کے لیے رہائش کے قابل بنایا جا سکے۔بد قسمتی سے ''سسٹم'' بجائے خود رکاوٹ بنا رہا۔کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی بہت منظم قوتیں چاہتی ہی نہیں ہیں کہ یہ دونوں سرکاری ہاؤسنگ اسکیمیں کبھی مکمل ہوں اور الاٹیز سکون کا سانس لے سکیں۔

افتتاح سگنلائزیشن ناگن چورنگی
نارتھ ناظم آباد کے ٹاؤن ناظم فصیح الدین صدیقی کے ساتھ

تقریب سنگ بنیاد ویمن انڈسٹری کمپلیکس، گلشن اقبال ٹاؤن کے
ناظم عبدالوہاب، سٹی کونسلر عنایت اللہ اور ای ڈی او ریونیو پروین ظفر موجود تھے

گلبرگ ٹاؤن میں ترقیاتی منصوبوں کا افتتاح
ٹاؤن ناظم فاروق نعمت اللہ کے ساتھ

نارتھ کراچی ٹاؤن کے ناظم شفیق الرحمٰن عثمانی کے ساتھ
کچی آبادی کے مکینوں کو لیز کے کاغذات دیتے

الخدمت کے گروپ لیڈر مسلم پرویز نے قومی تعمیر نو بیورو کے
چیئرمین دانیال عزیز کو سٹی کونسل کا نشان پیش کیا

ڈاکٹر پرویز محمود، نور الاسلام اور محمد طفیل کے ساتھ

صدر میں جاپانی گیٹ روڈ کا افتتاح
ٹاؤن ناظم اعظم علی اور نائب ناظم وسیم مرزا بھی موجود تھے

ناظم آباد مثالی پارک کے افتتاح کے موقع پر محمد مسلم، نصراللہ شجیع
شہاب الدین، ڈاکٹر پرویز محمود اور عابد الیاس کے ساتھ

رکن صوبائی اسمبلی نصراللہ شجیع، فصیح الرحمن اور نسیم صدیقی

سٹی کونسل کے تحت اجلاس کی صدارت کر رہے ہیں

بلدیہ ٹاؤن کے ناظم اورنگزیب خان اور محمد طفیل کے ساتھ

گلشن ٹاؤن کے ناظم محمد شاہد، علی بن القاسم کے امیر اسلم مجاہد اور
اورنگی ٹاؤن کے ناظم عبدالسمیع خان کے ساتھ ایک تقریب کے دوران

سائٹ ٹاؤن کے ناظم امیر نواب کے ساتھ ۔ شفیق وڑائچ بھی موجود ہیں

گرین بس سروس کا افتتاح۔ رکن صوبائی اسمبلی حافظ نعیم
ظفر شریف اور دیگر معززین بھی تقریب میں شریک ہیں

عوامی ترقیاتی پروگرام کے تحت قائد آباد فلائی اوور کا سنگ بنیاد رکھا گیا

بیرونِ ملک مقیم پاکستانیوں کے نمائندوں کو سٹی گورنمنٹ کی طرف سے یادگاری شیلڈ پیش کی

لانڈھی جم خانہ کرکٹ گراونڈ کا افتتاح۔ پروفیسر سراج الاسلام بخاری، منیر حسین اور محمد شاہد بھی موقع پر موجود تھے

لیاقت آباد ٹاؤن میں فلڈ لائٹ فٹ بال ٹورنامنٹ جیتنے والی ٹیم کو ٹرافی دی۔
ڈاکٹر پرویز محمود اور یوسی ناظم عابد الیاس بھی موجود تھے

12 مئی 2004ء۔ ایک خوں آشام دن

شہر میں سٹی گورنمنٹ کے نظام کی وجہ سے ہر طرف ترقیاتی کام ہوتے ہوئے نظر آتے تھے۔ یونین کونسل، ٹاؤن اور شہر کی سطح پر منتخب نمائندے موجود تھے جو عوام کے مسائل کے حل کے لیے صبح سے رات گئے تک مصروفِ عمل رہا کرتے تھے۔ گلبرگ کے ٹاؤن ناظم فاروق نعمت اللہ فجر کی نماز پڑھ کر ٹاؤن آفس پہنچ جاتے اور اپنی نگرانی میں کچرا اٹھانے والی گاڑیوں کو روانہ کرتے تھے۔ باقی ٹاؤن ناظمین بھی اسی جوش و جذبے سے کام کر رہے تھے۔ صفائی کے اسٹاف کو صبح سویرے کام شروع کرنے کی ہدایت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ گلیوں اور سڑکوں پر کچرا پھینکا ہوا نظر نہیں آتا تھا۔ جماعت کے یوسی ناظمین اور کونسلرز شکوہ کرتے کہ خان صاحب! فجر کی نماز کے بعد سلام پھیرتے ہی آس پاس موجود لوگ اپنے مسائل بتانے لگتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ہمارے پاس نہ کرنے کا آپشن نہیں ہوتا۔ میں ان سے کہتا کہ اللہ کا شکر ادا کیا کریں کہ اس نے آپ کو مسائل کے حل کا اختیار عطا کیا ہے۔ اسی خدمت سے جنت بنانے کی کوشش کیجیے۔

شہر میں طویل عرصے کے بعد روشنیاں اور رونقیں بحال ہوگئی تھیں اور لوگوں نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ یہ امن و امان شہر کے نام نہاد ٹھیکیداروں کو پسند نہیں آیا۔ بدامنی، ہڑتالوں، تشدد اور قتل و غارت کے رسیا لوگوں کو 2004ء کے ضمنی الیکشن نے کھل کھیلنے کا موقع فراہم کر دیا۔

12 مئی کو شہر میں قومی اسمبلی کی تین نشستوں پر ضمنی الیکشن ہوا۔ متحدہ مجلس عمل نے ان نشستوں پر قاری عثمان، حافظ محمد تقی اور راشد نسیم کو امیدوار نامزد کیا تھا۔ راشد نسیم حلقہ 246

سے امیدوار تھے جس میں لیاقت آباد اور فیڈرل بی ایریا کے علاقے شامل تھے۔ متحدہ کا ہیڈکوارٹر 90 بھی اسی حلقے میں واقع تھا۔ دوپہر 12 بجے تک سست روی لیکن پر امن انداز میں ووٹ ڈالے جاتے رہے۔ اس کے بعد متحدہ کے دہشت گردوں نے پولنگ کے عمل کو تہس نہس کرنے کے پلان پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ سینکڑوں لوگ ہاتھوں میں اسلحہ اٹھائے پولنگ اسٹیشنز میں داخل ہو گئے اور ہمارے پولنگ ایجنٹس پر براہ راست فائرنگ شروع کر دی۔ بظاہر ان کا مقصد یہ تھا کہ مخالف پولنگ ایجنٹس وہاں سے چلے جائیں تاکہ وہ اپنے امیدواروں کے لیے بیلٹ پیپرز پر ٹھپے لگا سکیں اور مقابلہ یک طرفہ ہو جائے۔

تینوں نشستیں متحدہ ہی کے اراکین نے مستعفی ہو کر خالی کی تھیں اور بظاہر کسی سخت مقابلے کا امکان بھی نہیں تھا، لیکن متحدہ کے دہشت گردوں نے 12 مئی کی دوپہر کے بعد شہر کی گلیوں کو خون رنگ کرنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ وہ اپنے سیاسی مخالفین اور عام شہریوں پر دہشت بٹھانا چاہتے تھے کہ خبردار کوئی ہمارے سامنے مقابلے پر نہ آئے، کوئی سر نہ اٹھائے۔ شام تک مجلس عمل کے درجنوں کارکنان ان کی گولیوں کا نشانہ بن چکے تھے۔ جبکہ تشدد کا نشانہ بننے والوں کی تعداد بھی کم نہیں تھی۔ رات تک 12 افراد کی شہادت کی خبر آ چکی تھی۔ میں نے بحیثیت سٹی ناظم ہر اُس فرد سے بار بار رابطہ کیا جو امن و امان قائم کرنے میں کوئی کردار ادا کر سکتا تھا، لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اعلیٰ افسران گونگے بہرے ہو چکے ہیں، یا پھر یہ کہ یہ خون کی ہولی اُن کی مرضی سے کھیلی جا رہی ہے۔ الیکشن کمیشن کا عملہ مکمل طور پر بے بس دکھائی دے رہا تھا۔ بہر حال جماعت کے کارکنان نے آخری وقت تک استقامت کا مظاہرہ کیا اور پولنگ اسٹیشنز چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوئے، لیکن جب نوبت یہ آ گئی کہ خواتین تک پر تشدد شروع ہو گیا اور ان کی زندگیوں کو بھی خطرات لاحق ہو گئے تو پھر ہمارے کچھ پولنگ ایجنٹس نے نظم کو مطلع کر کے وہاں سے جانے میں عافیت سمجھی۔ بارہ مئی کو شہید ہونے والے کارکنان میں نور عالم،

عبدالرحمن، عبدالعزیز وہیرہ، خالد خان، شان محمد، ریاض انجم، محمد عابد، وقار احمد، مدثر اور عشرت علی شامل تھے۔

متحدہ نے اچانک اپنے اراکینِ قومی اسمبلی سے استعفے کیوں لیے تھے؟ کسی نئے دھڑے بندی کی خبر تھی؟ مالی بے ضابطگیوں کا کوئی معاملہ تھا؟ یا محض شہر میں خوف و دہشت کی فضا قائم کرنی تھی؟ اصل وجہ کبھی عوام کے سامنے نہیں آسکی۔

لائبریری نہ بن سکی۔ اسپورٹس کمپلیکس بن گیا

دو ایسے ترقیاتی منصوبوں کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو خالصتاً خواتین اور بچیوں کے لیے تھے۔ ایک منصوبہ شروع ہونے کے باوجود مکمل نہیں ہوسکا، جبکہ دوسرا پایہ تکمیل کو پہنچا اور شہر میں اپنی نوعیت کا پہلا منصوبہ قرار پایا۔ ارادہ یہ تھا کہ شہر کے ہر ضلع میں ایک خواتین لائبریری کمپلیکس اور ایک اسپورٹس کمپلیکس بنایا جائے، کیونکہ ہمارے یہاں مڈل کلاس اور غریب طبقات کی خواتین کے لیے ایسی سہولتوں کی شدید کمی ہے۔

گلشن اقبال کے علاقے میں نیپا چورنگی سے کچھ فاصلے پر کسٹم کلب سے متصل ایک بڑا پلاٹ تھا جو پبلک لائبریری کے لیے مختص تھا۔ سٹی کونسل میں الخدمت کی خواتین کونسلرز ریحانہ افروز، شہلا عنایت، مسفرہ جمال، صابرہ شاہد اور منورا اخلاص صاحبہ نے تجویز پیش کی کہ اس پلاٹ پر خواتین اور طالبات کے لیے جدید سہولتوں سے آراستہ ایک بڑی لائبریری قائم کی جائے جس سے پورے شہر کی خواتین استفادہ کرسکیں۔ انہوں نے کہا کہ ترقیاتی کاموں کے لیے ہر سٹی کونسلر کو جو پندرہ لاکھ روپے فراہم کیے گئے ہیں، وہ رقم اس لائبریری کے قیام میں استعمال کی جاسکتی ہے۔ اس منصوبے میں پیپلز پارٹی اور دیگر گروپوں کی خواتین کونسلرز بھی تعاون کے لیے تیار ہیں۔ مجھے یہ تجویز پسند آئی، اور ہم نے اس کے لیے ورکس اینڈ سروسز کے محکمے کو پی سی ون بنانے کی ہدایت کردی۔ اگلے چند ماہ میں اس منصوبے پر بہت تیزی سے کام ہوا۔ نقشے وغیرہ بنائے گئے اور کنسلٹنٹ نے ہماری ٹیم اور خواتین کونسلرز کو تفصیلی بریفنگ دی۔ 65 ملین روپے کے اس منصوبے کے لیے رکن قومی

اسمبلی عائشہ منور صاحبہ نے اپنے فنڈ سے 15 ملین روپے دینے کا اعلان کیا۔

20 جنوری 2004ء کو ایک پُروقار تقریب میں شہر کے پہلے "ویمن لائبریری کمپلیکس" کے منصوبے کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ تقریب میں معروف شاعر اور ماہرِ تعلیم عنایت علی خان صاحب نے بطورِ خاص شرکت کی اور شرکاء کے پُرزور اصرار پر اپنی کچھ نظمیں بھی سنائیں۔

سنگِ بنیاد رکھے جانے کے کچھ ہی عرصے بعد تعمیراتی کاموں کا آغاز ہوگیا۔ میں نے عابد الیاس کی ذمہ داری لگائی کہ اس اہم منصوبے کے تعمیراتی کاموں کی خصوصی نگرانی کریں، اور فنانس ڈپارٹمنٹ کو بھی ہدایت جاری کی کہ کسی بھی مرحلے پر کانٹریکٹر کو ادائیگی میں تاخیر نہ ہو تاکہ منصوبہ بروقت مکمل ہو سکے۔ بدقسمتی سے مصطفیٰ کمال نے ناظم بننے کے بعد اس منصوبے کو ختم کردیا اور اس پلاٹ پر "ناصر حسین شہید ہسپتال" بنانے کا اعلان کردیا۔ متحدہ قومی موومنٹ جیسے کسی بھی گروہ کو تعلیم کے شعبے سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟ یہ بات تو آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ کراچی کے سرکاری تعلیمی اداروں پر بدترین زوال اسی گروہ کی نالائقیوں کی وجہ سے آیا تھا، ورنہ 1986ء تک یہی سرکاری تعلیمی ادارے شہر کے ہر طبقے کے بچوں اور بچیوں کو مفت معیاری تعلیم فراہم کررہے تھے۔

2005ء کی جنوری یا فروری کا واقعہ ہے کمیونٹی ڈیولپمنٹ ڈپارٹمنٹ کے ڈسٹرکٹ افسر سیف الرحمٰن گرامی ایک فائل لے کر میرے پاس آئے۔ ان کے ساتھ قاضی صدرالدین بھی تھے۔ انہوں نے بتایا کہ گلشن اقبال بلاک تین میں خواتین اسپورٹس کمپلیکس کا منصوبہ طویل عرصے سے تعطل کا شکار ہے۔ فنڈز کی قلت کی وجہ سے کئی سال پہلے اس پر کام بند ہوگیا تھا۔ اگر آپ اس منصوبے میں دلچسپی لیں تو ایک سال کے اندر اسے مکمل کروایا جاسکتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ شہر میں اپنی نوعیت کا پہلا سرکاری منصوبہ ہوگا جہاں مڈل کلاس کی خواتین اور بچیاں ممبرشپ لے سکیں گی۔ اس منصوبے میں انڈور گیمز،

جم اور سوئمنگ پول کی سہولتیں بھی شامل تھیں۔

کمرے میں موجود ایک صاحب نے چونک کر کہا "خواتین کے لیے سوئمنگ پول اور جم! کیا نعمت اللہ صاحب ایسے منصوبوں کا افتتاح بھی کریں گے؟" مجھے مداخلت کرنی پڑی اور کہنا پڑا کہ اسلام شرعی حدود و قیود میں رہتے ہوئے خواتین کو ہر طرح کی مثبت سرگرمیوں کی اجازت دیتا ہے۔ میں نے گرامی صاحب اور قاضی صدرالدین سے کہا کہ اس منصوبے کو مکمل کروائیں اور مالی معاملات کی منظوری مجھ سے اور ڈی سی او سے طریقہ کار کے مطابق لے لیں۔

سات یا آٹھ مہینے کے بعد یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچا اور 21 جون 2005ء کو شہر کے پہلے ویمن اسپورٹس کمپلیکس کا باقاعدہ افتتاح کر دیا گیا۔ کچھ لوگوں کی یہ غلط فہمی دور ہو گئی کہ جماعت اسلامی خواتین کے حوالے سے تنگ نظری کا شکار ہے، اور انہیں گھروں تک محدود رکھنا چاہتی ہے۔ ویسے بھی ایک ایسی جماعت پر اس قسم کی تنقید حقیقت سے دور اور بلا جواز لگتی ہے جس کا شعبۂ خواتین کسی بھی سیاسی جماعت سے زیادہ منظم اور فعال ہے، اور جس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کی ایک بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ اُس دور میں بھی ڈاکٹر کوثر فردوس، عائشہ منور اور سمیحہ راحیل قاضی جیسی اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین پارلیمان میں جماعت کی نمائندگی کر رہی تھیں۔

کچی آبادیاں، انفرااسٹرکچر اور پبلک ٹرانسپورٹ

کچی آبادیاں کراچی کی ایک حقیقت ہیں، جن کے بر سر زمین وجود سے انکار ممکن نہیں ہے۔ یہ آبادیاں کب وجود میں آنا شروع ہوئیں اور مختلف حکومتوں نے ان کے پھیلاؤ کو کیوں نہیں روکا؟ یہ غور طلب بات ہے۔ لیکن یہ طے ہے کہ شہر کے بہت سارے دیرینہ مسائل کا تعلق ان کچی آبادیوں سے ہے، جہاں بسنے والے لوگ زندگی کی اکثر بنیادی سہولتوں سے بھی محروم ہوتے ہیں۔

بڑے شہروں میں کچی بستیوں کا وجود صرف کراچی ہی میں نہیں ہے، لاہور اور اسلام آباد میں بھی ایسی آبادیاں موجود ہیں گو کہ کراچی کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ پڑوسی ملک بھارت کے بڑے شہروں جیسے ممبئی، دہلی اور کولکتہ میں بھی بڑی بڑی کچی بستیاں وجود رکھتی ہیں۔ کراچی میں 1985ء کے ایک سروے کے مطابق کئی سو کچی بستیاں موجود ہیں۔ 1989ء میں کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن کی منتخب کونسل نے کچی آبادیوں کو مالکانہ حقوق اور لیز دینے کے لیے ایک قرارداد کے ذریعے نرخ مقرر کیے جو کم از کم 25 روپے مربع گز اور زیادہ سے زیادہ 300 روپے مربع گز تھے۔ بہت ساری کچی بستیوں نے اس مفید اسکیم سے فائدہ اٹھایا لیکن درجنوں بستیاں پھر بھی باقی رہ گئیں۔

1999ء میں کے ایم سی کے ایک ایڈمنسٹریٹر نے ان نرخوں میں غیر معمولی اضافہ کر کے کم از کم 400 روپے مربع گز اور زیادہ سے زیادہ 2500 روپے مربع گز کر دیا۔ یہ نرخ ان بستیوں کے مکینوں کے لیے بہت زیادہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچی آبادیوں کی لیز

(Lease) کا کام رک گیا جس سے شہر کو بہت نقصان ہوا۔

میں نے کچی آبادیوں کے لیز کے نرخ میں کمی کے حوالے سے ڈی سی او اور نائب ناظم سے مشاورت کی اور 1989ء کے نرخ کی بحالی کی تجویز پیش کی۔ شفیق الرحمن پراچہ اور طارق حسن نے اس تجویز سے مکمل اتفاق کیا۔ مسلم پرویز، سعید غنی اور صدیق راٹھور سمیت کونسل کے سب اراکین نے تائید و حمایت کی، اور کچھ ہی عرصے میں سٹی کونسل نے ایک قرارداد کے ذریعے 1989ء کے نرخ بحال کر دیے۔

سٹی کونسل نے جو نئے نرخ مقرر کیے وہ درج ذیل تھے:

120 مربع گز	25 روپے فی مربع گز
120 سے 150 مربع گز	100 روپے فی مربع گز
اسکول، مدرسہ اور ہسپتال	300 روپے فی مربع گز

عبادت گاہیں (مسجد، مندر، چرچ، گردوارہ) صرف ایک روپیہ فی مربع گز

اس کے بعد مدت نظامت ختم ہونے تک ہم نے درجنوں کچی بستیوں کے ہزاروں مکینوں کو لیز کے کاغذات دیے اور ان بستیوں میں ترقیاتی کام شروع کروائے۔ لیز دینے کے منصوبے میں گوہر الاسلام، قاضی صدرالدین، عابد الیاس، عبدالرشید بیگ صاحب اور مسلم پرویز نے غیر معمولی محنت کی، جبکہ شہر کے تمام ٹاؤن ناظمین نے بھی بڑھ چڑھ کر تعاون کیا۔

طارق وسیم غازی کے بعد جنرل احسن سلیم حیات نے نئے کور کمانڈر کی حیثیت سے چارج لیا۔ ان کے ساتھ گزرے تھوڑے سے عرصے کا ایک واقعہ مجھے تادیر یاد رہا۔ کور کمانڈر ہاؤس میں ایک میٹنگ جاری تھی۔ احسن سلیم حیات کمرے میں داخل ہوئے تو ان کی پتلون خون آلود تھی۔ میٹنگ کے تمام شرکا، یہ منظر دیکھ کر حیران بھی ہوئے اور پریشان بھی۔ احسن سلیم حیات نے کہا: چند منٹ دیجیے، میں کپڑے تبدیل کر کے آتا ہوں۔ اس

موقع پر انہوں نے خود تو ذکر نہیں کیا، لیکن میٹنگ کے اختتام پر ان کے اسٹاف ممبرز نے بتایا کہ قاتلانہ حملے میں بال بال بچے ہیں۔ میٹنگ کے دوران انہوں نے ایجنڈے کے سوا کسی موضوع پر بات نہیں کی اور نہ ہی ان کے رویے سے کسی قسم کی پریشانی ظاہر ہوئی۔ غالباً انہی کے دور میں اسٹیبلشمنٹ نے طے کر لیا تھا کہ اب کیونکہ ایک منتخب صوبائی حکومت اپنا وجود مستحکم کر چکی ہے، اس لیے شہری حکومت کے نظام کو بھی صوبائی حکومت کے کار پرداز دیکھیں تو مناسب رہے گا۔ شہری حکومت کے تخلیق کاروں کی یہ لاتعلقی ایک درجے میں بہتر تھی تو دوسری طرف بعض منفی عناصر کو شہ دینے کے مترادف بھی تھی۔ وزیر اعلیٰ کو تو اس نظام سے ویسے بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ خاص طور پر کراچی اور حیدر آباد کے معاملات میں وہ بالکل بے بس نظر آتے تھے۔ سٹی گورنمنٹ کے مختلف محکموں میں صوبائی وزراء کی جانب سے مداخلت پر ان کی طرف سے کوئی ردِعمل بھی سامنے نہیں آتا تھا۔ پھر صدر پرویز مشرف بھی تھوڑے پرے سے دکھائی دے رہے تھے۔

اپنی ذمہ داریاں مختصر عرصہ تک نبھانے کے بعد احسن سلیم حیات بھی رخصت ہو گئے، اور ان کی جگہ نئے کور کمانڈر سید اطہر علی آ گئے۔ کچھ میٹنگز میں رسمی سلام دعا ہوئی۔ ایک بار صوبائی وزراء کی بے جا مداخلت کا شکوہ کر کے کردار ادا کرنے کا کہا تو انہوں نے زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ اپنی نظامت کے آخری دنوں میں، میں نے شہری حکومت کے خلاف بڑھتی ہوئی مخالفتوں اور کور کمانڈر کراچی کی سرد مہری کے رویے کا تذکرہ طارق وسیم غازی سے ایک ملاقات میں کیا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ آپ کو کور کمانڈر سے دو ٹوک ملاقات کرنی چاہیے۔ چنانچہ سید اطہر علی سے ملاقات کا وقت لیا۔ وقت مقررہ پر جب میں ان کے دفتر پہنچا تو ایک ایئر وائس مارشل اور کچھ دیگر اہم شخصیات ان سے ملاقات کے لیے انتظار گاہ میں موجود تھیں۔ اردلی نے میرے پہنچنے کی اطلاع دی تو انہوں نے سب سے پہلے مجھے ملاقات کے لیے بلوا لیا، اور پھر تقریباً ایک گھنٹے تک ہماری ملاقات جاری رہی۔ گفتگو کے درمیان وہ کہنے لگے:

اصل میں ابتدا میں آپ کے متعلق صدر صاحب کی پالیسی یہ تھی کہ ناظم کراچی کی مکمل سپورٹ کی جائے اور ترقیاتی کاموں میں سپورٹ کے ساتھ صوبائی حکومت کو بھی کنٹرول میں رکھا جائے۔ لیکن اب پالیسی اور ہدایات یہ ہیں کہ صوبائی حکومت کو بھی اختیارات میں شریک کیا جائے۔ صدر پرویز مشرف آپ کی کارکردگی سے بہت خوش ہیں لیکن صوبائی حکومت کو بھی بالکل بے حیثیت نہیں دیکھنا چاہتے۔ اور خواہش رکھتے ہیں کہ آپ کے اور صوبائی وزراء کے درمیان اچھی ورکنگ ریلیشن شپ ہو۔ انہوں نے بتایا کہ میرا ننھیال یہاں (کراچی) میں ہے۔ اور میرے تمام ننھیالی رشتے دار آپ کی بہت تعریف کرتے ہیں۔

ملاقات کے آخر میں جب انہیں رکاوٹوں اور مخالفتوں کے حوالے سے چند مثالیں دیں تو وہ کہنے لگے: "آپ نے یہ باتیں صدر پرویز مشرف سے کہی ہیں؟" "وہ تو ملتے ہی نہیں ہیں، میں تو دیگر ذرائع سے بھی ملاقات کے لیے رابطہ کر چکا ہوں"۔ میں نے اُن سے کہا۔ اس پر سید اطہر علی کہنے لگے: اچھا ٹھیک ہے، میں رابطے کا بندوبست کرواتا ہوں۔ کوئی تین دن گزرے ہوں گے کہ ایک دن سید اطہر علی کا فون آیا۔ کہنے لگے: نعمت صاحب! پرویز مشرف ملاقات کے لیے انکار کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب میں نعمت اللہ خان سے ملاقات کرتا ہوں تو اس پر متحدہ قومی موومنٹ والے اعتراض کرتے ہیں، ان کا موقف یہ ہے کہ ان ملاقاتوں سے ہمارے کارکنوں میں غلط پیغام جاتا ہے۔ کور کمانڈر کراچی کی بات سن کر سارا نقشہ سمجھ میں آ گیا۔ دراصل پرویز مشرف کے روکھے پن کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ 2008ء میں ہونے والے الیکشن کا سوچ رہے تھے اور متحدہ اُن کے لیے بہت اہمیت اختیار کر چکی تھی۔

اپنے اقتدار کے دوام کے لیے وہ سندھ سے متحدہ قومی موومنٹ کی مکمل حمایت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس خواہش کے عوض ایم کیو ایم چاہتی تھی کہ صدر پرویز مشرف شہری حکومت کے مقابلے میں صوبائی حکومت کی مکمل سرپرستی کریں۔ بس اسی وجہ سے

پرویز مشرف متحدہ کے مطالبے کے آگے ڈھیر ہو گئے۔

نئے بلدیاتی نظام کی اچھی شروعات کے بعد آنے والے مختلف نشیب وفراز اور آخر میں اس سسٹم کے طاقتور سرپرستوں کی جانب سے اختیار کی جانے والی بے رخی کے باوجود اپنے مخلص رفقاء کے ہمراہ شہر کی تعمیر وترقی کے لیے کیے گئے کاموں کی طویل فہرست میں سے چند بڑے ترقیاتی منصوبوں کی ابتدا اور تکمیل کا احوال بڑا دلچسپ ہے۔ اس حوالے سے پہلے مرحلے میں انفرااسٹرکچر کی بحالی کے زمرے میں شاہ فیصل فلائی اوور اور رایف ٹی سی فلائی اوور کی تکمیل کے بعد شاہراہ قائدین فلائی اوور کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ اس پراجیکٹ پر خاصی حد تک کام ہو چکا تھا، قریب تھا کہ ہم اس کا افتتاح کرتے، لیکن صوبائی مشیر بلدیات نے پراجیکٹ انجینئر کو معطل کر دیا جس کی وجہ سے کام تعطل کا شکار ہو گیا۔ اس کے علاوہ 28 اپریل 2005ء کو سہراب گوٹھ فلائی اوور کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ لیاقت آباد 10 نمبر جانے والے راستے پر مستقل ٹریفک جام کی وجہ سے غریب آباد کے مقام پر 560 میٹر طویل انڈر پاس تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ 7 دسمبر 2004ء کو اس منصوبے کا بھی سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس کی تعمیر کا ٹھیکہ ایسے کنٹریکٹر کے پاس تھا جس کا تعلق متحدہ قومی موومنٹ سے تھا۔ اس نے قصداً کام میں تاخیری حربے اختیار کرنا شروع کیے، یہاں تک کہ میری نظامت کا دور مکمل ہو گیا۔ اس کے ساتھ پہاڑ گنج سے قصبہ کالونی تک پہاڑی کو کاٹ کر سڑک کی تعمیر، کارساز فلائی اوور، قائد آباد فلائی اوور، ماری پور روڈ، مہران ہائی وے، نشتر روڈ، ابن سینا روڈ، راشد منہاس روڈ، شاہ ولی اللہ روڈ، شبیر احمد عثمانی روڈ، منگھوپیر روڈ، کورنگی 8 ہزار روڈ، کالا پل تا قیوم آباد روڈ، جہانگیر روڈ، صبغت اللہ شہید روڈ، اور گریکس ولیج سے ساحل سمندر تک سڑک کی تعمیر کے علاوہ 30 مئی 2005ء کو ملیر ریور برج کے تاریخی منصوبے کا آغاز کیا گیا۔ 1350 میٹر طویل اور 23.60 میٹر چوڑے پل کی تعمیر سے کورنگی سے شاہ فیصل کالونی کا فاصلہ سمٹ کر محض 15 منٹ کا رہ گیا۔ اس فلائی اوور کی لاگت ایک

ارب چھ کروڑ کے لگ بھگ تھی۔ نظامت کے اختتام تک فلائی اوور کے ستون کھڑے ہو چکے تھے اور مزید کام جاری تھا۔

شہر میں سڑکوں اور پلوں کی تعمیر کے ساتھ ہی اس بات کا شدت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کراچی میں آمدورفت کے لیے عمدہ راستوں کے علاوہ پبلک ٹرانسپورٹ کے نظام کو از سر نو درست کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ یہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا۔ کیوں کہ نجی ٹرانسپورٹرز نے برس ہا برس سے ٹرانسپورٹ کے نظام کو اپنے شکنجے میں کس رکھا تھا۔ اکثر ٹرانسپورٹر خراب لوگ نہیں تھے لیکن ٹریفک پولیس کی بھتہ خوری، متحدہ کے لوگوں کی طرف سے جا و بیجا مطالبات، اور کچھ دیگر عوامل نے مل کر اس شعبے میں حالات کو بہت ناسازگار بنا دیا تھا۔ عام کاروباری آدمی ٹرانسپورٹ کے شعبے میں سرمایہ کاری کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ شہر میں چلنے والی بسوں، منی بسوں اور کوچوں کی کل تعداد ضرورت کے مقابلے میں نصف سے بھی کم تھی۔ ماضی میں سویڈن کی کمپنی M.R.V.P کا پیش کردہ منصوبہ، 1984ء میں زمین دوز ٹرین چلانے کا منصوبہ، الیکٹرک ٹرام اور اربن ٹرین بس سروس کے منصوبے تیار ہوئے مگر فقط کاغذوں پر ہی رہ گئے۔ پھر بدقسمتی سے 1996ء میں سرکاری ٹرانسپورٹ کے ادارہ "کراچی ٹرانسپورٹ کارپوریشن" کو مالی طور پر تباہی کے کنارے پہنچا کر بند کر دیا گیا۔ دوسری جانب کراچی سرکلر ریلوے کو ناکام بنانے کے لیے مختلف حربے اختیار کیے گئے، یہاں تک کہ 104 سرکلر ٹرینوں کے ذریعے چلنے والے اس سسٹم کو مسافروں کی عدم دلچسپی کا جواز پیش کر کے 1999ء میں بند کر دیا گیا۔ اس طرح کراچی کی دو کروڑ کے لگ بھگ آبادی ٹوٹی پھوٹی، دھواں اڑاتی بسوں اور ویگنوں میں سفر کرنے پر مجبور تھی۔ چورنگیوں کی ری ماڈلنگ، کشادہ سڑکوں کی تعمیر اور نئے نئے فلائی اوورز سے ٹریفک جام کا سنگین مسئلہ تو کسی حد تک حل ہو گیا تھا لیکن اب بھی بہت سے اہم مسائل حل طلب تھے۔ اس مرحلے پر ٹرانسپورٹ کے نظام کو بہتر بنانے کے لیے ایک "اربن ٹرانسپورٹ اسکیم"

تیار کی گئی۔ اس اسکیم میں مقامی ٹرانسپورٹرز کے علاوہ بیرونی سرمایہ کاروں کی شرکت کو یقینی بنانے کے لیے ٹیکس کی مد میں وفاقی حکومت کی جانب سے رعایتیں بھی دی گئیں۔ اس اسکیم کی بنیادی شرائط میں ڈرائیور اور کنڈیکٹر کا تعلیم یافتہ ہونا اور ٹریفک قوانین کی پابندی کرنا شامل تھا۔ کچھ عرصے میں 22 مختلف کمپنیوں نے شہر میں بسیں چلانے کے لیے رجوع کیا۔ اربن ٹرانسپورٹ اسکیم کے تحت کراچی گرین بس کمپنی، الائیڈ سروسز، ورلڈ وائڈ موٹرز، العزیز روڈ ٹرانسپورٹ کمپنی، Q.S.F اور سویڈ بس پاک لمیٹڈ، انٹرنیشنل ٹرانس لیویا، ہلٹن ٹرانس، نیلم کارپوریشن، الطاف شاہ رخ، اور قائد سٹی بس گروپ نے بڑی بسیں چلانا شروع کر دیں۔ جب کہ بیرون ملک سے درآمد کی جانے والی بسوں کے متعلق وفاقی حکومت نے ایک نوٹیفکیشن جاری کیا تھا کہ یہ بسیں جن شہروں میں درآمد کی جائیں گی صرف وہیں چلائی جائیں گی۔ اس شرط کو پورا کرنے کی صورت میں امپورٹ ڈیوٹی اور ٹیکس معاف کر دیا جائے گا۔ ہم نے گاڑیاں منگوانے کا ارادہ کیا تو اس وقت نوٹیفکیشن میں دی گئی مدت پوری ہو گئی تھی۔

شہریوں کے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے میں سینٹرل بورڈ آف ریونیو کے عہدیداران سے ملاقات کے لیے اسلام آباد گیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہم گاڑیاں منگوانا چاہ رہے تھے، لیکن نوٹیفکیشن کی مدت ختم ہو گئی۔ اس میں کوئی رعایت تو دیں۔ میری گزارش پر انہوں نے تاریخ میں توسیع کر دی۔ اس کے بعد سویڈن کی ایک کمپنی کی 300 بسیں اور دوسری کمپنی کی سی این جی والی گاڑیاں کراچی آگئیں۔ ان گاڑیوں میں باقاعدہ ٹکٹ مشینیں نصب تھیں۔ ہمارے افراد ٹرانسپورٹ کا نظام چیک کرنے کے لیے ان گاڑیوں میں سفر کرتے، دفاتر جانے والے افراد کی معقول تعداد اپنی ذاتی گاڑیوں کے بجائے ان ایئر کنڈیشنڈ گرین بسوں میں سفر کرنے کو ترجیح دینے لگی۔ ٹرانسپورٹ کے نظام کی بہتری کے ساتھ مسافروں کی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے "بس شیلٹرز" کا منصوبہ بنایا گیا۔ یہ شیلٹرز BOT (بلٹ، آپریٹ، ٹرانسفر) کی بنیاد پر تیار کیے جانے تھے اور انہیں تین درجوں میں تقسیم کیا

گیا تھا۔ پہلی درجہ بندی میں بس شیلٹر صرف چھجے اور بیٹھنے کی جگہ پر مشتمل تھا۔ دوسری درجہ بندی میں مسافروں کے لیے بیٹھنے کی جگہ اور ٹک شاپ شامل تھی۔ اور تیسری درجہ بندی میں ٹک شاپ مسافروں کے لیے نشستیں اور مرد و خواتین کے علیحدہ علیحدہ بیت الخلا بھی بنائے جانے تھے۔ ٹک شاپس کے لیے پہلے سے طے کر دیا تھا کہ یہ صرف معذور افراد کو چلانے کے لیے دیے جائیں گے۔ 470 بس شیلٹرز کے منصوبے میں سے پہلا بس شیلٹر شارع فیصل پر عوامی مرکز کے سامنے بنایا گیا۔ باقی جگہوں پر بھی کام جاری تھا۔ شہر میں پبلک ٹرانسپورٹ اور اس میں سفر کرنے والے مسافروں کے مسائل کے حل کے ساتھ ہی انٹرسٹی بس ٹرمینلز کا مسئلہ بھی بہت اہمیت کا حامل تھا، کیوں کہ کراچی سے روزانہ سینکڑوں بسیں ہزاروں مسافروں کو ملک کے مختلف شہروں میں لے کر جاتی اور آتی تھیں۔ لیکن ان بسوں کے لیے کوئی مناسب ٹھکانا نہ ہونے کی وجہ سے تاج میڈیکل کمپلیکس، پرانی سبزی منڈی، سہراب گوٹھ، بنارس چوک، قائد آباد سمیت مختلف جگہوں پر درجنوں غیر قانونی بس ٹرمینل وجود میں آ گئے تھے۔ ان علاقوں کے رہائشیوں کی طرف سے متعدد بار شکایات بھی آ چکی تھیں۔ نظر بھی آ رہا تھا کہ جگہ جگہ بننے والے بس اڈوں کی وجہ سے نت نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ شہر میں آمد و رفت کے تین مرکزی راستے ہیں: 1- سپر ہائی وے، 2- نیشنل ہائی وے، 3- آر سی ڈی ہائی وے یا حب ریور روڈ۔ طے کیا گیا کہ ان ہائی ویز پر انٹرسٹی بس ٹرمینل بنائے جائیں تاکہ ان بڑی بسوں کے شہر میں داخل ہونے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

ٹرانسپورٹ کے محکمے نے بلدیہ ٹاؤن کے علاقے یوسف گوٹھ میں ایک بڑے قطعہ اراضی پر شہر کے پہلے انٹرسٹی بس ٹرمینل کے قیام کا منصوبہ بنایا۔ ورکس اینڈ سروسز کے محکمے کے ای ڈی او سرفراز علی شاہ، ٹرانسپورٹ کے ای ڈی او ڈاکٹر طاہر سومرو، پراجیکٹ ڈائریکٹر محمد اطہر اور میرے معاون محمد طفیل نے اس منصوبے کو خواب سے تعبیر کی شکل دینے کے لیے سخت محنت کی اور ایک ٹیم کی طرح کام کیا۔ اس منصوبے کی افادیت اور اس میں میری

خصوصی دلچسپی کی وجہ سے فنانس ڈپارٹمنٹ نے کبھی فنڈز کی دستیابی کا مسئلہ پیدا نہیں ہونے دیا۔ شہر کے لیے بنائے جانے والے اس بے حد مفید منصوبے کو شیڈول کے مطابق 31 مئی 2005ء تک مکمل ہو جانا چاہیے تھا، لیکن بدقسمتی سے آخری ہفتوں میں یہ منصوبہ کچھ تاخیر کا شکار ہو گیا۔ ہمارے یہاں ایک عجیب سیاسی کلچر رائج ہے کہ نئی حکومتیں سابقہ حکومتوں کے منصوبوں کو جان بوجھ کر دیر سے مکمل کرواتی ہیں تاکہ ایسے منصوبوں کا کریڈٹ لے سکیں۔ بعض اوقات تو پرانی حکومتوں کے شروع کردہ منصوبوں کو بغیر کسی معقول وجہ کے ختم بھی کر دیا جاتا ہے اور عوام کے ٹیکس کے کروڑوں روپے منفی سیاست کی نذر ہو جاتے ہیں۔ بہر حال 9 نومبر 2006ء کو اس منصوبے کا باقاعدہ افتتاح گورنر سندھ ڈاکٹر عشرت العباد نے کر دیا۔

بلوچستان سے آنے والی تمام بسوں کے لیے اس ٹرمینل کی تعمیر سے بہت سہولت ہو گئی۔

کے ڈی اے نے 1995ء میں سپر ہائی وے پر گلشن معمار سے پہلے دیہہ تی امری میں انٹر سٹی بس ٹرمینل کے لیے 45 ایکڑ اراضی مختص کی تھی۔ اس اراضی کے بڑے حصے پر طویل عرصے سے لینڈ مافیا نے قبضہ کیا ہوا تھا۔ کراچی میں سرکاری زمینوں پر مختلف قسم کی سیاسی و غیر سیاسی مافیاؤں کا قبضہ بہت ہی منظم کام ہے اور برس ہا برس سے جاری ہے۔ یہ قبضہ پولیس اور دیگر سرکاری محکموں کے کرپٹ افسران اور نام نہاد سیاسی لیڈروں کی ملی بھگت سے ہوتا ہے، کیونکہ زمینوں پر قبضے کے نتیجے میں اربوں کھربوں روپے کمائے جاتے ہیں، اس لیے اس گھناؤنے کام کو روکنا آسان کام نہیں ہے۔ ایک بار قبضہ ہو جائے تو معاملات آخر کار عدالتوں تک جا پہنچتے ہیں جہاں مقدمات کچھوے کی رفتار سے چلتے ہیں اور اکثر اوقات سرکاری وکیلوں اور تفتیشی افسران کی ملی بھگت کی وجہ سے فیصلے ناجائز قابضین کے حق میں ہی ہو جاتے ہیں۔

نہایت تگ و دو کے بعد پولیس اور رینجرز کے آپریشن کے ذریعے 20 ایکڑ زمین واگزار کروائی گئی۔ بجٹ مختص کر کے اور منصوبہ بندی مکمل کر کے منصوبے کا سنگ بنیاد رکھ دیا

گیا۔ اسی طرح نیشنل ہائی وے پر بس ٹرمینل کے لیے شاہ لطیف ٹاؤن میں ملیر ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے دفتر کے سامنے 15 ایکڑ زمین مختص کی گئی۔ 2 دسمبر 2004ء کو اس منصوبے کا سنگ بنیاد رکھنے کے بعد تعمیر کے لیے باقاعدہ ٹینڈر بھی جاری کروایا۔ افسوس کہ ہمارے بعد آنے والوں نے اس جانب توجہ نہیں دی۔

کشادہ سڑکوں کی تعمیر اور چورنگیوں کی ری ماڈلنگ سے جہاں ایک طرف شہریوں کو تیز رفتار ٹریفک کی سہولت ہوگئی تو دوسری طرف بہت سے مقامات پر پیدل چلنے والے افراد کے لیے سڑک عبور کرنا مسئلہ بن گیا۔ اس کے حل کے لیے شہر کی مصروف ترین شاہراہوں کے 28 مقامات پر زیبرا کراسنگ و لین پارکنگ کے ساتھ بالائی گزرگاہیں تیار کرنے کا ارادہ کیا۔ 55 سے 60 لاکھ کی لاگت سے تیار ہونے والے یہ پیڈسٹرین برج بھی BOT کی بنیاد پر بنائے جانے تھے۔ ابتدائی مرحلے میں 13 پیڈسٹرین برج تیار کیے گئے۔ اس کے علاوہ شہر میں پبلک اور پرائیویٹ ٹرانسپورٹ کی تعداد میں غیر معمولی اضافے کی وجہ سے پارکنگ کا مسئلہ بھی شدت اختیار کر گیا تھا۔ سروے رپورٹس بھی یہی بتا رہی تھیں کہ اگر کوئی معقول بندوبست نہ کیا گیا تو صورت حال قابو سے باہر ہوجائے گی۔ اس لیے باہم مشاورت سے طے کیا گیا کہ ترقی یافتہ ممالک کی طرح ملٹی اسٹوری پارکنگ پلازے بنانے کا منصوبہ تیار کیا جائے۔ ابتدائی مرحلے میں تین مصروف جگہوں پر پارکنگ پلازوں کی تعمیر کا پروگرام بنایا گیا۔ اس کے لیے صدر کے مصروف علاقے ایمپریس مارکیٹ، کلفٹن اور حسن اسکوائر کا انتخاب کیا گیا۔ بعد میں صرف ایک یعنی ایمپریس مارکیٹ والا پارکنگ پلازہ تعمیر کیا گیا، لیکن نامناسب انداز کے انتظامات کی وجہ سے لوگ استفادہ نہیں کر پا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ شہر میں بڑھتے ہوئے ٹریفک حادثات کی روک تھام کے لیے روڈ سیفٹی ایجوکیشن کا پروگرام بھی بنایا گیا۔ اس منصوبے کے تحت ایک مربوط پلان تیار کیا گیا، جس میں ڈرائیوروں اور عام شہریوں کو ٹریفک اصولوں کی پابندی کی تربیت اور بچوں کو روڈ سیفٹی

کی تعلیم دینے کے لیے روڈ سیفٹی ایجوکیشنل یونٹ کا قیام شامل تھا۔ اس یونٹ کے ذمہ داران شہر کے مختلف اسکولوں میں جا کر بچوں کو لیکچر اور ویڈیو فلمز کی مدد سے روڈ سیفٹی کے اصولوں سے آگاہ کرتے تھے۔ اسی طرح پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کرنے والے مسافروں کے ساتھ ڈرائیورز اور کنڈیکٹرز کے خراب رویوں کو بدلنے کے لیے سائٹ کے علاقے میں واقع گزشتہ کئی برسوں سے بند کے ٹی سی کے ڈرائیورز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کو دوبارہ فعال کرنے کا منصوبہ تیار کیا گیا۔ میری نظامت مکمل ہونے کے بعد یہ منصوبہ بھی سرد خانے کی نذر ہو گیا۔

ماس ٹرانزٹ منصوبہ

ماہرین کراچی میں پبلک ٹرانسپورٹ کے گمبھیر مسئلے کا ایک ہی حل تجویز کرتے ہیں، اور وہ ہے ماس ٹرانزٹ۔ ملک ظہیر الاسلام ہمارے ڈائریکٹر جنرل ماس ٹرانزٹ تھے۔ محنتی اور تجربہ کار افسر تھے۔ انہوں نے ہماری ٹیم کے ساتھ مل کر ماس ٹرانزٹ منصوبے کے لیے بہت محنت اور لگن سے کام کیا۔ جب تعمیر کراچی پروگرام کی منظوری ہوئی تو ہم نے ماس ٹرانزٹ کے منصوبے کو بھی اس میں شامل کر دیا۔ اخبارات میں ٹینڈر جاری کروائے گئے کہ بی او ٹی یعنی بلٹ آپریٹ ٹرانسفر کی بنیاد پر جو کمپنیاں شہر میں ماس ٹرانزٹ کے منصوبے پر کام کرنا چاہتی ہیں وہ اپنے پروپوزل جمع کروائیں۔ شہر میں ماضی قریب میں امن و امان کے جو بدترین حالات رہے تھے، ان کی وجہ سے ملکی و غیر ملکی سرمایہ کار خوف زدہ تھے، خاص طور پر ٹرانسپورٹ کے شعبے میں بڑی سرمایہ کاری کرتے ہوئے اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا ہو جاتے تھے۔

ماس ٹرانزٹ کے منصوبے میں ہم نے ابتدائی طور پر دو کوریڈورز کو شامل کیا، ایک سہراب گوٹھ سے ٹاور تک، جبکہ دوسرا کینٹ اسٹیشن سے اورنگی ٹاؤن تک۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اس کوریڈور کو بنارس چوک پر ختم کر دیا جائے کیونکہ آگے کی سڑک اتنی چوڑی نہیں تھی اور انکروچمنٹ کے مسائل بھی تھے۔ میں نے اس تجویز کو سختی سے رد کر دیا اور کہا کہ اورنگی ٹاؤن کو لازمی طور پر شامل کیا جائے۔

ہم نے جن کمپنیوں سے ٹرانسپورٹ کے شعبے میں مفاہمت کی یادداشتوں پر دستخط کیے

تھے، ان کو بھی ہدایت کی گئی کہ ٹینڈر میں شریک ہوں، کیونکہ شفافیت اور مسابقت ہمارا بنیادی اصول تھا جس پر کوئی سمجھوتا کرنے پر نہ میں راضی تھا اور نہ ہی میری ٹیم کا کوئی فرد۔

دو کمپنیوں نے پروپوزل جمع کروائے۔ ایک امریکی کمپنی تھی American Maglev Technology Inc,USA جس نے میگنیٹک لیوی ٹیشن ٹرین کا منصوبہ پیش کیا، جسے ہماری ٹیم کے اراکین نے اس بنیاد پر مسترد کر دیا کہ یہ ٹرین کچھ ہی عرصہ قبل تجرباتی مراحل سے گزری تھی اور اس کمپنی کی مالی پوزیشن بھی بہت مستحکم نظر نہیں آرہی تھی۔ دوسری کمپنی چین کی بہت بڑی کمپنی تھی، جس کا نام China National Machinery and Equipment Corporation Group (CNMEG) تھا۔

منصوبہ دراصل یہ تھا کہ دنیا کے دیگر بڑے شہروں کی طرح مونوریل چلائی جائے گی جو کچھ فاصلہ زمین کی سطح سے اوپر بنائے گئے پلرز اور ٹریک پر طے کرے گی، جبکہ بقیہ فاصلہ زیرِ زمین ٹریک پر طے کرے گی۔ یہ بے حد مفید منصوبہ تھا اور اس کی تکمیل کراچی میں پبلک ٹرانسپورٹ کے شعبے میں خوشگوار انقلاب کا سبب بن سکتی تھی۔

چینی کمپنی CNMEG نے 568 ملین ڈالر کا منصوبہ پیش کیا لیکن وہ بی او ٹی کی نہیں بلکہ کریڈٹ فنانسنگ کی بنیاد پر تھا۔ کمپنی نے پیشکش کی کہ ہم سرمائے کا بندوبست بھی کریں گے اور منصوبہ مکمل بھی کریں گے۔ سٹی گورنمنٹ تیس سال کے بعد آسان اقساط میں ادائیگی کرنے کی پابند ہوگی۔ اس سلسلے میں انہوں نے چین کے ایک بہت بڑے بینک AXIM Bank سے فنانسنگ کے معاملات بھی اصولی طور پر طے کر لیے فزی بلیٹی بھی تیار کر لی گئی، اور ہمارا خیال تھا کہ اس منصوبے کے شروع ہونے میں اب کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی۔ کیونکہ دو ملکوں کے درمیان اس طرح کے بڑے منصوبوں میں سرمایہ کاری کی ایک شرط ہوتی ہے ساورن گارنٹی، یعنی یہ کہ اس قرض کی واپسی کی ضامن حکومت ہوگی۔ لہٰذا میں نے

صدر پرویز مشرف کو اعتماد میں لے کر ساری صورت حال بتائی۔

کچھ دن بعد اسلام آباد میں ایک اعلیٰ سطحی اجلاس بلایا گیا۔صدر پرویز مشرف بھی اس اجلاس میں شریک ہوئے۔جبکہ صدارت وزیر اعظم شوکت عزیز نے کی۔اس اجلاس میں گورنر سندھ ڈاکٹر عشرت العباد کے علاوہ متحدہ کے بابر غوری اور ڈاکٹر فاروق ستار بھی شریک تھے۔ڈپٹی چیئرمین پلاننگ کمیشن اکرم شیخ نے میری بریفنگ کے بعد رائے دی کہ ہم کریڈٹ فنانسنگ کی منظوری نہیں دے سکتے اور یہ منصوبہ بی او ٹی کی بنیاد پر ہی بنایا جانا چاہیے۔وزیر اعظم شوکت عزیز نے بھی اکرم شیخ کے موقف کی تائید کی اور حیران کن طور پر بابر غوری اور ڈاکٹر فاروق ستار نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ڈاکٹر عشرت العباد نے بھرپور انداز میں میرے موقف کی تائید کی اور کہا کہ نعمت اللہ خان صاحب کی تجویز قابل عمل ہے۔وفاقی حکومت کو کراچی کے اس اہم ترین منصوبے کے لیے ان کی تجویز کو منظور کرنا چاہیے۔اکرم شیخ نے صدر پرویز مشرف کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ہم چینی کمپنی کے نمائندوں کو بی او ٹی پر قائل کرلیں گے۔پرویز مشرف صاحب نے جب یہ صورت حال دیکھی تو کہنے لگے کہ نعمت صاحب! آپ کو تو پراجیکٹ سے غرض ہے نا۔جب یہ کہہ رہے ہیں کہ بی او ٹی پر راضی کرلیں گے تو آپ ان کی بات مان لیں۔میرے پاس مزید کچھ کہنے یا بحث کرنے کی گنجائش نہیں تھی، کیونکہ میٹنگ کے شرکاء کی اکثریت کا ذہن کچھ اور تھا۔افسوس تو مجھے متحدہ کے دونوں رہنماؤں کے رویے پر تھا جنہوں نے نجانے کیوں اس دن اکرم شیخ کی تجویز کی حمایت کی۔نیتوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے لیکن ہمارے کچھ رفقاء کا خیال تھا کہ وہ یہ ہضم نہیں کرپارہے تھے کہ جماعت اسلامی کے سٹی ناظم کو شہر کے اہم ترین عوامی منصوبے کا کریڈٹ ملے۔میری ذاتی رائے یہ تھی کہ انہوں نے محض مخالفت برائے مخالفت کی تھی۔

مخالف کی اچھی بات اور اچھے منصوبوں پر بھی مثبت رویہ نہ اپنانا ہمارا مجموعی سیاسی

مزاج بن چکا ہے جسے تبدیل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ یہ رویہ ملک کی ترقی کے راستے کی ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

اس طرح چینی کمپنی کے ذمہ داران بوجھل دل کے ساتھ رخصت ہو گئے اور شہر میں ماس ٹرانزٹ کا منصوبہ فائلوں میں ہی دم توڑ گیا۔

بیرون ملک دورے کے دوران [illegible] کے ساتھ

جمشید ٹاؤن کے ناظم احمد پاریکھ نے جاپانی قونصل جنرل کو سٹی گورنمنٹ کا تحفہ پیش کیا

جاپان کے قونصل جنرل نے دفتر میں آکر ملاقات کی، میں نے شیلڈ پیش کی

غیر ملکی سرمایہ کاروں کے وفد نے سٹی گورنمنٹ کے دفتر میں ملاقات کی

لندن کے دورے کے دوران چوہدری محمد سرور نے ملاقات کی اور کراچی سٹی گورنمنٹ کی کارکردگی کو سراہا

چین کے دورے کی ایک یادگار تصویر

تعلیم ۔ میرٹ پر کوئی سمجھوتا نہیں

کراچی کی نظامت سنبھالتے وقت صاف نظر آ رہا تھا کہ زندگی کے اکثر شعبوں کے اداروں اور ان میں جاری نظام نہایت بوسیدہ ہو چکے ہیں۔ کچھ ایسی ہی صورت حال شعبۂ تعلیم کی تھی۔ مسائل کا ایک انبار تھا اور دگرگوں احوال کے لیے کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ مختلف ماہرین سے مشاورت کے بعد طے کیا کہ سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں معیارِ تعلیم کو بہتر بنانے کے لیے کچھ عملی اقدامات کیے جائیں۔ ماضی قریب میں شہر کے سرکاری تعلیمی ادارے سیاسی اور سفارشی بھرتیوں کی وجہ سے مضحکہ خیز بن کر رہ گئے تھے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ پورے شہر کے سرکاری اسکولوں میں بہت تھوڑے طلبہ و طالبات اے ون گریڈ حاصل کر پاتے تھے۔ اگلے دو برسوں میں جو اقدامات اٹھائے گئے اُن کے نتیجے میں اساتذہ کی دلچسپی اور اعتماد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ گھوسٹ اساتذہ کی تعداد نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ تیسرے سال انہی اسکولوں میں اے ون گریڈ حاصل کرنے والے طلبہ و طالبات کی تعداد بڑھ کر دو ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ سال 2000ء میں انٹر کالجوں کے لیے مرکزی داخلہ پالیسی (Central Admissio Policy) متعارف کروائی گئی تھی۔ اس پالیسی کے تحت کالجوں کے سینئر اساتذہ پر مشتمل ایک کمیٹی کو داخلوں کے پورے عمل کی نگرانی کرنی تھی اور اس بات کو یقینی بنانا تھا کہ تمام داخلے قواعد و ضوابط کے مطابق میرٹ پر ہوں گے۔ داخلوں کے لیے علاقائی بنیادوں پر جاری زونل سسٹم کو ختم کر دیا گیا۔ سندھ گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیم کی یہ پالیسی

بہت بہتر تھی اور اس سے انٹرمیڈیٹ میں داخلوں کا عمل بڑی حد تک شفاف ہوگیا تھا۔
نئے صوبائی وزیر تعلیم عرفان اللہ مروت کو مرکزی داخلہ پالیسی ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ مختلف طالب علموں کے ایک کالج سے دوسرے کالج میں تبادلے کی سفارش کی پرچیاں میرے پاس بھیجنا شروع کر دیں، جو میں نے اپنے پاس رکھ لیں اور ان سے رابطہ کر کے کہا کہ یہ پالیسی شہر کے مفاد میں ہے اور میں نے پوری زندگی میرٹ سے ہٹ کر کوئی کام نہیں کیا ہے۔ لہٰذا آپ کی پرچیوں کے مطابق نہ کسی کا ٹرانسفر ہوگا اور نہ ہی خلاف میرٹ داخلہ دیا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ سٹی ناظم کو اس کا اختیار حاصل ہے (ظاہر ہے کہ انہوں نے افسران سے معلومات لے لی ہوں گی)۔ میں نے سخت لہجے میں کہا کہ اختیارات کے ان چور دروازوں کو بند کرنا ہی میرا مشن ہے۔ اس بات پر انہوں نے بڑی سبکی محسوس کی اور انا کی تسکین کے لیے باقاعدہ نوٹیفکیشن جاری کروا دیا کہ کالج کے پرنسپل صاحبان جب چاہیں اور جہاں چاہیں اپنے اسٹوڈنٹس کا تبادلہ کر سکتے ہیں۔ یہ بات میرے لیے ناقابل برداشت تھی کہ ایک اچھی پالیسی کو اس طرح سبوتاژ کر دیا جائے۔ ایک سینئر صحافی کے مشورے پر جنرل طارق وسیم غازی کے پاس ملاقات کے لیے گیا اور پہلے تو انہیں ''کیپ'' پالیسی کے متعلق تفصیلاً بتایا۔ پھر صوبائی وزیر تعلیم کی جانب سے کھڑی کی جانے والی رکاوٹوں اور نوٹیفکیشن کے بارے میں بتایا، تو انہوں نے بھی برہمی کا اظہار کیا، اور مجھ سے تبادلوں کی پرچیاں لیتے ہوئے کہنے لگے: آپ بے فکر ہو جائیے۔ اگلے ہی دن صورت حال پرانی پوزیشن پر واپس آگئی۔ وزیر موصوف غصے میں اتنا آگے چلے گئے تھے کہ تعلیمی معاملات میں میری معاونت کرنے والے نسیم صدیقی کے خلاف ای ڈی او ایجوکیشن پروفیسر رئیس علوی کے نام ایک نوٹس جاری کیا کہ نسیم صدیقی کے احکامات تسلیم نہ کیے جائیں۔ حالانکہ نسیم صدیقی یا میرا کوئی بھی معاون افسران کو احکامات جاری کرنے کا اختیار رکھتا ہی نہیں تھا، اور نہ کبھی کسی افسر نے کوئی ایسی شکایت کی۔ نسیم صدیقی نے شعبۂ تعلیم کے کوآرڈینیٹر کی ذمہ

داری سنبھالتے ہی اس بات پر توجہ دلائی کہ ہر سال میٹرک پاس کرنے والے طلبہ و طالبات کی تعداد بڑھتی جارہی ہے جب کہ انٹر کالجوں کی تعداد محدود ہے۔ اُس وقت شہری حکومت کے ماتحت 88 کالج تھے۔ اس مسئلے کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے پہلے سال چار کالج، دوسرے سال آٹھ، تیسرے سال دس اور چوتھے سال بھی دس کالج قائم کیے گئے۔ اکثر کی عمارتیں برس ہا برس سے زیرِ تعمیر تھیں۔ سرکاری محکموں خصوصاً تعلیم اور صحت کے شعبوں میں یہ عام سی بات ہے کہ سیاسی لوگ منصوبوں کا اعلان کرتے ہیں، افسران ان پر کام شروع کرواتے ہیں اور پھر افسران اور ٹھیکیداروں کے گٹھ جوڑ سے وہ منصوبے لمبے عرصے تک تمام لوگوں کے لیے معقول آمدنی کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے سندھ اور بلوچستان کی صورت حال اس معاملے میں زیادہ خراب ہے۔ ہمارے ساتھ کیونکہ پاکستان انجینئرز فورم کے قابل اور مخلص انجینئرز کی پوری ٹیم موجود تھی اور ہر علاقے کے منتخب نمائندے برسوں سے رکے ہوئے منصوبوں کی نشاندہی کرتے رہتے تھے، لہٰذا زیرِ تعمیر عمارتوں کو بہت تیزی سے مکمل کروایا گیا۔ الحمد اللہ، تعلیم اور صحت کے منصوبوں کے لیے فنڈز کے اجراء میں کبھی مسئلہ پیدا ہونے نہیں دیا گیا۔ ایک بڑی مشکل یہ تھی کہ اساتذہ کی بھرتی پر پابندی اور ایس این ای (Sanctioned New Strength) کی منظوری نہ ہونے کی وجہ سے نئے اداروں میں تدریس کا عمل شروع نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس رکاوٹ کا فوری حل یہ نکالا گیا کہ کراچی کے مختلف تعلیمی اداروں میں خدمات انجام دینے والے سینئر اساتذہ سے درخواست کی کہ وہ نوتعمیر شدہ کالجوں میں اعزازی حیثیت میں طلبہ و طالبات کو پڑھائیں۔ الحمد للہ اس اپیل پر بہت سارے اساتذہ نے لبیک کہا۔ تقریباً ساڑھے چار سو درخواستیں موصول ہوئیں جن میں سے 140 اعزازی اساتذہ کو منتخب کیا گیا جو طویل عرصے تک بلامعاوضہ تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ کراچی کی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی مثال تھی۔ کروڑوں روپے خرچ کرکے 32 پرانے کالجوں میں نئی کلاسیں، آڈیٹوریم، لیبارٹریز وغیرہ قائم کی

گئیں۔ کراچی کے اکثر کالجوں میں کمپیوٹر لیب بنائی گئیں۔

شہر میں واقع فنی تعلیمی اداروں کا حال بھی کالجوں سے کچھ مختلف نہیں تھا، جب کہ ان اداروں سے رجوع کرنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جارہی تھی۔ کراچی کے مضافاتی علاقوں لانڈھی، کورنگی، ملیر، بلدیہ ٹاؤن، گڈاپ اور اورنگی ٹاؤن میں فنی تعلیم و تربیت کے لیے 9 مونوٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ قائم کیے گئے۔

تعلیم اور تعلیمی اداروں کی بہتری کے حوالے سے کیے جانے والے عملی اقدامات اور ان کے حوصلہ افزا نتائج دیکھ کر شہر کے بڑے تعلیمی اداروں کے سربراہان نے ازخود اپنے طلبہ و طالبات کو سہولیات فراہم کرنے کی کوششیں شروع کردیں۔ اس ضمن میں آمد و رفت کے لیے بسوں کی ضرورت ان کے لیے سرفہرست تھی۔ تعلیمی اداروں کو بسیں دینے کی روایت سابق میئر عبدالستار افغانی صاحب نے شروع کی تھی، جسے بعد میں بھی جاری رکھا گیا۔ شہری حکومت کی نظامت سنبھالنے کے بعد میرے پاس بھی بسوں کی فراہمی کے حوالے سے درخواستیں آنا شروع ہوگئیں، گو کہ ان کی تعداد زیادہ تھی لیکن ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے کراچی یونیورسٹی کو دو لگژری بسیں، گورنمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی (سائٹ) کو ایک، سرسید گرلز کالج کو ایک، اور دعوۃ اکیڈمی کراچی کیمپس کو ایک بس دی گئی۔

نظام تعلیم کی بہتری اور درس گاہوں کی درستی کا بیڑہ اٹھاتے وقت یہ اندازہ نہیں تھا کہ دکھائی دینے والی بظاہر چھوٹی چھوٹی چیزیں درحقیقت بڑے مسئلے سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ اور ستم ظریفی یہ کہ ہر مسئلے کے کئی ذیلی پہلو بھی ساتھ چلے آتے۔ اس بات کی توثیق یوں بھی ہوتی تھی کہ سابقہ کے ایم سی کے تحت چلنے والے کوئی ساڑھے تین ہزار اسکول اس حالت میں ملے کہ وہاں پڑھنے والے بچوں کے والدین کے پاس غربت کی وجہ سے کوئی اور آپشن نہ تھا، ورنہ وہ ان انتہائی غیر معیاری اسکولوں میں اپنے بچوں کو کبھی نہ بھیجتے۔ سیاسی بھرتیوں نے کراچی میں سب سے زیادہ نقصان سرکاری تعلیمی اداروں کو پہنچایا تھا۔ ایک دم

اسکولوں کی اتنی بڑی تعداد کو ٹھیک کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ سٹی گورنمنٹ کے پہلے بجٹ میں تعلیم کے لیے 31 فیصد رقم مختص کی گئی جو اربوں روپے تھی۔ والدین کے مالی بوجھ کو کم کرنے کے لیے نہ صرف ٹیوشن فیس ختم کر دی گئی بلکہ ایک قدم آگے جاتے ہوئے پہلی جماعت سے لے کر پانچویں جماعت کے طلبا اور پہلی جماعت سے لے کر آٹھویں جماعت کی طالبات کو مفت کتابیں فراہم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ یہ شکایت عام تھی کہ اس سے قبل گورنمنٹ اسکیم کے تحت مفت فراہم کی جانے والی کتابیں محکمہ تعلیم کا عملہ فروخت کر دیا کرتا تھا، اور بچوں تک بہت کم کتب پہنچ پاتی تھیں۔ اس لیے بدعنوانی کے سدباب، اعتماد کی بحالی اور تقسیم کے عمل کی نگرانی کے لیے کمیٹی تشکیل دی گئی، اس میں محکمہ تعلیم کے افسران، سٹی کونسل کے اراکین میں سے یوسی ناظمین، اور مرد و خواتین کونسلرز کو بھی شامل کیا گیا۔ سرکاری اسکولوں میں زیر تعلیم طالبات کی حوصلہ افزائی کے لیے اسکالرشپ کا نظام متعارف کرایا گیا۔ درجنوں اسکولوں کو قواعد و ضوابط اور کارکردگی کے مطابق پرائمری سے لوئر سیکنڈری، اور لوئر سیکنڈری سے سیکنڈری اسکولوں میں اپ گریڈ کیا گیا۔ کئی بڑے اسکولوں کو ہائر سیکنڈری اسکولوں کا درجہ بھی دیا گیا جہاں بارہویں کلاس یعنی انٹر تک تعلیم دی جانے لگی۔

"آپ نے اسکولوں کی تعمیر، توسیع اور ظاہری حسن کو بہتر کرنے پر تو خوب توجہ دی ہے، ذرا تعلیمی نظام اور اس کے بنیادی کردار یعنی "استاد" کی علمی و فکری تربیت کا کچھ اہتمام کیجیے" اکثر احباب ملاقاتوں میں یہ بات کہتے۔ اور واقعی اس بارے میں کوئی دو رائے نہیں تھیں کہ ذہن سازی اور بہترین خطوط پر تربیت روزِ اول سے کیا جانے والا باقاعدہ کام ہے۔ اس لیے باہمی مشاورت سے طے کیا کہ اس سلسلے کا آغاز بالکل ابتدائی کلاسوں سے کیا جائے۔ لیکن عمومی صورت حال یہ تھی کہ سرکاری اسکولوں میں نرسری، مونٹیسوری اور کے جی کلاسیں نہ ہونے کی وجہ سے والدین اپنے بچوں کے لیے پرائیویٹ اسکولوں کا انتخاب کرتے تھے۔ اس لیے پہلے تو تمام سرکاری اسکولوں میں پری پرائمری کلاسز شروع کرنے کا فیصلہ کیا

گیا۔اس کے بعد اساتذہ کی تربیت کے ضمن میں پہلے کراچی کے اسکولوں کے مرد و خواتین اساتذہ کو جمعیت تعلیم القرآن (ٹرسٹ) کے تعاون سے قرآن پاک کی تعلیم تجوید کے ساتھ شروع کرانے کا انتظام کیا گیا، اور تین مراحل میں دو ہزار اساتذہ کو قرآن مجید کی تعلیم تجوید کے ساتھ دی گئی۔ پھر اساتذہ کی جدید طریقوں سے پیشہ ورانہ تربیت کے لیے تمام مضامین میں کراچی کے ماہرین تعلیم سے رجوع کرنے کے بعد 500 مرد و خواتین اساتذہ کا انتخاب کیا گیا۔ انھیں ''پیشہ ورانہ ترقیاتی تربیتی پروگرام'' (Professional Development Training Program) کے لیے گورنمنٹ کمپری ہینسو ہائی اسکول نارتھ ناظم آباد میں ڈسٹرکٹ آفیسر کے ذریعے بلایا گیا۔ اس وقت کے ای ڈی او ایجوکیشن گل محمد حاجیانو کو نامعلوم کیوں یہ پروگرام کھٹنے لگا، انہوں نے پرنسپل کو حکم دیا کہ ٹریننگ کے لیے آنے والے اساتذہ کے لیے اسکول کا دروازہ نہ کھولا جائے۔ مجھے اطلاع ملی تو فیصلہ کیا کہ بغیر اطلاع کے اسکول کا دورہ کروں گا۔ شاید انہیں میرے ارادے کی بھنک مل گئی، اس لیے وہ رکاوٹ ڈالنے سے باز رہے۔ آخر میں اسلامی نظامت تعلیم کے تحت مرکز قرآن و سنہ (المرکز اسلامی، فیڈرل بی ایریا) میں دو روزہ پرنسپلز ٹریننگ پروگرام کا اہتمام کیا گیا، جس میں سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ کے اسکولوں کے 350 مرد و خواتین پرنسپلز، اور کراچی اور اندرون سندھ کے نجی تعلیمی اداروں کے 1400 نمائندوں نے شرکت کی۔ ایک موقع پر مسز دانیال عزیز نے جو خود بھی تعلیم کے شعبے سے وابستہ تھیں، چھوٹے بچوں کو پڑھانے والے اساتذہ کو تربیت دی۔ طلبہ و طالبات کے ذہنوں میں نظریہ پاکستان کو راسخ کرنے کے لیے نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن کے تعاون سے سٹی گورنمنٹ کے مختلف تعلیمی اداروں میں تقریری مقابلوں کا اہتمام کیا جاتا رہا۔ نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن کی دعوت پر لاہور جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں کے سٹی ناظم میاں عامر محمود کے ساتھ کراچی اور لاہور کو نظریاتی جڑواں شہر قرار دینے کا فیصلہ کیا، اور اس کے ساتھ اسکولوں میں باقاعدہ نوٹس جاری

کروایا کہ نظریہ پاکستان کے خلاف، یا کوئی غیر اخلاقی پروگرام منعقد نہیں ہونا چاہیے۔ اور کونسلرز کو نگرانی کے لیے متعین کیا۔

ایک جانب ہم تعلیمی اداروں کو عمدہ سہولیات سے آراستہ کرنے کی کوششیں کر رہے تھے، اور دوسری جانب محکمہ تعلیم کے بعض ذمہ داران کرپشن کے لیے موقع کی تاک میں رہتے تھے جیسے انٹر بورڈ کے ایک چیئرمین نے اسکول مینجمنٹ کمیٹی (SMC) کے حوالے سے ایک میٹنگ طلب کی۔ (بنیادی طور پر یہ کمیٹیاں اسکول وکالج کے تعلیمی نظام کو بہتر بنانے کے لیے تشکیل دی گئی تھیں۔ کمیٹیاں اسکول پرنسپل، اساتذہ، والدین، ناظمین اور کونسلرز پر مشتمل تھیں اور انہیں 2002ء میں 4 ہزار روپے فی کلاس روم اور 2003ء میں 167 روپے فی طالب علم کے حساب سے رقم مہیا کی گئی تھی تاکہ یہ اسکول وکالج میں معمول کے ترقیاتی کام، فرنیچر کی خریداری، رنگ و روغن، کوآپریٹو اساتذہ کی تقرری سمیت دیگر اقدامات خود کرسکیں)۔ خیر، انٹر بورڈ کے چیئرمین موصوف نے طلب کی گئی میٹنگ میں تمام ڈی اوز ایجوکیشن کو بلایا ہوا تھا اور انہیں پراجیکٹس کی لسٹ تھماتے ہوئے کہنے لگے: کانٹریکٹر کے نام کے بل بنا کر دے دیں۔ کسی ذریعے سے پتا چلا کہ یہ تمام پراجیکٹس کاغذی ہیں۔ سیکریٹری سے کہا: فوراً نوٹس جاری کریں کہ آئندہ میری اور ڈی سی او کی منظوری کے بغیر ایس ایم سی منظور نہ کی جائے۔ اس اقدام پر چیئرمین صاحب بہت ناخوش ہوئے۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ پیش آیا، جب ہم نے سیکنڈری اسکولوں میں کمپیوٹر لیبس میں کمپیوٹر فراہم کرنے کا ارادہ کیا تو ایک ڈی او ایجوکیشن کہنے لگے کہ یہ کمپیوٹر ہمارے ذریعے تقسیم کرائے جائیں۔ انہوں نے بالا ہی بالا کچھ کمپیوٹر سپلائرز سے رابطہ بھی کرلیا۔ کچھ اسکول پرنسپلز کی شکایات موصول ہوئیں کہ ہمیں کمپیوٹر دیے بغیر وصولی کے دستخط کرا لیے گئے ہیں۔ میں نے تقسیم کے لیے خریدے گئے سارے کمپیوٹرز کوں میں لوڈ کروا کر سوک سینٹر منگوا لیے اور اسکولوں کے ہیڈ ماسٹرز کو کہا

کہ اپنے حصے کے دس دس کمپیوٹر لے جائیں۔ اس طرح کے چھوٹے موٹے بیسیوں واقعات پیش آتے رہے، لیکن نسیم صدیقی اور سٹی کونسلر ریحانہ افروز اور ان کی ساتھی خواتین کونسلرز کے بے پناہ تعاون کی وجہ سے بہت حد تک مسائل پر قابو پالیا تھا۔

فیڈرل بی ایریا کے بلاک 7 میں شاہراہ پاکستان کے کنارے ایک شاندار عمارت 80ء کی دہائی سے موجود تھی۔ یہ بلدیہ عظمیٰ کراچی کی ملکیت تھی اور جماعت اسلامی کے رہنما وسابق کونسلر بلدیہ عظمیٰ اخلاق احمد صاحب کی تجویز پر اسے بنایا اور "المرکز اسلامی" کا نام دیا گیا تھا۔ اخلاق احمد صاحب اسے ایک معیاری دینی، تہذیبی وثقافتی مرکز کے طور پر دیکھنا چاہتے تھے۔ پلاٹ کے حصول سے لے کر عمارت کی تعمیر تک انہوں نے اور میئر افغانی نے اس منصوبے میں بہت دلچسپی لی تھی۔ بدقسمتی سے افغانی صاحب کے بعد میئر بننے والے ڈاکٹر فاروق ستار نے اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور نہ ہی بعد میں آنے والے کسی ایڈمنسٹریٹر نے اسے مکمل کروانا ضروری سمجھا۔

سٹی ناظم بننے کے بعد میں نے اس عمارت کا دورہ کیا اور اس کی تزئین و آرائش کا حکم دیا۔ کمیونٹی ڈیولپمنٹ ڈپارٹمنٹ کے سینئر افسر سیف الرحمٰن گرامی، عبدالرشید بیگ، انصار رضی اور قاضی صدرالدین میرے ساتھ تھے۔ گرامی صاحب نے ہمیں آڈیٹوریم کا دورہ کروایا اور ایک کمرے میں رکھی ایک درجن سے زیادہ سنگ مرمر کی تختیاں دکھائیں جن پر ایشیا کے عظیم مصور اور خطاط صادقین کی خطاطی موجود تھی۔ بلاشبہ یہ فن پارے نادرو نایاب تھے جن کی قیمت کا اندازہ لگانا ممکن ہی نہیں تھا۔

میں نے حکم دیا کہ آڈیٹوریم کے لیے اعلیٰ معیاری کرسیاں خریدی جائیں اور چلر پلانٹ نصب کروایا جائے تاکہ برسوں سے زیر تکمیل اس عظیم الشان عمارت کو اس کے اصل مقاصد کے لیے استعمال کیا جاسکے۔ عمارت میں بنیادی سہولتوں کی فراہمی کے بعد کئی بڑے تعلیمی وتربیتی پروگرام منعقد کیے گئے۔ ایک سال نماز تراویح کا اہتمام بھی کیا گیا۔ کراچی

جماعت کے نائب قیم انجینئر حافظ نعیم الرحمٰن نے اپنی دلکش تلاوت سے مقتدیوں کو بہت متاثر کیا۔ ہماری کوشش تھی کہ اس عمارت میں ایک مرکز قرآن و سنہ قائم کیا جائے جو ایک گورننگ باڈی کے ماتحت خودمختار ادارہ ہو، اور تحقیق و تالیف کا کام بھی اس کے دائرۂ کار میں شامل ہو۔ اس کا خاکہ مرتب کرنے کے لیے میں نے ابو احمد عاکف سے بات کی، جو کراچی کے سابق ایڈیشنل کمشنر رہ چکے تھے اور اس وقت نیپا کراچی کے چیف انسٹرکٹر تھے۔

میرے بعد ناظم بننے والے مصطفیٰ کمال نے اس منصوبے کو بوجوہ آگے بڑھانا مناسب نہیں سمجھا۔ شاید وہ متحدہ کے سیکولر ہونے کے تاثر کو خراب نہیں ہونے دینا چاہتے تھے، یا ہوسکتا ہے کہ یہ منصوبہ ان کی ترجیحات میں ہی شامل نہ ہو!

جنوری 2003ء میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو ہماری پوری ٹیم کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ گلبرگ ٹاؤن کی یونین کونسل 7 واٹر پمپ کے ناظم فیضان اللہ خان الخدمت گروپ کے اہم ناظمین میں شامل تھے اور اپنی ٹیم کے ساتھ یوسی میں بہت اچھے انداز میں کام کررہے تھے۔ اس سے قبل وہ ڈاکٹر معراج الہدیٰ کے ساتھ جماعت اسلامی ضلع وسطی کے نائب قیم بھی رہ چکے تھے۔ ان کے روابط دیگر سیاسی جماعتوں کے لوگوں سے بھی تھے اور وہ ہر ایک کی بلاتفریق خدمت کے قائل تھے۔ 15 جنوری 2003ء کی رات متحدہ کے مقامی یونٹ انچارج سلمان دو افراد کے ساتھ کسی کام سے یونین کونسل کے دفتر آئے۔ فیضان اللہ کے بقول سلمان نام کا یہ نوجوان شادی کے بعد متحدہ کی سرگرمیوں سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہ رہا تھا اور وہ ان سے مستقل رابطے میں تھا۔ اس وقت فیضان اللہ کے ساتھ یوسی کے نائب ناظم لیاقت علی خان اور کچھ کونسلر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ملاقات کے بعد جب سلمان اور اس کے دوست باہر نکلے تو وہاں گھات لگائے ہوئے دہشت گردوں نے ان پر فائرنگ کردی۔ فیضان اللہ اور ان کے ساتھی فائرنگ کی آواز سن کر باہر نکلے تو انہیں تینوں افراد

شدید زخمی حالت میں ملے۔ لیاقت علی خان کی گاڑی میں ڈال کر انہیں عباسی شہید ہسپتال پہنچایا گیا جہاں فیضان اللہ نے میڈیکولیگل رپورٹ بنوائی اور اپنے شناختی کارڈ کی کاپی بھی جمع کروائی۔ دو زخمی ہسپتال پہنچ کر جانبر نہ ہو سکے جبکہ تیسرے کی جان بچ گئی۔

متحدہ نے اپنے ایک یونٹ انچارج کو جو پارٹی چھوڑنا چاہتا تھا سزا دے کر بہت سوں کو پیغام دے دیا کہ مافیا طرز کے اس گروہ سے نکلنے کا کوئی پُرامن راستہ نہیں ہے۔ اگلے روز یونین کونسل کے آفس کو آگ لگا دی گئی اور فیضان اللہ خان کے خلاف دہرے قتل کی ایف آئی آر درج کروا دی گئی۔ ایک بے گناہ منتخب عوامی نمائندہ جیل بھیج دیا گیا اور اگلے ایک سال تک اپنے حلقے کے عوام اور بیوی بچوں سے دور ایک ناکردہ گناہ کی سزا بھگتتا رہا، تا آنکہ عدالت نے بے گناہ قرار دے کر ان کی رہائی کا حکم دے دیا۔ رہائی کے بعد میں نے فیضان اللہ خان کو واٹر بورڈ کے معاملات کے لیے اپنا کوآرڈینیٹر نامزد کر دیا۔ انہوں نے بقیہ مدت یونین کونسل کی نظامت کے ساتھ ساتھ اس ذمہ داری کو بھی بحسن و خوبی نبھایا۔

کراچی انسٹی ٹیوٹ آف ہارٹ ڈیزیز
ایک خواب کی تعبیر

عباسی شہید ہسپتال سٹی گورنمنٹ کے ماتحت سب سے بڑا ہسپتال تھا۔ متحدہ نے مختلف ادوار میں یہاں اس قدر سیاسی و سفارشی بھرتیاں کر رکھی تھیں کہ ہسپتال سیاست کا گڑھ بن چکا تھا اور یہاں کی انتظامیہ سیاسی کارکنوں کے ہاتھوں بے بس نظر آتی تھی۔ ہسپتال کے حالات کی خرابی کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ آپ وہاں کے حالات بد کا اندازہ اس بات سے لگالیں کہ میرے ناظم بننے سے کئی ماہ قبل ہسپتال میں نیورو سرجری کا شعبہ بند ہو چکا تھا۔ اس شعبے کے سربراہ ڈاکٹر سید خالد حسین جو امریکہ سے قوم کی خدمت کا عزم لے کر آئے تھے، ایک سیکٹر انچارج کے ہاتھوں تشدد اور تذلیل کا نشانہ بننے کے بعد استعفیٰ دے کر واپس جا چکے تھے۔ کیا کوئی تصور کر سکتا ہے کہ شہر کے وسط میں قائم آٹھ سو بستروں کے ٹرشری کیئر ٹیچنگ ہسپتال میں نیورو سرجری کا شعبہ کئی ماہ تک بند پڑا رہے؟ جبکہ ہسپتال میں بہت بڑا ٹراما سینٹر بھی قائم ہو! دس ماہ سے ایکسرے کا شعبہ بھی بند پڑا ہوا تھا اور سی ٹی اسکین کی مشین بھی کام نہیں کر رہی تھی۔ ہسپتال کے ڈاکٹروں کا ایک دیرینہ مسئلہ تھا فور ٹیئر فارمولے کے تحت ترقی۔ یہ معاملہ 1997ء سے حل طلب تھا۔ ڈاکٹر اظفر معید ہسپتال کے ایم ایس تھے۔ انتہائی دیانت دار اور مخلص آدمی تھے۔ میں نے ڈاکٹر ہمایوں فرخ کو ڈی ایم ایس لگا دیا جو طویل عرصے سے ہسپتال میں خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ اگلے کچھ عرصے میں ڈاکٹر اظفر معید، ڈاکٹر ہمایوں فرخ، ڈاکٹر سلیم اللہ، ڈاکٹر محمد خالد، ڈاکٹر ظفر

اقبال، ڈاکٹر عبداللہ متقی، ڈاکٹر سلطان مصطفیٰ، ڈاکٹر فیض فاروق، ڈاکٹر اورنگزیب، ڈاکٹر محمد شکیل اور ڈاکٹر فیاض عالم نے اس ہسپتال کی بہتری کے لیے غیر معمولی کام کیا۔ ڈاکٹروں کی ترقی کا دیرینہ مسئلہ حل ہوا۔ پوسٹ گریجویٹ ٹرینی ڈاکٹرز کے لیے اعزازیہ کی منظوری دی گئی۔ نرسنگ کالج کی طالبات کے ماہانہ اعزازیہ میں خاطر خواہ اضافہ کیا گیا۔ ریڈیالوجی کے شعبے کے لیے ایکسرے مشین، چھ عدد الٹرا ساؤنڈ مشینیں اور کلر ڈوپلر مشین خریدی گئی۔ لیبارٹری، میڈیسن، سرجری اور امراض چشم کے شعبوں کے لیے کئی کروڑ روپے کی مشینیں خریدی گئیں۔ ہسپتال میں ڈائی لیسس کی سہولت بالکل مفت کردی گئی اور نئی مشینوں کا اضافہ بھی کیا گیا۔ 22 اپریل 2002ء کو نیوروسرجری کے شعبے کو ازسرنو کھول دیا گیا۔ معروف نیوروسرجن پروفیسر مسعود جاوید صاحب نے ہماری درخواست پر اس شعبے کی سربراہی ایک بار پھر سنبھال لی۔ وہ اس سے قبل ٹراما سینٹر کے انچارج کے طور پر خدمات سرانجام دے چکے تھے۔

ہسپتال میں میڈیکل آئی سی یو موجود نہیں تھا۔ تیسری منزل پر نہ صرف اس کے لیے جگہ مختص کی گئی بلکہ کئی کروڑ روپے سے مانیٹرز اور وینٹی لیٹرز بھی خرید لیے گئے۔ مصطفیٰ کمال نے بعدازاں اس آئی سی یو کا افتتاح کیا۔ ہسپتال کے سیوریج کے دیرینہ مسئلے کو بھی حل کیا گیا اور نرسنگ ہاسٹل میں پانی و سیوریج کی لائنیں تبدیل کروا کر عمارت کی تزئین و آرائش بھی کروائی گئی۔ ہمارے چار سالہ دور میں مریضوں کو 90 فیصد ادویہ ہسپتال سے بالکل مفت ملا کرتی تھیں، جبکہ بیشتر ٹیسٹ ہسپتال کی اپنی لیبارٹری میں ہی ہو جایا کرتے تھے۔ اگر وزیراعلیٰ سندھ مجھے تقرریوں کا اختیار دے دیتے تو ہم ہسپتال میں میرٹ پر طبی و نیم طبی عملے کا تقرر کرتے، جس کے نتیجے میں ہسپتال کی کارکردگی میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ افسوس کہ ڈاکٹر ارباب غلام رحیم کراچی کے معاملے میں متحدہ کے سامنے مکمل طور پر بے اختیار نظر آئے۔

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ سٹی ناظم کی حیثیت سے آپ نے شہر کراچی کو کیا دیا؟ تو میرے ذہن میں فوری طور پر دو منصوبے آتے ہیں۔ فیڈرل بی ایریا میں بنایا جانے والا امراض قلب کا ہسپتال کراچی انسٹی ٹیوٹ آف ہارٹ ڈیزیز ز۔ اور شہر کو 100 ملین گیلن پانی روزانہ فراہم کرنے کا منصوبہ کے تھری۔ یقینی طور پر ان دونوں منصوبوں کی اہمیت وافادیت غیر معمولی ہے۔

شہر میں امراض قلب کے ایک نئے ہسپتال کے قیام کی تجویز ڈاکٹر فیاض عالم نے دی تھی۔ عباسی شہید ہسپتال کے ڈپٹی میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر محمد خالد اور ماہر امراض قلب ڈاکٹر زاہد رشید نے اس منصوبے کی فزی بلٹی تیار کی۔

22 ستمبر 2002ء کو سوک سینٹر کے کمیٹی روم میں ایک میٹنگ منعقد کی گئی جس میں پروفیسر ڈاکٹر عبدالصمد نے شہر میں امراض قلب کے مریضوں اور علاج معالجے کی صورت حال پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ میں پروفیسر عبدالصمد صاحب سے واقف نہیں تھا حالانکہ بلڈ پریشر کا پرانا مریض تھا لیکن میرے ذاتی معالج پروفیسر اظہر فاروقی تھے۔ عبدالصمد صاحب شیروانی زیب تن کیے ہوئے تھے اور سر پر قراقلی ٹوپی تھی۔ حلیے سے کوئی عالم دین معلوم ہوتے تھے۔ آبائی تعلق صوبہ سرحد (خیبر پختون خوا) سے تھا لیکن طویل عرصے سے کراچی میں مقیم تھے۔ وہ بے حد محبت اور انکسار سے ملے۔

میٹنگ کے دیگر شرکاء میں ڈی سی او شفیق الرحمن پراچہ، ای ڈی او فنانس شعیب صدیقی، ای ڈی او ورکس، ای ڈی او ہیلتھ ڈاکٹر علی نواز شیخ، ڈاکٹر ہمایوں فرخ، ڈاکٹر عبدالصمد، ڈاکٹر زاہد رشید، ڈاکٹر محمد خالد، ڈاکٹر فیاض عالم، ڈاکٹر ظفر اقبال، ڈاکٹر سلطان مصطفیٰ، ڈاکٹر عبداللہ متقی اور عابد الیاس شامل تھے۔

ڈاکٹر زاہد رشید نے مجوزہ ہسپتال کے منصوبے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بتایا کہ ہسپتال کو دو مراحل میں مکمل کیا جائے گا اور مکمل ہونے کے بعد 400 بستروں کا ٹرشری کیئر

ٹیچنگ ہسپتال ہوگا۔ اس کے ساتھ شہر کے 10 ٹاؤنز میں چیسٹ پین سینٹر بھی بنائے جائیں گے جہاں دل کے دورے کے مریضوں کو فوری طبی امداد ماہر ڈاکٹروں اور عملے کی نگرانی میں دی جاسکے گی، اور انجیوگرافی و انجیو پلاسٹی یا بائی پاس سرجری کے لیے مرکزی انسٹی ٹیوٹ منتقل کیا جائے گا۔

بریفنگ کے بعد تمام شرکائے میٹنگ اس منصوبے پر یکسو ہوگئے اور طے پایا کہ ہسپتال فیڈرل بی ایریا بلاک 16 میں واقع کراچی میڈیکل اینڈ ڈینٹل کالج کی پرانی عمارت اور اس سے ملحقہ پلاٹ پر تعمیر کیا جائے گا۔ نیز یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ پروفیسر ڈاکٹر عبدالصمد اس ادارے کے پراجیکٹ ڈائریکٹر، جبکہ ڈاکٹر محمد خالد اور ڈاکٹر زاہد رشید ڈپٹی ڈائریکٹر ہوں گے۔

الحمدللہ سٹی کونسل کے اراکین نے اس منصوبے کا کھلے دل سے خیر مقدم کیا اور 2 جنوری 2003ء کو قرارداد نمبر 211 کے ذریعے اس کی منظوری دے دی۔ اس کے بعد سٹی گورنمنٹ کے متعلقہ افسران نے اس منصوبے کو آگے بڑھانے کے لیے انتظامی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ ڈاکٹر محمد خالد نے اس منصوبے کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا اور رات گئے تک اس میں مصروف رہنے لگے۔ 9 جنوری 2004ء کو ہسپتال کے پہلے فیز کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ تعمیراتی کام مکمل ہونے کے نزدیک پہنچا تو مشینوں اور طبی آلات کی خریداری کا مرحلہ درپیش تھا۔ 15 مارچ 2005ء کو مسلم پرویز اور سعید غنی کی مشترکہ قرارداد نمبر 617 کو سٹی کونسل نے منظور کیا اور ہسپتال کے لیے 7 کروڑ 10 لاکھ 26 ہزار کی خطیر رقم سے طبی آلات کی درآمد اور خریداری کی اجازت دے دی۔ قیمتی مشینیں ہم نے براہ راست ایل سی کھول کر درآمد کیں جس کے نتیجے میں سٹی گورنمنٹ کو چالیس فیصد تک بچت ہوئی۔ حبیب آئل ملز کی محترمہ تابندہ ولاری نے اپنے ادارے کی جانب سے 2 ایمبولینسوں کا عطیہ دلوایا۔ عملے کی تقرری کے لیے صوبائی حکومت کی منظوری درکار تھی۔ طریقہ کار کے مطابق طبی و نیم

طبی عملے کی تقرری کے حوالے سے درخواست وزیراعلیٰ سندھ ڈاکٹر ارباب غلام رحیم کو بھیجی گئی، ساتھ ہی یہ بھی لکھا گیا کہ ملازمین کو تنخواہیں شہری حکومت اپنے بجٹ سے دے گی، لیکن وزیراعلیٰ سندھ اتحادی جماعت متحدہ قومی موومنٹ کے دباؤ میں آکر درخواست کی منظوری دینے سے گریز کرتے رہے۔ اس موقع پر شہر کے معروف ماہرین امراض قلب ڈاکٹر عبدالحق، پروفیسر ڈاکٹر شریف چودھری، پروفیسر ڈاکٹر حامد شفقت، پروفیسر صمد شیرا، ڈاکٹر اعظم شفقت، ڈاکٹر مقبول جعفری، ڈاکٹر اعجاز وہرہ، ڈاکٹر محمد اسحٰق، ڈاکٹر حسنات شریف، ڈاکٹر خاور کاظمی، پروفیسر ڈاکٹر سلطان احمد شاہ، ڈاکٹر حسینہ چھاگانی، اور ڈاکٹر اجمل صدیقی نے اعزازی طور پر اپنی خدمات پیش کردیں۔ ڈاکٹر زاہد رشید نے ایکوکارڈیوگرافی، جبکہ ڈاکٹر عبدالحق اور پروفیسر عبدالصمد نے انجیوگرافی و انجیو پلاسٹی کے شعبے کو سنبھال لیا۔ اس طرح دستیاب وسائل کے ساتھ ہسپتال میں او پی ڈی، ایکوکارڈیوگرافی، ای ٹی ٹی، انجیو گرافی و انجیو پلاسٹی کی سہولیات کا آغاز کردیا گیا۔ انجیوگرافی کے چارجز صرف 3 ہزار روپے، جبکہ انجیو پلاسٹی کے چارجز 35 ہزار روپے رکھے گئے۔ 3 جون 2005ء کو کراچی انسٹی ٹیوٹ آف ہارٹ ڈیزیز کے پہلے مرحلے کے باقاعدہ افتتاح کی سعادت اللہ نے مجھے بخشی۔

کیونکہ کراچی انسٹی ٹیوٹ آف ہارٹ ڈیزیز کے منصوبے میں 10 ٹاؤنز میں ایک چیسٹ پین سینٹر کا قیام بھی شامل تھا، اس لیے ہماری ٹیم ان سینٹرز کے قیام کے لیے بھی کوششیں کررہی تھی۔ 20 اور 21 جون 2005ء کو ملیر اور کورنگی کے دو مقامات پر چیسٹ پین سینٹرز کے سنگ بنیاد رکھے گئے۔ ان تقاریب میں ٹاؤن اور یونین کونسلوں کے ناظمین اور کونسلرز کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے بھی شرکت کی۔ کورنگی والے چیسٹ پین سینٹر کے منصوبے کے لیے جماعت اسلامی حلقہ خواتین کی رہنما محترمہ عائشہ منور صاحبہ نے بطور رکن قومی اسمبلی ملنے والے فنڈز میں سے ایک خطیر رقم دی تھی۔

2004ء میں کراچی میں اچانک ایک نئے مرض کی آمد ہوگئی۔ کم از کم میں نے اس مرض کا نام زندگی میں پہلی بار سنا تھا۔ ابتدائی دنوں تک تو نام بھی درست معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ اخبارات کبھی ڈینگو لکھتے اور کبھی ڈینگی۔ کئی لوگوں کے مرنے کی اطلاعات موصول ہوئی تھیں اور ای ڈی او ہیلتھ نے بریفنگ دیتے ہوئے بتایا تھا کہ اس کا وائرس ایک مخصوص مادہ مچھر کے کاٹنے سے انسانی جسم میں منتقل ہوتا ہے اور انسانی جسم میں خون کے بعض اجزاء کی شدید کمی ہو جاتی ہے۔

اس مرحلے پر پیما کے رکن اور خون کے امراض کے ماہر ڈاکٹر طاہر شمسی نے بہت تعاون کیا اور کئی تربیتی پروگرامات کا انعقاد کیا۔ انہوں نے ڈاکٹروں کو سمجھایا کہ ڈینگی کے مریض کو اینٹی بایوٹک ادویہ نہیں دی جائیں گی اور پلیٹ لیٹس کی کمی کو کیسے دور کیا جائے گا۔

یونین کونسل انچولی کے ناظم سجاد دارا زرعی کیڑے مار ادویہ کے ایک ادارے سے کئی سال تک وابستہ رہے تھے۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ شہر میں مچھر مار اسپرے کروایا جائے جس کے لیے معیاری ادویہ کا بندوبست کیا جائے۔ سٹی گورنمنٹ کا ویکٹر کنٹرول کا شعبہ ای ڈی او ہیلتھ کے ماتحت تھا لیکن کچھ خاص فعال نہ تھا۔ سجاد دارا کی تجویز پر فوگر مشینیں خریدی گئیں اور شہر کے ہر ٹاؤن میں ہنگامی بنیادوں پر اسپرے کروایا گیا۔ یہ مہم کئی ہفتوں تک جاری رہی اور اس میں سجاد دارا کے ساتھ ڈاکٹر آصف خان اور التمش خان نے بھی پورے جوش وجذبے کے ساتھ کام کیا۔ اس محکمے کے ایک نوجوان افسر بھی بہت متحرک تھے اور مستعدی سے کام کرتے نظر آئے۔ بعد میں کسی نے بتایا کہ ان کا نام حماد صدیقی تھا اور وہ متحدہ کے مرکز 90 کے اہم لوگوں میں شامل تھے۔ گفتگو اور مجموعی رویے سے کسی اچھے خاندان کے فرد لگتے تھے۔ سچ یہ ہے کہ جب ان کا پورا تعارف سامنے آیا تو دکھ ہوا کہ الطاف حسین نے اپنی خودغرضی، تشدد اور نفرت کی سیاست میں کراچی کے نوجوانوں کو کیا سے کیا بنا دیا۔ کاش وہ نسلوں کی تباہی کی اس سیاست سے باز رہتے!

جماعت اسلامی کراچی کے قیم شاہد ہاشمی نے کئی مواقع پر اس خواہش کا اظہار کیا کہ سٹی گورنمنٹ کے تحت شہر میں کوئی بہت معیاری ڈائیگنوسٹک سینٹر بنایا جائے جس میں ایک ہی چھت کے نیچے لیبارٹری بھی ہو اور سی ٹی اسکین اور ایم آر آئی جیسی سہولتیں بھی ہوں۔ ڈاکٹر محمد واسع اور ڈاکٹر عظیم الدین نے اس تجویز کو عملی شکل دینے کے لیے مفید مشورے دیے۔ صحت کے محکمے نے ان ماہرین کی مشاورت سے پی سی ون تیار کیا۔ لیاقت نیشنل ہسپتال کے برابر میں سٹی گورنمنٹ کا ایک کشادہ بنگلہ تھا۔ ابتدائی مہینوں میں کچھ لوگوں نے یہ مشورہ دیا تھا کہ میں بحیثیت ناظم اس میں رہائش اختیار کرلوں۔ میں نے یہ تجویز مسترد کردی تھی اور مشورہ دینے والوں سے کہا تھا کہ افغانی صاحب آٹھ سال شہر کے میئر رہے، وہ سرکاری بنگلے کے بجائے لیاری کے 80 مربع گز کے فلیٹ میں رہتے رہے، مجھے تو اللہ نے بہت کشادہ مکان دیا ہوا ہے۔

بہرحال ماہر ڈاکٹروں کی ٹیم نے اس بنگلے کو سٹی ڈائیگنوسٹک سینٹر کے لیے موزوں قرار دے دیا۔ چند ہفتوں کے بعد اس بنگلے میں سول ورک اور سینٹر کے لیے مشینوں کی خریداری کے ٹینڈر بھی جاری کر دیے گئے۔ 5 جون 2005ء کو باقاعدہ سنگ بنیاد بھی رکھ دیا گیا۔ میرے بعد آنے والے سٹی ناظم نے نہ صرف یہ کہ اس اہم منصوبے کو ختم کر دیا بلکہ بعض اطلاعات کے مطابق اس بنگلے میں رہائش اختیار کرلی یا اسے کیمپ آفس بنالیا۔

دیگر شعبوں کی طرح صحت کے محکمے میں بھی کرپشن کچھ کم نہیں تھی، سرکاری ہسپتالوں میں مشینوں کی خریداری، دواؤں کی خریداری و سپلائی میں گھپلوں سمیت دیگر معاملات کی روک تھام کے لیے ویجیلنس کمیٹیاں تشکیل دیں۔ میڈیکل و پیرا میڈیکل اسٹاف کی حاضری، ہسپتالوں میں صفائی ستھرائی کے نظام کی بہتری، سہولتوں میں اضافے کے لیے تجاویز دینا اور بدعنوانیوں کو ختم کرنا ان کمیٹیوں کے ذمے تھا۔ بہت سارے واقعات میں سے صرف ایک واقعہ بیان کر رہا ہوں تاکہ لوگ جان سکیں کہ سرکاری محکموں میں کس انداز

سے کرپشن کی جاتی ہے۔ مارتھ کراچی میں واقع چلڈرن ہسپتال کا منصوبہ تکمیل کے آخری مراحل میں تھا۔ ای ڈی او ہیلتھ کے ماتحت کروڑوں روپے کی مشینوں اور طبی آلات کی خریداری کی جانی تھی۔ لیبارٹری کے لیے کچھ مشینوں کی خریداری کے معاملات فائنل کر کے فائل حتمی منظوری کے لیے میرے پاس بھیجی گئی۔ میرے معاونین میں سے ایک ڈاکٹر نے کہا کہ قیمتیں غیر معمولی طور پر زیادہ ہیں۔ تحقیق سے پتا چلا کہ چند بہت چھوٹے اخبارات میں ٹینڈر چھپوا کر خانہ پری کی گئی تھی اور من پسند سپلائرز کو نوازنے کا منصوبہ تھا۔ بڑے اخبارات میں ٹینڈر جاری کروائے اور خریداری کے لیے بنائی گئی کمیٹی میں شہر کے معروف پیتھالوجسٹس کو شامل کیا گیا۔ مشینوں کی قیمت پچیس سے تیس فیصد کم ہوگئی جبکہ گارنٹی بھی ایک سال کے بجائے دو سال کی مل گئی۔ ہسپتالوں کے لیے ادویہ اور مشینوں کی خریداری کے عمل کو شفاف بنانے کے لیے سینٹرل پرچیز کمیٹی تشکیل دی گئی۔

سوبھراج میٹرنٹی ہسپتال میں نومولود بچوں کے علاج کے لیے انتہائی نگہداشت کا یونٹ بنایا گیا۔ ہسپتال کی میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر شبین ناز متحرک خاتون تھیں اور ڈسٹرکٹ آفیسر ڈاکٹر ہمایوں فرخ اور ڈاکٹر عبداللہ متقی کے ساتھ مل کر ہسپتال کی بہتری کے لیے مسلسل کوششیں کرتی رہتی تھیں۔ اسپنسر آئی ہسپتال کی انتظامیہ نے بھی اس دوران جدید سہولتوں کے حصول کے لیے اچھا ہوم ورک کیا اور مختلف دوروں کے دوران مجھے، ڈی سی او اور ای ڈی او ہیلتھ کو اپنی ضروریات اور مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں بتایا۔ ہم نے ان کی تجاویز کو خصوصی اہمیت دی اور مشینوں و آلات کی خریداری کے لیے کئی کروڑ روپے فراہم کیے گئے۔ سٹی گورنمنٹ کے پہلے ہی بجٹ میں مارتھ ناظم آباد میں واقع کراچی میڈیکل اینڈ ڈینٹل کالج کے دوسرے مرحلے کی تعمیر کے لیے 16 کروڑ روپے مختص کر دیے گئے تھے۔ 16 اگست 2002ء کو گورنر سندھ محمد میاں سومرو نے ایک پُروقار تقریب میں تعمیراتی کاموں کے آغاز کا رسمی افتتاح کیا۔ اس موقع پر نائب ناظم طارق حسن، ڈی سی او شفیق

الرحمٰن پراچہ، کالج کی پرنسپل ڈاکٹر سعدیہ عزیز کریم، ٹاؤن ناظم فصیح الدین صدیقی اور دیگر لوگ موجود تھے۔ سلیم اظہر اور عابد الیاس نے اس منصوبے کی تکمیل میں بھرپور دلچسپی لی۔ 6 جون 2005ء کو مجھے اس عمارت کے افتتاح کا موقع ملا۔ سرکاری شعبے میں ایسے منصوبے سال ہا سال تک زیر تکمیل رہتے ہیں اور انتظامیہ میں موجود کچھ کالی بھیڑیں اور ٹھیکیدار مل کر ایسے منصوبوں کے ریٹس میں اضافہ کرواتے رہتے ہیں، اور منصوبہ کچھ لوگوں کی کرپشن کی وجہ سے غیر معمولی تاخیر کا شکار ہوجاتا ہے۔ الحمدللہ، کالج کی عمارت تین سال سے بھی کم عرصے میں مکمل ہوگئی۔ اس دوران کالج میں اساتذہ کی تقرریاں کی گئیں۔ ماضی میں اس ادارے میں سیاسی اور سفارشی بنیادوں پر تقرریاں ہوتی رہی تھیں۔ میں نے انتظامیہ کو ہدایت کی کہ تمام تقرریاں سندھ پبلک سروس کمیشن کے ذریعے صرف اور صرف میرٹ پر کی جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ تقرر نامے ملنے کے بعد کئی لوگوں نے مجھ سے کہا کہ اگر جماعت اسلامی کے بجائے کسی اور پارٹی کا سٹی ناظم ہوتا تو ہماری تقرری ممکن ہی نہیں تھی۔ مصطفیٰ کمال ناظم بنے تو انہوں نے کالج اور دیگر اداروں میں براہ راست تقرریاں کیں۔ ایک بار کالج انتظامیہ نے تجویز بھیجی کہ کالج میں سیلف فنانس کی نشستیں متعارف کروائی جائیں۔ میں نے اپنی ٹیم سے مشورہ کیا اور اس تجویز کو مسترد کردیا۔ یہ جماعت اسلامی کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ چار سالہ دورِ نظامت میں نہ کسی کو خلاف ضابطہ ترقی دی اور نہ ہی میرٹ سے ہٹ کر کسی کی تقرری کی۔

۱۹ اگست 2002 - گورنر سندھ محمد میاں سومرو نے
کراچی میڈیکل اینڈ ڈینٹل کالج کی تعمیر کا سنگ بنیاد رکھا

[illegible]

گورنر سندھ محمد میاں سومرو
کراچی میڈیکل اینڈ ڈینٹل کالج کی تقریب سے خطاب کر رہے ہیں

23 اپریل 2002 - عباسی شہید ہسپتال میں شعبہ سرجری کی تعمیر کا افتتاح

[illegible]

عباسی شہید ہسپتال میں مختلف شعبوں کے افتتاح کے موقع پر یوم تاسیس منایا گیا

سلیم اظہر اور عابدہ الیاس نے کراچی میڈیکل اینڈ ڈینٹل کالج اور KIHD کے تعمیراتی منصوبوں کی بروقت تکمیل کو یقینی بنایا

2 جون 2008ء- کراچی انسٹی ٹیوٹ آف ہارٹ ڈیزیز کی پہلی منزل کا افتتاح نائب ناظم طارق حسن نے کیا اور ادارے کے سربراہ ڈاکٹر عبدالصمد بھی ساتھ تھے

نائب ناظم طارق حسن نے KIHD کا دورہ کیا۔ اس موقع پر یونین ناظم سیف الدین، ڈاکٹر عبدالحق، یونین ناظم ڈاکٹر جلال الدین سیفی، ڈاکٹر عبدالصمد، پروفیسر شریف چوہدری اور ڈاکٹر محمد خالد کی ایک یادگار تصویر

فیڈرل بی ایریا کے بلاک 20 میں واقع بلدیہ کراچی کے میٹرنٹی ہوم کی تصویر
اسی پلاٹ پر KIHD قائم کیا گیا

KIHD کی پہلی عمارت

KIHD ایک سیمینار کے موقع پر: ڈاکٹر محمد خالد، ڈاکٹر عبدالصمد، ڈاکٹر ہمایوں فرخ اور ڈاکٹر حامد شفقت

ڈاکٹر عبدالحق نے KIHD میں پہلے مریض کی انجیو گرافی کی

KIHD کی تقریب افتتاح میں مسلم پرویز ادارے کے محرک ڈاکٹر فیاض عالم کو نشان سپاس دے رہے ہیں

کراچی انسٹی ٹیوٹ آف ہارٹ ڈیزیز کی گورننگ باڈی کے اراکین: ڈاکٹر جلال الدین سیفی، ڈاکٹر عبدالحق، پروفیسر شریف چوہدری، جسٹس ناصر اسلم زاہد، نعمت اللہ خان، طارق حسن، ڈاکٹر عبدالصمد اور میاں تنویر احمد مگوں

ملیر ندی کا پُل اور جمال طاہر و اسلم مجاہد کی شہادت

ہماری شہری حکومت کی کارکردگی کو بڑھانے میں الخدمت کے ٹاؤن ناظمین کا بہت اہم کردار رہا۔ ویسے تو میری دانست کے مطابق ان میں سے ہر ایک کی کارکردگی دوسرے سے بڑھ کر رہی تھی، اور ہر شخص نے وژن اور محنت کے ساتھ اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے خدمت کو عبادت سمجھ کر انجام دیتا رہا، لیکن یہاں لانڈھی ٹاؤن کے ناظم محمد شاہد اور کورنگی ٹاؤن کے ناظم عبدالجمیل خان کا ذکر خاص طور پر کرنا چاہوں گا کہ یہ دونوں حضرات اُن لوگوں میں شامل تھے کہ جن کے پیش کردہ منصوبوں میں میری خاص دلچسپی ہوتی تھی۔ کیونکہ لانڈھی اور کورنگی ایک طرح سے کراچی کی معیشت کا حب تھے جن کی حالتِ زار دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا تھا۔ یہاں کے رہنے والے بہت بری صورت حال سے دوچار رہے تھے۔ پہلے ایم کیو ایم نے اپنے آغاز سے ہی اس علاقے کو تباہ کیا، نوجوان نسل کو اسلحہ پکڑایا، تعلیم کا برا حال کیا، پھر متحدہ اور اس سے نکلے ہوئے دھڑے ایم کیو ایم حقیقی کے روزانہ کی بنیاد پر خونریز جھگڑوں کی وجہ سے بری ابتری ہوئی۔ طویل عرصے سے ان علاقوں میں ترقیاتی کام بھی نہیں ہوئے تھے۔ زندگی کی بنیادی سہولتیں پانی، بجلی، گیس اور صفائی ستھرائی کا کوئی مربوط نظام کئی علاقوں میں موجود نہیں تھا، جگہ جگہ ابلتے گٹروں اور گندے بدبودار پانی نے ان علاقوں سے گزرنا ناممکن بنایا ہوا تھا، سڑکیں زبوں حالی کا شکار تھیں، لوگوں میں شدید مایوسی تھی۔ لیکن عزم اور ہمت رکھنے والے دونوں ٹاؤن ناظمین اور یونین کونسل ناظمین نے اپنے اپنے علاقوں میں عوام کو سہولتوں کی فراہمی کے لیے شب و روز

فہرست پر جائیے

محنت کی اور بتدریج صورت حال تبدیل ہوگئی۔ سڑکیں بن گئیں۔ پرانے پارک بحال کیے گئے، نئے پارکوں کا اضافہ ہوا، دینی مدارس اور مساجد پر خصوصی توجہ دی گئی۔ اس ضمن میں ایک اور شخصیت کا ذکر ضروری ہے، کیونکہ ان سب کی رہنمائی کے لیے وہ موجود تھے، اور وہ سابق رکن صوبائی اسمبلی اسلم مجاہد تھے، جو علاقے کے ہر دلعزیز عوامی رہنما تھے اور لوگوں کے دلوں میں رہتے تھے۔ حق گورنمنٹ کے انتخابات میں محمد شاہد اور عبدالجمیل خان کی کامیابی کے پیچھے بھی اسلم مجاہد کا متحرک کردار، اور ان علاقوں کے لیے ان کی خدمات کا بڑا دخل تھا۔ ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ کورنگی کے علاقے میں امراضِ قلب کے علاج کے لیے چیسٹ پین سینٹر کے منصوبے میں انہوں نے بہت دلچسپی لی تھی۔ اسی طرح ان کی دلچسپی سے ہی نہ صرف ملیر ندی پشتے کی تعمیر اور شہید ملت ایکسٹینشن کا کام ہوا، بلکہ اس کے علاوہ اسکولوں، کالجوں کو بھی بہتر بنایا اور ان میں اضافہ کروایا گیا۔ پانی اور سیوریج سسٹم کی بہتری کے لیے بڑی بڑی لائنیں ڈلوائی گئیں۔ غرض وہ وہاں کے لوگوں کے چھوٹے بڑے ہر قسم کے مسائل پر بھرپور توجہ دیتے تھے۔ افغانی صاحب کے دور میں بھی اسلم مجاہد نے بطور کونسلر اپنے علاقے کے لیے بہت کام کیے تھے۔ خواتین کے لیے پردہ پارک، بارہ دری، اسپورٹس کمپلیکس، کورنگی نمبر ڈھائی پر میٹرنٹی ہوم، کھیل کے کئی میدان ان کی دلچسپی اور لگن سے ہی بنے تھے۔ کورنگی لانڈھی کے صنعتی علاقوں کی تعمیر و ترقی، کورنگی کاز وے کی تعمیر، اور پھر جام صادق علی پل کی ازسر نو تعمیر میں ان کا اہم کردار رہا۔ آٹھ ہزار اور بارہ ہزار روڈ کی تعمیر کے لیے بھی وہ متحرک رہے۔ اسلم مجاہد اپنی تقاریر میں متحدہ کی منفی طرز سیاست پر بہت سخت الفاظ میں گرفت کرنے لگے تھے اور ہزاروں کے مجمع کے سامنے بھی الطاف حسین کا نام لے کر تنقید کیا کرتے تھے۔

اسلم مجاہد اور لانڈھی، کورنگی کے یوسی و ٹاؤن ناظمین کے دیرینہ مطالبے پر سٹی گورنمنٹ نے شاہ فیصل کالونی کو کورنگی سے ملانے کے لیے ملیر ندی پر ایک بڑے پل کی

تعمیر کا منصوبہ بنایا جسے ملیر ریور برج کا نام دیا گیا۔ 1057.95 ملین روپے کے اس میگا پراجیکٹ کے تعارف کے لیے اتوار 29 مئی 2005ء کو کورنگی میں ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا، جس میں عوام کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ اس پروگرام میں میرے علاوہ نائب ناظم طارق حسن، اسلم مجاہد، کمال فاروقی، مسلم پرویز، ای ڈی ورکس سرفراز علی شاہ، محمد شاہد اور عبدالجمیل خان بھی شریک ہوئے۔ پروگرام میں شریک لوگوں کو یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ اس پل کی تعمیر کے بعد شاہ فیصل کالونی سے کورنگی تک کا فاصلہ چند منٹ میں طے ہوجائے گا۔ پروگرام کے اختتام پر جماعت اسلامی لانڈھی کے جواں سال رہنما جمال طاہر موٹر سائیکل پر اپنے گھر جانے کے لیے نکلے۔ گھر کے قریب پہلے سے گھات لگائے متحدہ کے ٹارگٹ کلرز نے ان پر گولیاں برسا دیں اور وہ شدید زخمی ہو گئے۔ کارکنان انہیں جناح ہسپتال لے کر جا رہے تھے مگر وہ زخموں کی تاب نہ لا سکے اور جان، جان آفریں کے سپرد کردی۔ جمال طاہر حزب المجاہدین میں بھی سرگرم رہے تھے اور عزیزی طفیل و عظیم بلوچ کے ساتھ میرے پاس آتے رہے تھے۔ اگلے روز ظہر کے بعد ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی جس میں پورے شہر سے جماعت اسلامی کے کارکنان شریک ہوئے۔ اسلم مجاہد بھی جمال طاہر کی نماز جنازہ میں شریک تھے۔ اسلم مجاہد جنازے کے بعد جب اپنی کار میں واپس جانے لگے تو متحدہ کے کچھ دہشت گردوں نے ان کا راستہ روک لیا اور اسلحے کے زور پر انہیں اغوا کرلیا۔ ان پر بے پناہ تشدد کیا گیا اور ران کے سینے اور سر میں گولیاں مار کر انہیں بھی شہید کردیا گیا۔ ان کی نعش لانڈھی نمبر 6 ڈگری کالج کے قریب سے ملی۔ جماعت کے ساتھیوں نے ہمیں بتایا کہ اسلم مجاہد جب نماز جنازہ سے لوٹ رہے تھے تو لانڈھی ساڑھے 3 الرازی چورنگی کے قریب متحدہ کے بیس پچیس دہشت گردوں نے ان کی گاڑی کو روک لیا تھا۔ حملہ آوروں کا سرغنہ متحدہ کا سیکٹر انچارج فاروق بیگ تھا، جبکہ اسلم مجاہد پر گولیاں چلانے والوں میں مبینہ طور پر علاقے کا بدنام زمانہ پولیس افسر انوار جعفری بھی شامل تھا۔ وہ بہت درد،

تکلیف اور صبر کا وقت تھا، دو دنوں کے اندر جماعت اسلامی کے دو رہنماؤں کی شہادت ہم سب کے لیے بڑا سانحہ تھا۔ کارکن سے لے کر قیادت تک سب غم میں ڈوبے ہوئے اور مشتعل تھے، لیکن ہمارے پاس سوائے صبر کے کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ ریاست متحدہ کے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ متحدہ کی قیادت شہر کو ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر اپنے حواس گم کر بیٹھی ہے اور شہر پر ایک بار پھر خوف اور تشدد کی لعنت کو مسلط کرنا چاہتی ہے۔ اسلم مجاہد جیسے شریف النفس سیاسی کارکن اور سماجی رہنما کا دن دہاڑے قتل اس بات کا کھلا ثبوت تھا کہ الطاف حسین اور متحدہ کی اُس وقت کی ٹیم جو آج بھی کسی نہ کسی نام سے موجود ہے، دہشت اور نفرت کی سیاست کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ شہادت کے اگلے روز اسلم مجاہد کی نمازِ جنازہ امیر جماعت اسلامی قاضی حسین احمد نے پڑھائی۔ کراچی جماعت اسلامی کے ذمہ داران، اراکین قومی و صوبائی اسمبلی، خیبر پختون خوا کے سینئر صوبائی وزیر سراج الحق، زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے نمایاں افراد اور عوام کی بڑی تعداد نے نمازِ جنازہ میں شرکت کی۔

ہر آنکھ اشکبار تھی۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ لانڈھی کورنگی کے ایک ایسے سیاسی و سماجی رہنما کو وحشیانہ تشدد کر کے قتل کر دیا گیا ہے جو اپنی شہادت سے ایک روز قبل بھی علاقے کے عوام کو سہولت پہنچانے والے ترقیاتی منصوبے ''ملیر ریور برج'' کی تعمیر کا خواب دیکھ رہا تھا۔ جو اپنے علاقے کی تعمیر و ترقی کے لیے ہر دم بے چین اور سرگرم رہا کرتا تھا۔ جمال طاہر اور اسلم مجاہد نے شہادت کی منزل پائی اور اپنے رب سے کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا۔

''کہو، میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔'' (سورۃ الانعام ۶:۱۶۲)

جماعت اسلامی کراچی کے رہنما اسلم مجاہد کی گورنر سندھ محمد میاں سومرو سے ملاقات۔ ممتاز صنعتکار میاں زاہد حسین اور ایس ایم منیر بھی تصویر میں نمایاں ہیں

جماعت اسلامی کے رکن جمال طاہر
متحدہ کے دہشت گردوں نے
ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بنا کر شہید کردیا۔

جماعت اسلامی ضلع بن قاسم کے امیر لقمان بیگ
جنہیں دہشت گردوں نے 19 جولائی 1999 کو شہید کردیا تھا

الخدمت ہسپتال کورنگی میں ڈینٹل کلینک کے آغاز کے موقع پر پاکستان بزنس فورم کے رہنما میاں تنویر مگوں، عبدالجمیل خان، محمد شاہد اسلم مجاہد اور کمال فاروقی کی ایک یادگار تصویر

پارک بنائے۔ پارکوں پر قبضہ نہیں کیا

شہر کو سرسبز و شاداب دیکھنے کی خواہش مجھے نوجوانی کے دور سے تھی۔ سچ یہ ہے کہ 1970 کی دہائی تک شہر کنکریٹ کا جنگل بنا بھی نہیں تھا اور مختلف شاہراہوں اور بڑے پارکوں میں برگد، پیپل اور نیم کے گھنے سایہ دار درخت موجود تھے۔ میں نے نارتھ ناظم آباد میں پلاٹ خریدا تو اس کا بڑا حصہ پودوں اور درختوں کے لیے خالی رہنے دیا تھا۔ سٹی ناظم بننے کے کچھ ہی عرصے کے بعد کراچی کے سارے یوسی اور ٹاؤن ناظمین جان چکے تھے کہ انفرااسٹرکچر کی بحالی کے ساتھ ساتھ شہر کے ماحول کی بہتری بھی میری ترجیح ہے۔ چنانچہ ان سب نے بھی پارکوں کی دیکھ بھال، نئے پارکوں کے قیام اور سڑکوں و میدانوں میں شجرکاری پر بھرپور توجہ دینی شروع کردی۔ ہم نے انہیں اجازت دی کہ خوشحال پاکستان پروگرام کے فنڈز سے بھی پارک بنائے جاسکتے ہیں۔ فیصلہ کیا گیا کہ سٹی گورنمنٹ کے بجٹ سے ہر ٹاؤن میں ایک ماڈل پارک بنایا جائے گا۔ محکمہ باغات نے ٹاؤن ناظمین کی مشاورت سے ہر ٹاؤن میں قطعات اراضی کا تعین کیا اور بہت تیز رفتاری سے بیک وقت کئی ٹاؤنز میں ماڈل پارکوں پر کام شروع ہوگیا۔ الحمدللہ چند ماہ کے اندر ہی سے زیادہ ماڈل پارک بن کر تیار ہوگئے۔ ان پارکوں کے افتتاح کے مواقع پر تقاریب منعقد کی جاتی تھیں جن میں ہزاروں مرد و خواتین اور بچے شرکت کرتے۔ خوشی سے ان کے چہرے دمک رہے ہوتے تھے اور وہ ہمارے حق میں بڑی دعائیں کرتے تھے۔

سٹی گورنمنٹ کے معرض وجود میں آنے سے کچھ عرصہ قبل سبزی منڈی سپر ہائی وے پر

منتقل کی جا چکی تھی۔ 38 ایکڑ سے زیادہ کے اس انتہائی بیش قیمت رقبے پر لینڈ مافیا سمیت مختلف بااثر لوگوں کی نظریں تھیں۔ اس وقت ہمارے پاس اتنے بڑے پارک کو بنانے کے لیے وسائل نہیں تھے۔ میں نے کور کمانڈر جنرل طارق وسیم غازی سے بات کی اور اس پلاٹ کے دورے کی دعوت دی۔ جب وہ دورے کے لیے آئے تو انہیں بتایا کہ ہم اس پلاٹ کو قبضے سے بچا کر عوام کو ایک معیاری پارک کا تحفہ دینا چاہتے ہیں۔ خواہش ہے کہ کور فائیو مزار قائد پارک کی طرح اس پارک کو بھی اپنے وسائل سے بنائے۔ انہوں نے اس تجویز کا مثبت جواب دیا اور کچھ عرصے کے بعد شہر میں عسکری پارک کی شکل میں ایک بڑے پارک کا اضافہ ہوگیا۔ اس پارک کے بنانے پر سٹی گورنمنٹ کا ایک روپیہ بھی خرچ نہیں ہوا، اور زمین بھی فلیٹوں کے جنگل میں تبدیل ہونے سے بچ گئی۔ اس دوران محکمہ باغات کے افسران کی مشاورت سے کراچی کے دو سو مقامات پر خرما پورے کھجور کے درخت منگوا کر لگوائے گئے۔ یہ درخت 15 سے 20 فٹ بلند تھے۔

فٹ بال لیاری کے نوجوانوں کا پسندیدہ کھیل ہے۔ ماضی میں اس علاقے نے ملک کو فٹ بال کے کئی مایہ ناز کھلاڑی دیے ہیں، جبکہ کئی اچھے باکسر بھی لیاری میں پیدا ہوئے اور مختلف مقابلے جیت کر نام کمایا۔ میری خواہش تھی کہ لیاری میں بین الاقوامی معیار کا ایک فٹ بال اسٹیڈیم بنوایا جائے۔ بتایا گیا کہ محترمہ بے نظیر صاحبہ کے دور حکومت میں ایک اسٹیڈیم بنایا گیا تھا جو مکمل نہیں ہو سکا تھا، بعد میں آنے والی حکومتوں نے اس منصوبے میں دلچسپی نہیں لی۔ ہم نے اس اسٹیڈیم کی تکمیل اور تزئین و آرائش پر کئی کروڑ روپے خرچ کیے اور لیاری کے نوجوانوں کو فٹ بال اسٹیڈیم کا تحفہ دیا۔ کشمیر روڈ پر اسپورٹس کمپلیکس میں انڈور جمنازیم کی تعمیر و مرمت کا کام مکمل کروایا گیا۔ یہ کام برسوں سے رکا ہوا تھا۔

شہر کے وسط یعنی گلستان جوہر میں 407 ایکڑ پر پھیلا ہوا سفاری پارک طویل عرصے سے عدم توجہی کا شکار تھا۔ کراچی کے گوناگوں مسائل کی وجہ سے 2004 تک اس منصوبے

پر ہماری ٹیم بھی توجہ نہیں دے سکی تھی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ سفاری پارک کو نجی شعبے کے حوالے کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں اخبارات میں اشتہارات بھی شائع کروا دیے گئے۔ اپریل 2004ء میں ڈاکٹر فیاض عالم نے سفاری پارک میں دلچسپی لینا شروع کی اور یہ تجویز پیش کی کہ پارک میں موجود جنگلی جانوروں کے ایریا کو عوام کے لیے کھول دیا جائے۔ انہوں نے بتایا کہ اس ایریا میں پچیس سے زیادہ نسلوں کے سات سو جانور موجود ہیں۔ ان کی اس بات پر مجھ سمیت سب ہی کو بہت حیرانی ہوئی۔ شعیب صدیقی کی سربراہی میں ایک کمیٹی بنادی گئی جس کے اراکین میں منصور قاضی، ڈاکٹر فرید قادری، عابد الیاس اور تجویز کنندہ ڈاکٹر فیاض عالم شامل تھے۔ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ پارک میں روشنی کا انتظام بہتر کیا جائے اور سفاری ایریا میں لوگوں کے جانے کے لیے بسیں چلائی جائیں۔ 15 جون 2004ء کو ایک سادہ سی تقریب منعقد کی گئی جس میں میڈیا کے نمائندے بھی شامل تھے۔ سفاری ایریا میں جانے کے لیے کوچز چلائی گئیں اور برسوں سے بند سفاری ایریا کو عوام کے لیے کھول دیا گیا۔

اگلے روز جب اخبارات اور ٹی وی چینلز پر نمایاں خبریں اور رپورٹس نشر ہوئیں تو لوگوں کی بہت بڑی تعداد نے بیوی بچوں سمیت سفاری پارک کا رخ کر لیا۔ اگلے چند مہینوں میں سفاری پارک کے لیے بہت سارے جانور خریدے گئے اور وہیلز رین سمیت کئی دیگر سہولتوں کا اضافہ بھی کیا گیا۔ گلشن اقبال کے ٹاؤن ناظم عبدالوہاب نے پارک کو 6 جوڑے شتر مرغ کا تحفہ دیا۔ 20 تا 26 مارچ 2005ء سفاری پارک میں چھ روزہ برڈ شو کا اہتمام کیا گیا۔ برڈ شو کا افتتاح سابق گورنر سندھ معین الدین حیدر نے کیا۔ ہمارے ایک دوست ممتاز شمیم جو کہ صنعت کار ہیں اور قیمتی پرندے پالنے کے شوقین ہیں، انہوں نے اس برڈ شو کے انعقاد میں بے حد تعاون کیا۔ کروڑوں روپے کے رنگ برنگے طوطے برڈ شو میں لا کر رکھے اور خود بھی اپنے بچوں کے ساتھ اپنے اسٹال پر موجود رہے۔ اس ایونٹ کو لاکھوں لوگوں نے دیکھا۔

اس کے بعد لاہور کے چڑیا گھر کی طرز پر شیروں کا 4 ایکڑ رقبے پر انکلوژر بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ 10 ملین روپے کی لاگت سے تیار ہونے والے اس منصوبے میں شیروں کو قدرتی ماحول فراہم کرنے کے لیے دو غاروں کا انتظام بھی شامل تھا۔ اس کا ٹینڈر ہوگیا تھا اور میری مدت نظامت ختم ہونے سے قبل کام کا آغاز بھی ہوگیا تھا۔ ای ڈی او انویسٹمنٹ پروموشن رئیس پراچہ کے ریفرنس سے میجر ریٹائرڈ خالد نے رابطہ کیا۔ وہ ایوبیہ مری میں نصب لفٹ چیئر کی کمپنی کے مالک تھے۔ کوہنڈی جنجیل پر ان کی ایک چیئر لفٹ نصب تھی جسے نکال کر وہ کسی دوسرے تفریحی مقام پر لگانا چاہ رہے تھے۔ ڈاکٹر فیاض عالم، ڈاکٹر آصف خان اور منصور قاضی نے اُن سے قانونی معاملات طے کیے اور لیگل ڈپارٹمنٹ کی منظوری کے بعد سفاری پارک میں چیئر لفٹ کی تنصیب کا معاہدہ طے پا گیا۔ 21 جون 2005ء کو میرے دفتر میں ملک خالد اور راقم نے اس معاہدے پر دستخط کردیے۔ ڈی سی او فضل الرحمن اور رئیس پراچہ بھی اس موقع پر موجود تھے۔ معاہدے کے تحت اس کمپنی کو دس سال کا ٹھیکہ دیا گیا تھا جس کے عوض کمپنی سٹی گورنمنٹ کو پچاس لاکھ روپے سالانہ دینے کی پابند تھی۔ بعدازاں چیئر لفٹ نصب کردی گئی اور شہریوں نے اسے ایک اچھی تفریحی سہولت قرار دیا، لیکن ایک آدھ سال بعد ہی کمپنی نے یہ چیئر لفٹ سفاری پارک سے کسی اور مقام پر منتقل کردی اور سندھ میں نصب کی جانے والی پہلی چیئر لفٹ کا منصوبہ نامعلوم وجوہات کے سبب شروع ہونے کے کچھ عرصے بعد ختم ہوگیا۔

کراچی کے شہریوں خاص طور پر بچوں کی مثبت تفریح کے لیے 42 ایکڑ رقبے پر بنے ہوئے چڑیا گھر (گاندھی گارڈن) کا حال سفاری پارک جیسا تو نہیں تھا لیکن اس میں بہتری کی بہت گنجائش موجود تھی۔ جانوروں کی اقسام اور تعداد میں کمی کی وجہ سے یہاں آنے والوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی۔ میں نے چڑیا گھر کی انتظامیہ سے کہا کہ نئے جانور اور پرندے خریدے جائیں۔ حکومت سندھ کے محکمہ وائلڈ لائف کے سیکریٹری سے بات کرکے

فہرست پر جائیے

سندھ آئی بیکس اور اڑیال بطور تحفہ حاصل کیے گئے۔ اس دوران لاہور زو اور کراچی زو کے درمیان اضافی جانوروں کا تبادلہ عمل میں آیا۔ ڈاکٹر فیاض، منصور قاضی اور ڈاکٹر کاظم کراچی سے جانور لے کر بذریعہ ٹرین لاہور گئے اور وہاں سے جانور لے کر آئے۔ لاہور سے آنے والے جانوروں میں شیر اور بنگال ٹائیگر بھی شامل تھے۔ کراچی اور لاہور زو کے درمیان جنگلی جانوروں کا تبادلہ پہلی بار ہوا تھا۔ اس دوران زو میں میوزیم، مچھلی گھر اور سانپ گھر کی تزئین و آرائش بھی کروائی گئی اور ایک بین الاقوامی سیمینار بھی منعقد کیا گیا۔

کراچی میں شہریوں کی سیر و تفریح کے لیے اسلام آباد کی طرز کا عظیم الشان منصوبہ ''دامن کوہ'' متحدہ کی منفی طرزِ سیاست کی نذر ہو گیا۔ نارتھ ناظم آباد ٹاؤن کے بلاک S اور T کے درمیان میں پانی ذخیرہ کرنے کے لیے ایک بہت بڑا ریزروائر موجود تھا۔ پندرہ بیس برس سے یہ ریزروائر بند تھا۔ اس کے متعلق واٹر بورڈ کے افسران کی رپورٹس موجود تھیں کہ یہ اب قابلِ استعمال نہیں ہے۔ ڈی جی پارکس لیاقت قائم خانی نے اس مقام پر ایک بڑے پارک کا منصوبہ پیش کیا۔ پہاڑی کے دامن میں واقع ہونے کی وجہ سے اس کا نام دامن کوہ تجویز کیا گیا۔ 9 مئی 2005 کو ایک بڑی تقریب میں اس منصوبے کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ لیاقت قائم خانی نے دامن کوہ پارک منصوبے کی تفصیلی بریفنگ دی جس سے حاضرین بہت متاثر ہوئے۔ کام شروع ہوئے ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ وزیر اعلیٰ سندھ کے مشیر اور متحدہ قومی موومنٹ کے رہنما وسیم اختر کچھ اراکین اسمبلی و کارکنان کے ہمراہ وہاں پہنچے اور کام بند کروا دیا۔ محکمۂ باغات کے عملے کو تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا۔ جواز یہ پیش کیا کہ ہم اس ریزروائر کو دوبارہ قابلِ استعمال بنائیں گے۔ شہر میں پانی کی فراہمی زیادہ اہم مسئلہ ہے نا کہ تفریحی مراکز۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نہ تو دامن کوہ بن سکا اور نہ ہی ریزروائر بحال ہو سکا۔ مجھے اس منصوبے کے اس طرح ختم ہونے سے بہت دکھ ہوا کیونکہ کئی عشروں سے نارتھ ناظم آباد کا رہائشی ہونے کی وجہ سے یہ منصوبہ میرے دل کے بہت قریب تھا اور مجھے لگتا تھا کہ شہر کے

لاکھوں لوگ اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ دامن کوہ پارک آ کر سکون کے کچھ لمحات گزار سکیں گے۔

ہماری اکثر میٹنگز میں اس مسئلے پر ضرور بات ہوتی کہ آبادی میں اضافے کے ساتھ کراچی میں یومیہ پیدا ہونے والے کچرے کی مقدار میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کچرے کو ٹھکانے لگانے کے لیے مناسب طریقہ کار نہ ہونے کی وجہ سے شہر کے بہت سارے مقامات خاص طور پر کچی آبادیوں میں غیر قانونی طور پر کچرا جلانے سے ماحولیاتی آلودگی خطرناک صورتِ حال اختیار کر گئی ہے۔ کچھ لوگوں کو شکایت ہوا کرتی تھی کہ ان کے علاقوں میں کچرا ٹھیک طرح نہیں اٹھایا جاتا۔ یہ شکایت اُن علاقوں میں زیادہ تھی جہاں یونین کونسل اور ٹاؤن کے ناظمین کا تعلق جماعت اسلامی سے نہیں تھا۔ کروڑہا روپے سالانہ خرچ کرنے کے بعد بھی صورتِ حال اطمینان بخش نہیں تھی گو کہ ماضی کے مقابلے میں بہت بہتری آ گئی تھی۔ کچھ لوگوں کی تجویز تھی کہ "سالڈ ویسٹ مینجمنٹ" کے شعبے کی نج کاری کر دی جائے۔ اس حوالے سے بعض کمپنیوں نے اپنی دلچسپی بھی ظاہر کی۔ انجینئر اظہار الحق نے اس پیچیدہ مسئلے کے حل کے لیے ایک جامع پلان ترتیب دیا۔ وہ ماحولیات سے متعلق ایک مشاورتی فرم میں اہم عہدے پر فائز تھے۔ مجوزہ منصوبے کے مطابق پہلے مرحلے میں پہلے سے مختص شدہ دو لینڈ فل سائٹس، یعنی جام چاکرو، سرجانی ٹاؤن اور دیہہ گوندل پاس نزد ناردرن بائی پاس کو جدید سہولتوں سے آراستہ کرنا، اور دوسرے مرحلے میں لینڈ فل سائٹ تک کچرا پہنچانے کے لیے ہر ٹاؤن میں "گاربیج ٹرانسفر اسٹیشن" قائم کرنا شامل تھے۔ اس کے لیے 5 ٹاؤنز میں زمین تلاش کر لی گئی اور ٹینڈر بھی جاری کر دیے گئے۔ باقی کے لیے کوششیں جاری تھیں۔ منصوبے کے مطابق دو منزلہ گاربیج ٹرانسفر اسٹیشن کے گراؤنڈ فلور پر بڑی گاڑیاں اور ٹرالر کچرا اتاریں گے، جبکہ چھوٹی گاڑیاں پہلی منزل پر کچرا ڈالیں گی۔ ہر ٹرانسفر اسٹیشن کے لیے 16 گاڑیاں مختص کی جائیں گی اور ہر گاڑی کچرا اٹھانے کے لیے 10 گھنٹوں میں 4 پھیرے لگائے گی۔ سٹی گورنمنٹ نے اس سارے عمل میں ترغیب کا

عنصر شامل کرتے ہوئے ٹاؤنز کو کچرا اٹھانے کی مد میں دی جانے والی رقم کو لینڈ فل سائٹ پر پہنچائے جانے والے کچرے کے وزن سے منسلک کر دیا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ کچرے کا وزن کرنے کا مناسب انتظام ہو۔ لینڈ فل سائٹ پر وزن کرنے والا کانٹا تو نصب تھا لیکن عرصہ دراز سے خراب تھا، کسی کو اس جانب توجہ دینے کی توفیق بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ یہ طے پایا کہ ہر لینڈ فل سائٹ پر کمپیوٹرائزڈ کانٹا نصب کیا جائے گا۔ اس طرح توقع پیدا ہو گئی تھی کہ ٹاؤنز سے کچرا لانے والی گاڑیاں پیسے ملنے کی وجہ سے دوسرے ٹاؤنز سے بھی کچرا اٹھائیں گی۔ اور تیسرے مرحلے میں گھروں سے کچرا اکٹھا کرنے کے لیے سائیکل، موٹر سائیکل ٹرالی استعمال کرنے کا پروگرام ہمارے منصوبے میں شامل تھا۔ یہ چیزیں اتنی عمدگی سے باہم مربوط تھیں کہ ڈی سی او سمیت تمام افسران نے اسے بے حد مفید اور قابلِ عمل قرار دیا۔ بدقسمتی سے میری نظامت ختم ہونے کے بعد اس منصوبے میں زیادہ دلچسپی نہ لی گئی اور آنے والے سالوں میں یہ مسئلہ بد سے بدتر ہوتا چلا گیا۔

مختلف سروے رپورٹس اور مشاہدے کے نتیجے میں یہ بات بالکل واضح تھی کہ ''سمندری آلودگی'' تشویش ناک صورت اختیار کر گئی ہے۔ کراچی میں گھریلو اور صنعتی استعمال شدہ بیشتر گندہ پانی واٹر بورڈ کے ٹریٹمنٹ پلانٹس کے ناکارہ ہونے کی وجہ سے بغیر صاف ہوئے سمندر میں جا رہا تھا۔ اس کے لیے بھی اظہار الحق نے Waste Water Recycling Project تیار کیا۔ اس کے لیے پہلے مرحلے میں سائٹ میں واقع ٹریٹمنٹ پلانٹ ون کے ساتھ ایک اور جدید پلانٹ نصب کیا جانا تھا جس میں سے گندہ پانی گزر کر صنعتی اداروں کے لیے دوبارہ قابلِ استعمال بن سکتا تھا۔ اس منصوبے پر کام کرنے کے لیے ایک آسٹرین کمپنی سے معاہدہ کیا گیا۔ مفاہمتی یادداشتوں پر دستخط ہوئے اور ٹینڈر جاری کرنے کی تیاری شروع کر دی گئی۔ لیکن مہلت ختم ہو گئی اور اس اہم منصوبے کو اس وقت عملی شکل نہ دی جا سکی۔ یہی معاملہ شہر میں بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے پانی کی قلت کو

دور کرنے کے منصوبے کا تھا۔ روزِ اوّل سے فراہمی آب کے مختلف پراجیکٹس کے حوالے سے غور کیے جانے کے دوران سمندری پانی کو "ڈی سیلی نیشن" کے ذریعے پینے کے قابل بنانے کے لیے منصوبہ تیار کیا گیا۔ 25 ملین ڈالر کی لاگت اور BOT کی بنیاد پر تیار ہونے والے اس منصوبے کو تین سال کی مدت میں مکمل ہونا تھا۔ ایک امریکن کمپنی نے اس منصوبے میں دلچسپی ظاہر کی۔ سٹی گورنمنٹ نے اس کمپنی سے ایم او یو (مفاہمتی یادداشت) سائن کیا۔

نظامت کے دوران جہاں بہت سارے کاموں کے لیے بہت سوچ بچار اور تفصیلی جائزہ لیا جاتا تھا، وہیں بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ اچانک پیش آنے والا کوئی واقعہ کسی اہم منصوبے کا سبب بن گیا۔ "ایگرو سٹی" کا منصوبہ بھی ان میں سے ایک تھا۔ ہوا کچھ یوں کہ گوشت فروشوں نے قیمتوں میں اضافے کے لیے مطالبات کیے اور چند دن بعد ہڑتال کردی۔ جواز یہ پیش کیا کہ ہمیں جانور مہنگے داموں خریدنا پڑ رہے ہیں، اس لیے کم ریٹ پر گوشت فروخت کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ ان کی نمائندہ انجمن سے مذاکرات کر کے قائل کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ اپنی بات پر اڑے رہے۔ خدا خدا کر کے رکاوٹیں دور ہوئیں تو دوسری طرف دودھ فروشوں نے ہڑتال کردی کہ چارے کی قیمتیں بڑھ رہی ہیں اس لیے دودھ کے ریٹ میں اضافہ کرنا ہماری مجبوری ہے۔ بیک وقت دو محاذوں پر مقابلہ کرنے کے دوران اور باہمی مشاورت سے یہ حقیقت سمجھ میں آگئی کہ جب تک ہم بنیادی ضروریات کے معاملے میں خودکفیل نہیں ہوں گے اس وقت تک مسئلے حل نہیں ہوں گے۔ اب کیا، کیا جائے؟ بہت سوچ بچار کے بعد ایک تجویز سامنے آئی کہ کوئی ایسی جگہ تلاش کی جائے جہاں دودھ والے جانوروں کے لیے چارہ اگایا جاسکے۔ احباب نے بڑی تگ و دو کے بعد ہمیری کے مقام پر سٹی گورنمنٹ کی زمین ڈھونڈ نکالی جس کا رقبہ 3 ہزار ایکڑ کے لگ بھگ تھا۔ کسی زمانے میں "کچرا ٹرین" شہر سے کچرا لاکر یہاں ڈمپ کرتی تھی۔ نامعلوم کس

وجہ سے وہ سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ بہر حال جگہ موجود تھی۔ جگہ دیکھنے کے بعد اظہار الحق اور دیگر احباب نے مشورہ دیا کہ جب جگہ وافر میسر ہے تو صرف چارہ ہی کیوں اگایا جائے؟ یہاں تو کیٹل فارمنگ، فش فارمنگ، پولٹری فارمنگ کے علاوہ سبزیاں بھی اگائی جا سکتی ہیں۔ یہ بھی سوچا گیا کہ پراجیکٹ کو صرف مویشی پالنے تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ ذبح کر کے گوشت شہر میں فراہم کرنے کے لیے مذبح خانہ ہو، اور یہاں سے نکلنے والی باقیات سے بجلی پیدا کرنے کی کوشش بھی کی جائے۔ اس منصوبے کو "ایگروسٹی" کا نام دیا گیا۔ شہری حکومت کی مخلصانہ کاوش اور مفادِ عامہ کو مدِنظر رکھتے ہوئے ایک مشاورتی فرم "حسنین کوٹیکس" نے بلا معاوضہ ایک فزیبلٹی تیار کر کے دی۔ یہ کمپنی اس سے قبل لاہور میں بھی چند بڑے منصوبوں پر کام کر چکی تھی۔ "ایگروسٹی" منصوبے میں کئی بڑی کمپنیوں نے دلچسپی لی اور ہم نے کچھ کمپنیوں کے ساتھ مفاہمتی یادداشتوں پر دستخط بھی کیے، لیکن کچھ ہی عرصے میں میری نظامت کا دورانیہ مکمل ہو گیا۔ اگر بعد میں نظامت کی ذمہ داری سنبھالنے والے مصطفیٰ کمال اس منصوبے میں دلچسپی لیتے اور اسے مکمل کرواتے تو طویل عرصے تک شہر دودھ، گوشت، سبزیوں کے بحران سے محفوظ ہو جاتا۔ بقول غالب

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

کتاب کے آخر میں کچھ ایسے خاص افراد کا ذکر ضروری ہے جن سے عام طور پر حکومتی ذمہ داران کے تعلقات اچھے نہیں رہ پاتے، خاص طور پر ہماری طرح کے لوگوں سے، جو چائے بسکٹ سے زیادہ کسی کی تواضع بھی نہیں کر پاتے اور نہ ہی اشتہارات کو ہتھیار کی طرح استعمال کر سکتے ہیں۔ میری مراد اہلِ صحافت سے ہے۔ حیران کن طور پر میرا واسطہ جن صحافیوں سے پڑا وہ سب کے سب مثبت سوچ اور طرزِ عمل کے حامل نکلے۔ تنقید بھی تعمیری انداز میں کرتے اور اچھے کاموں کی پذیرائی بھی کرتے تھے۔ بہت جلد محبت، عزت اور احترام کا رشتہ قائم ہو گیا اور مجھے رپورٹر حضرات اپنی ٹیم کا حصہ لگنے لگے۔ شاہد مصطفیٰ اور اسلم

شاہ کبھی کبھی شرارتیں کرتے تھے، لیکن مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ دل کے صاف لوگ ہیں اور شہر کے مسائل کے حوالے سے مخلص بھی ہیں۔ ایڈیٹرز اور مالکان کی سطح پر بھی بہت محبت اور سرپرستی ملی، خاص طور پر میر شکیل الرحمٰن، حمید ہارون، محمود شام، مدثر مرزا، نذیر لغاری، ادریس بختیار، اطہر ہاشمی، سجاد میر، نصیر ہاشمی، احمد حسن، ابرار بختیار، رفیق افغان وغیرہ نے بہت تعاون کیا۔ جبکہ رپورٹرز میں سے جنگ کے طاہر عزیز، ڈان کے عزیز اللہ شریف، پی ٹی وی کے شبیر ابن عادل، جیو کے عامر احمد خان اور فیصل عزیز، ایکسپریس کے فیصل حسین، نوائے وقت کے شہزاد چغتائی، دی نیوز کے موسیٰ کلیم، آن لائن کے عامر لطیف، اسٹار کے اشرف، جرأت کے اسلم شاد، کائنات کے شاہد مصطفیٰ، خبریں کے عامر نثار، امت کے شمیل احمد، نعمان لاری اور شبیر سومرو، جسارت کے راجا کامران اور اشتیاق لودھی، اور قومی اخبار کے صابر قریشی نے چار سال تک مثبت رپورٹنگ اور متوازن تنقید سے مسلسل ہماری حوصلہ افزائی کی۔

ذرائع ابلاغ کی انتظامی کی ٹیم کے افسران نجم الدین سکندر، بشیر سدوزئی، ظفر احسان، عبدالقدیر، ستار جاوید اور علی حسن ساجد نے بھی اپنی ذمہ داریوں کو بے حد خوش اسلوبی کے ساتھ نبھایا اور فرائض کی ادائیگی کے دوران کبھی اوقات کار کا شکوہ نہیں کیا، کیونکہ اکثر اوقات رات گئے تک مصروفیات جاری رہتی تھیں اور تہواروں کے دنوں میں بھی میڈیا کا دفتر کم ہی بند ہوا کرتا تھا۔ جماعت نے میڈیا کے حوالے سے جن لوگوں کی ذمہ داری لگائی تھی، انہوں نے بھی صحافیوں سے بہت اچھا تعلق قائم کرلیا تھا، جس کی وجہ سے ہمیں اس شعبے میں کبھی کسی وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ میڈیا کی ٹیم میں ڈاکٹر فیاض، حنیف اکبر، قاضی سراج، نوفل شاہ رخ اور انصار رضی شامل رہے، جبکہ کونسل کے اراکین میں سے مسلم پرویز، قاضی صدرالدین اور عابد الیاس نے بہت اہم کردار ادا کیا۔

کراچی کے عوام کی خدمت کا حق ادا کرنے کے لیے نہ ایک عمر کافی ہے، نہ ہی محدود

اختیارات اور مالی وسائل کے ساتھ چار سال کی نظامت! اس شہر کے مسائل گمبھیر ہیں اور سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ صوبائی اور مرکزی حکومتیں اس کے مسائل کے حل میں پوری دلچسپی نہیں لیتیں۔ یہ شہر ملک اور صوبے کو سب سے زیادہ ٹیکس دیتا ہے لیکن بدلے میں اسے بہت کم مالی وسائل فراہم کیے جاتے ہیں۔ سرکاری اداروں میں سیاسی اور سفارشی بھرتیوں کے کلچر نے ان اداروں کو بھی عام آدمی کے لیے بے فیض بنا کر رکھ دیا ہے۔

سٹی گورنمنٹ کی مدت کے خاتمے کا نوٹیفکیشن موصول ہوا، افسران اور آفس کے عملے سے الوداعی ملاقات کی، سرکاری گاڑی کی چابیاں متعلقہ افسر کے حوالے کیں اور الحمدللہ ضمیر پر بغیر کسی بوجھ کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اسلام کی بنیادی تعلیمات میں یہ بات شامل ہے کہ ہر قسم کا عوامی یا سرکاری عہدہ ایک امانت ہوتا ہے اور آخرت میں اس کے بارے میں سخت حساب لیا جائے گا۔ جماعت اسلامی سے طویل وابستگی کے دوران بھی کبھی یہ بات میرے دل و دماغ سے نہیں نکلی، اور سٹی ناظم بننے کے بعد تو اور زیادہ احتیاط برتنے لگا کہ خدانخواستہ کوئی ایسا کام سرزد نہ ہو جائے جس کی یوم آخرت جواب دہی کرنی پڑ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ چار سالہ دور نظامت میں پوری کوشش کی کہ میرے بیٹوں یا قریبی عزیزوں میں سے کوئی انتہائی ضروری کام کے بغیر سٹی گورنمنٹ کے دفتر نہ آئے، اور نہ ہی کسی افسر کو میری قرابت داری کا حوالہ دے کر کوئی کام کہے۔ الحمدللہ میرے بیٹوں اور عزیزوں نے اس بات پر پوری طرح عمل کیا اور افسران اور عملے کی ٹیم چار سال بعد بھی میرے تمام بیٹوں کے نام تک سے ناواقف تھی۔

بحیثیت سٹی ناظم جو تنخواہ ملتی رہی تھی، وہ سب کی سب بینک میں جمع تھی۔ 8 اکتوبر 2005ء کو ملک کے شمالی علاقوں اور آزاد کشمیر میں زلزلہ آیا تو پوری تنخواہ کا چیک الخدمت کے زلزلہ فنڈ میں جمع کروا دیا۔

تمت بالخیر

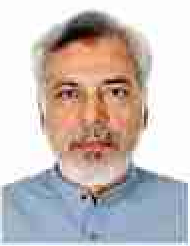

وسیم اقبال

ندیم اقبال

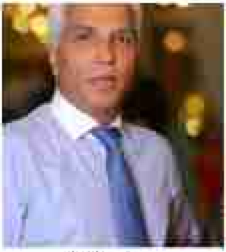

فہیم اقبال

کلیم اقبال

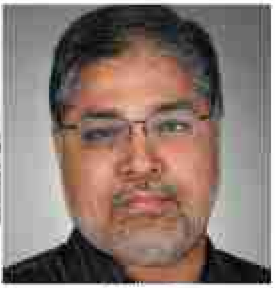

نعیم اقبال

ناظم اقبال

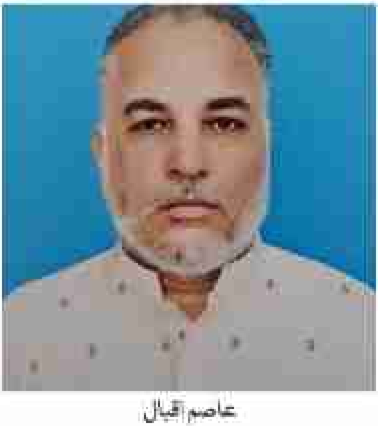

عاصم اقبال

سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ کراچی
اگست 2001ء تا جون 2005ء
منتخب قومی اخبارات کے آئینے میں

☆ الخدمت گروپ کے نعمت اللہ خان ایڈووکیٹ بھاری اکثریت سے ناظم اعلیٰ منتخب ہوگئے۔ نعمت اللہ خان نے 2061 ووٹ جبکہ جمہوری گروپ کے تاج حیدر نے 1506 ووٹ حاصل کیے۔ (جنگ 9 اگست 2001ء)

The Al-Khaidmat pannel won the run off election for City Nazim and Naib Nazim on Wednesday with a lead of 549 votes over its rival democratic pannel. (Dawn, August 9th, 2001)

☆ ناظم اعلیٰ نے سرکاری سہولیات لینے سے انکار کردیا۔ (جسارت 11 اگست 2001ء)

☆ کراچی پر مزید نئے ٹیکسوں کا بوجھ نہیں ڈالا جائے گا۔ نعمت اللہ خان (جنگ 24 اگست 2001ء)

☆ ناظم کراچی کی ہدایت پر سیلف فنانس اسکیم ختم۔ (جسارت 31 اگست 2001ء)

The Nazim Karachi Naimatullah Khan has canceled the recently announced policy under which a certain percentage of admissions in the intermediat colleges of the city were to be given under the self financing scheme. (Dawn August 31st, 2001)

☆ سٹی ناظم نعمت اللہ خان نے گورنر سندھ محمد میاں سومرو کے ہمراہ کراچی کو یومیہ 10 ملین گیلن اضافی پانی کی فراہمی کے منصوبے کا افتتاح کیا، منصوبے سے بلدیہ، اورنگی، سائٹ اور لیاقت آباد کی آبادیوں کو فائدہ پہنچے گا۔ (جسارت یکم ستمبر 2001ء)

☆ 19 سال پرانا منصوبہ "المرکز اسلامی" مکمل کرنے کا فیصلہ۔ (جنگ یکم اکتوبر 2001ء)

☆ سٹی گورنمنٹ کے "فہم القرآن" پروگرام میں شہریوں کی غیر معمولی شرکت، شرکاء کی تعداد میں روزانہ اضافہ، خواتین کی بڑی تعداد میں شرکت، سرکاری سرپرستی میں اپنی نوعیت کا پہلا پروگرام ہے۔ (جسارت 3 اگست 2002ء)

☆ سٹی حکومت کے تحت قرآن وسنت اکیڈمی قائم کردی، نعمت اللہ خان۔

(جنگ 7 اگست 2002ء)

☆ ناگن چورنگی کی تزئین وآرائش اور سگنل کی تنصیب کا افتتاح۔

(جسارت 8 اگست 2002ء)

☆ گرین کراچی، کلین کراچی، لاکھوں ٹن کچرا اور ملبہ اٹھایا گیا۔ (جسارت 24 اگست 002ء)

☆ نمائش، گرومندر اور بنارس پر سگنلز کا منصوبہ، کام شروع کردیا گیا، 13 کروڑ 33 لاکھ کی لاگت آئے گی۔ (جنگ 2 ستمبر 2002ء)

City Goverment to build pedestrian bridges. The transport and communication department of the city govermmnet has invited private parties to establish pedestrian bridges on bot basis at varions embarked sites. (Dawn, Sept. 7th, 2002)

☆ ترقیاتی کاموں پر کام تیز کرنے کے لیے رات میں بھی کام کرنے کا فیصلہ۔

(جنگ 9 ستمبر 2002ء)

☆ ابراہیم حیدری، ساحلی پٹی پر دو سڑکوں کا افتتاح، کورنگی ہاربر فعال بنانے کی ہدایت۔

(جنگ 16 ستمبر 2002ء)

☆ وفاقی سطح پر کراچی کی حیثیت کا تعین کرنا ہوگا۔ اس کی حیثیت ملک کے دیگر شہروں سے مختلف ہے۔ گزشتہ سال یہ شہر ہمیں کھنڈر کی صورت میں ملا۔ سٹی ناظم

(جنگ 18 ستمبر 2002ء)

The Status of this megalopolis will have to be determind at the federal level, Naimatullah Khan. (Dawn, Sep, 18th, 2002)

☆ سٹی گورنمنٹ کے تحت چار سو بستروں پر مشتمل امراضِ قلب کا ہسپتال قائم کیا جائے گا۔ (جنگ 20 ستمبر 2002ء)

City Government is spending Rs 22.7 million on severage plans. (Dawn, Sept. 23rd, 2002)

☆ اہم شاہراہوں پر سٹی گورنمنٹ کے تحت 2065 پودے لگائے گئے۔

(جسارت 20 ستمبر 2002ء)

☆ ساڑھے تین ارب روپے کی لاگت سے نیو ملیر ہاؤسنگ پروجیکٹ پر ترقیاتی کاموں کا آغاز، 27 کروڑ روپے کی منظوری دے دی گئی۔ (جنگ 27 ستمبر 2002ء)

☆ خوشحال پاکستان پروگرام کے تحت شہری حکومت کی جانب سے کراچی کے مضافاتی علاقوں اورنگی اور بلدیہ میں آٹھ کروڑ روپے کی لاگت سے زیر تعمیر سڑکوں کے تین منصوبے اگلے تین ماہ میں مکمل ہوجائیں گے۔ (جنگ 30 ستمبر 2002ء)

☆ نعمت اللہ خان نے عباسی ہسپتال میں 4 نئے شعبوں کا افتتاح کیا۔

(جسارت 5 اکتوبر 2002ء)

☆ سٹی گورنمنٹ: 28 مقامات پر پیڈسٹرین برج نصب کرے گی، 5 کمپنیوں نے دلچسپی ظاہر کردی۔ (جنگ 7 اکتوبر 2002ء)

The governer expressed satisfaction over the launch of

Shahrae Quaideen flyover, which is the third fly over to be initiated by the city government, which is being built at the cost of Rs 109 million and will be completed in 24 months. (Dawn, Oct, 8th, 2002)

☆ ناظم کراچی ٹاؤن نے 250 بستروں پر مشتمل ہسپتال کا افتتاح کیا۔

(جسارت 16 اکتوبر 2002ء)

☆ دو اہم منصوبوں کا افتتاح، شارع قائدین فلائی اوور، نیو پریڈی اسٹریٹ پر 16 کروڑ لاگت آئے گی۔ (جسارت 8 اکتوبر 2002ء)

☆ انٹرسٹی بس ٹرمینل کا منصوبہ تیار۔ (جسارت یکم نومبر 2002ء)

☆ کراچی میں نئی بسیں چلانے کے لیے 14 کمپنیوں کا انتخاب کرلیا گیا، CNG بسیں چلانے والوں کو فوقیت ملے گی۔ (جنگ 15 نومبر 2002ء)

☆ شہری حکومت کی گراں فروشی کے خلاف مہم، 208 گرفتار، 634 کے چالان، 5 لاکھ 51 ہزار 50 روپے جرمانہ کیا۔ (جسارت 19 نومبر 2002ء)

☆ ضلعی حکومتیں ناکام ہوئیں تو اس میں بڑا ہاتھ پولیس کا ہوگا، پولیس منتخب ارکان کے وجود کو تسلیم نہیں کررہی، طارق حسن۔ (جنگ 20 نومبر 2002ء)

☆ لیاری ایکسپریس وے، متاثرین میں چیکس تقسیم، اب تک 22 سو خاندانوں کو چیک دیے جاچکے ہیں، نعمت اللہ خان۔ (جسارت 24 نومبر 2002ء)

☆ نیو ملیر ہاؤسنگ پروجیکٹ۔ 1، پہلے دو ہزار پلاٹوں کی قرعہ اندازی اور الاٹمنٹ، ہاؤسنگ اسکیم میں تمام بنیادی سہولتیں فراہم کریں گے۔ نعمت اللہ خان

(جنگ 25 نومبر 2002ء)

☆ 268 بسوں کا منصوبہ، 32 بڑی بسیں 3 دسمبر کو کراچی پہنچ جائیں گی۔

(جنگ 27 نومبر 2002ء)

☆ سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ کراچی نے شہر میں پیشہ ور گداگروں کے خلاف مہم شروع کردی مختلف علاقوں سے 3ہزار گداگروں کو گرفتار کرلیا گیا۔ (جنگ 28نومبر 2002ء)

☆ خصوصی شجرکاری مہم کا آغاز، سڑکوں کے کنارے 30ہزار درخت و پودے لگائے جائیں گے، شاہین کمپلیکس تا میری ویدر ٹاور، آئی آئی چندریگر روڈ کے اطراف کھجور کے درخت لگانے کا پروگرام۔ (جنگ 13دسمبر 2002ء)

☆ جدید سہولتوں سے آراستہ 32بڑی بسیں کراچی پہنچ گئیں۔ (جنگ 14دسمبر 2002ء)

☆ کراچی کے تھانوں میں دینی کتب کی لائبریریاں قائم کرنے کا فیصلہ، ناظم آباد اسٹیشن میں لائبریری کا افتتاح آج ہوگا۔ (جنگ 18دسمبر 2002ء)

☆ کورنگی اور نئی کراچی ہسپتال میں ڈائی لیسز مشینیں نصب، 6 مشینیں سٹی ناظم کی درخواست پر نور فاؤنڈیشن یو کے کی جانب سے عطیے کی گئی ہیں۔

(جسارت 28دسمبر 2002ء)

☆ کلفٹن میں 100 ایکڑ رقبے پر جدید ڈزنی لینڈ کا منصوبہ، 9 کمپنیوں کے کاغذات جمع، BOT کی بنیاد پر تیس سالہ معاہدہ ہوگا، ایک ارب سے زائد کی سرمایہ کاری ہوگی، ذرائع سٹی گورنمنٹ۔ (جنگ 28دسمبر 2002ء)

☆ چین سے 24بسیں پہنچ گئیں، یونیورسٹی روڈ پر آزمائشی سروس شروع۔

(جنگ 4جنوری 2003ء)

☆ جامعہ اردو کے سامنے اوور ہیڈ برج کے منصوبے کا افتتاح، بدست نعمت اللہ خان۔

(جسارت 4جنوری 2003ء)

☆ کراچی میں مونو ریل چلانے کے لیے بین الاقوامی کمپنیوں کی دلچسپی، 6 سے زائد روٹس کا تعین، ناظم کراچی کی ملائشیا ٹرانسپورٹ کمپنی کے وفد سے ملاقات۔

(جنگ 9جنوری 2003ء)

☆ سعودی سرمایہ کار کراچی میں 50 بڑی بسیں چلائیں گے۔

(جنگ، جسارت 14 جنوری 2003ء)

☆ سٹی گورنمنٹ نے صرف پیٹرول کی مد میں ساڑھے آٹھ کروڑ روپے سالانہ اور ماہانہ 70 لاکھ روپے کی کرپشن ختم کردی، نعمت اللہ خان۔ (جنگ، جسارت 16 جنوری 2003ء)

☆ کراچی میں 471 بس شیلٹر تعمیر کرنے کا پروگرام، 21 کمپنیوں نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ (جنگ 21 جنوری 2003ء)

☆ سڑکوں کی تعمیر پر سٹی گورنمنٹ قابل مبارکباد ہے، ٹرانسپورٹ اتحاد۔

(جنگ یکم فروری 2003ء)

☆ سٹی گورنمنٹ کے اختیارات میں مداخلت بند کی جائے، پیپلز پارٹی۔

(جنگ یکم مارچ 2003ء)

☆ بلدیاتی نظام کے خاتمے کی کسی بھی کوشش کا مقابلہ کریں گے، ترقیاتی کاموں میں مداخلت بدستور جاری ہے، نعمت اللہ خان۔ (جنگ یکم مارچ 2003ء)

☆ پیشہ ور قاتل سن لیں ہم موت سے نہیں ڈرتے، ناظم لیاقت آباد ٹاؤن پرویز محمود پر حملہ فراموش نہیں کرسکتا۔ نعمت اللہ خان (جسارت 2 اپریل 2003ء)

☆ شہری حکومت نے 198 ترقیاتی منصوبے مکمل کر لیے، 99 سڑکوں کی تعمیر و مرمت، نکاسی آب کی 65 اسکیمیں فراہمی آب کی 24، شہری سہولتوں کی 15 اسکیمیں، 13 اسکول اور 2 دیہات میں بجلی فراہم کی گئی۔ (جسارت 5 اپریل 2003ء)

☆ ملیر اور کورنگی کے لیے کروڑوں روپے کے ترقیاتی منصوبوں کی منظوری، طویل سڑکوں کی تعمیر اور پانی کی نئی لائنوں کی تنصیب شامل ہے۔ (جنگ 6 اپریل 2003ء)

☆ UTS کے تحت آئندہ 2 ماہ میں 75 ایئر کنڈیشن بسیں آئیں گی۔

(جسارت یکم مئی 2003ء)

☆ صفائی مہم مختلف ٹاؤنز سے ہزاروں ٹن کچرا اٹھایا گیا۔ (جنگ 22 مئی 2003ء)

☆ اردو سٹی گورنمنٹ کی دفتری زبان قرار دے دی گئی، سٹی کونسل۔

(جسارت 13 مئی 2003ء)

☆ صوبائی حکومت فنڈ نہیں دے رہی، بعض وزراء مداخلت کر رہے ہیں، اختیارات نچلی سطح تک پہنچانے کا وعدہ پورا نہ ہوسکا، سٹی ناظم۔ (جنگ 15 جون 2003ء)

☆ کورنگی ٹاؤن میں ڈھائی کروڑ روپے کی لاگت سے مختلف سڑکوں کی تعمیر نو مکمل، ناظم کراچی نے 9000 روڈ، 12000 روڈ اور 8000 روڈ کا افتتاح کیا۔ سڑکیں دس برس سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھیں۔ (جسارت 6 جون 2003ء)

☆ عباسی شہید ہسپتال، فراہمی و نکاسی آب کے نظام کی از سر نو تعمیر، شہری حکومت نے 3 کروڑ روپے مختص کر دیے۔ (جسارت 14 جون 2003ء)

☆ کراچی ضلعی حکومت کا تاریخی، بجٹ کوئی نیا ٹیکس نہیں لگا، نئے مالی سال میں 58 ترقیاتی منصوبوں پر عمل درآمد ہوگا، 27 ارب 70 کروڑ روپے کا فاضل بجٹ۔

(جنگ، جسارت 26 جون 2003ء)

☆ شہری حکومت نے تعلیمی شعبے کے لیے 5 ارب 17 کروڑ روپے مختص کر دیے۔ رواں سال دس نئے کالج قائم ہوں گے۔ نویں، دسویں جماعتوں کی طالبات کو ماہانہ 200 روپے وظیفہ دیا جائے گا۔ (جنگ 26 جون 2003ء)

City Nazim Naimatullah Khan on wednesday presented Rs 27,704,16 million budget of the city government.

(Dawn, June 26th, 2003)

☆ 15 ٹاؤنز نے بجٹ پیش کر دیا، صحت اور تعلیم پر ٹیکس نہیں لگایا گیا۔

(جنگ جولائی 2003ء)

☆ پاکستان بازار اسکیم 42، بلاک 9، 10 میں 1400 خاندان آباد، سہولتیں بہم پہنچانے کے انتظامات مکمل، منصوبے پر 2 ارب 87 کروڑ سے زائد خرچ ہوں گے، سٹی ناظم نے لیاری ندی کے متاثرین کا مقدمہ لڑا۔ (جنگ جولائی 2003ء)

☆ جنوری 2005ء تک 2 فلٹر پلانٹ مکمل ہوجائیں گے، حب فلٹر میں 8 کروڑ گیلن اور پیپری پلانٹ میں 2 کروڑ گیلن پانی صاف ہوگا، ناظم کراچی کا دورہ، تفصیلات سے آگاہ کیا گیا۔ (جسارت 21 جولائی 2003ء)

☆ عشرہ صحت وصفائی، ٹاؤن ناظمین اور افسران، جنگی بنیادوں پر کام کریں، نعمت اللہ خان۔ (جنگ 2 اگست 2003ء)

City Nazim Naimatullah Khan has directed the officials of all towns to work on emergency basis by utilizing all available resources during the city government's 10 days cleaniness and health care drive. (Dawn, August 2nd, 2003)

City Nazim seeks finds to improve infrastructure.

(Dawn, August 8th 2003)

☆ درخت لگانے کا ہدف 25 ہزار کردیا، سوکھنے کا امکان نہیں، مختلف شاہراہوں پر گزشتہ 6 ماہ میں ہزاروں کی تعداد میں چھوٹے اور بڑے درخت لگائے ہیں۔

(جنگ 18 اگست 2003ء)

☆ شہری حکومت نے کراچی کو دوبارہ عروس البلاد بنا دیا۔ وزیر اعلیٰ سندھ۔

(جسارت 22 اگست 2003ء)

The city government is planning to construct a dam on Malir River and Karachi water and severage board has been asked to prepare a feasibility report in this regard.

(Dawb, August 23rd, 2003)

☆ صدر پرویز مشرف نے کراچی کے لیے 29 ارب روپے کے ترقیاتی پیکیج کی منظوری دے دی۔ (جنگ، جسارت 26 اگست 2003ء)

Musharaf Okays Rs 29 billions uplift plan for Karachi. City Nazim Naimatullah Khan gave a presentation on the four year package which focused on rebuilding various civic infrastructures. (Dawn, August 26th 2003)

☆ منی ڈزنی لینڈ کے لیے 30 کروڑ پاؤنڈ سرمایہ کاری کی پیشکش، برطانوی وفد کی سٹی ناظم سے ملاقات، ہاکس بے کے قریب تقریباً 500 ایکڑ پر قائم ہوگا۔ (جنگ 13 ستمبر 2003ء)

☆ کراچی کے لیے ایک ہزار تی سی این جی بسوں کے معاہدے پر دستخط، ایس این ایس گلف گروپ پانچ منصوبوں میں بھی معاونت کرے گا۔ (جنگ 24 اکتوبر 2003ء)

☆ بلیک میل نہیں ہوں گے، گوشت فروش ایک مہینے کی ہڑتال کرلیں، کراچی صرف امیروں کا نہیں غریبوں کا شہر بھی ہے، عوامی حقوق کے لیے ہر مافیا سے لڑیں گے۔ (جنگ 7 نومبر 2003ء)

☆ ترقیاتی منصوبے جلد مکمل کرنے کے لیے 3 شفٹوں کا نظام نافذ، FTC، شارع قائدین فلائی اوور سمیت منصوبوں پر 24 گھنٹے کام ہوگا۔ (جنگ 24 نومبر 2003ء)

☆ گرومندر چورنگی کی تعمیر نو، سٹی ناظم نے افتتاح کیا، 13 لاکھ 20 ہزار اسکوائر فٹ کی کارپٹنگ، 4 کروڑ 9 لاکھ روپے لاگت آئے گی۔ (جنگ 3 جنوری 2004ء)

City Nazim Naimatullah Khan on friday inaugurated reconstructed Grumondir Chowrangi, costing Rs 48 million. (Dawn, jan 3rd, 2004)

☆ کراچی پیکیج کے تحت منصوبوں پر تعمیراتی کام کا آغاز ہوگیا، سٹی ناظم، منصوبہ روڈ کی تعمیر

کا افتتاح۔ پہلے فیز میں 3 کروڑ 25 لاکھ روپے لاگت آئے گی۔

(جنگ 4 جنوری 2004ء)

☆ تعمیر کراچی پروگرام کے دوسرے منصوبے، 8000 روڈ کورنگی کی تعمیر نو کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب، سٹی ناظم نے خطاب کیا۔ ہینو چوک قیوم آباد سے داؤد چورنگی تک 13 کلومیٹر طویل سڑک کی تعمیر پر مجموعی طور پر ایک ارب 4 کروڑ روپے خرچ ہوں گے۔

(جنگ جنوری 2004)

The reconstruction of 8000 road, which is 13 km long begining from Hino Chowk of Qayyumabad to Dawood Chowrangi will be completed at a total coast of Rs 1.040 billion. Inaugurated by Naimatullah Khan.

(Dawn, Jan 6th 2004)

Nazim intensifies efforts for devolution of KBCA.

(Dawn, jan 7th 2004)

☆ کارساز روڈ کے تعمیراتی کام کا آغاز، ساڑھے چار کروڑ روپے لاگت آئے گی، ڈھائی کلومیٹر طویل سڑک کو 12 ماہ میں مکمل کیا جائے گا۔ دو انڈر پاس، تین سگنلز اور تین بس اسٹاپ بنائے جائیں گے، سٹی ناظم کا تقریب سنگ بنیاد سے خطاب۔

(جنگ 19 جنوری 2004ء)

☆ سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ کراچی نے خواتین کونسلرز کے فنڈ سے یونیورسٹی روڈ، نیپا چورنگی پر 6 کروڑ 50 لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر ہونے والی ویمن لائبریری کمپلیکس پر ترقیاتی کام شروع کر دیا۔ ناظم کراچی نے سنگ بنیاد رکھا۔ (جنگ 21 جنوری 2004ء)

☆ شاہ فیصل فلائی اوور کا افتتاح، تخمینے سے 8 کروڑ کم اخراجات، مقررہ وقت سے 3 ماہ قبل مکمل، ناظم کراچی نعمت اللہ خان نے پل کا افتتاح کیا۔ (جنگ 22 جنوری 2004ء)

☆ سیاسی مداخلت بڑھ گئی، شہری حکومت کا کوئی اقدام وزارتِ تعلیم کو ختم نہیں ہوتا، نعمت اللہ خان (جنگ۔6مارچ2004ء)

☆ جدید بسوں کے سلسلے میں معاہدے۔ اگلے ماہ100بسیں آ ئیں گی۔

(جنگ۔19مارچ2004ء)

☆ سٹی ناظم نے گلشن اقبال ٹاؤن کا ہنگامی دورہ کیا، معمار آباد میں 8منصوبوں کا افتتاح، 55 لاکھ روپے کی لاگت سے امیر خسرو پارک کی طرز کے ماڈل پارک کی تعمیر کا افتتاح۔

(جنگ۔30مارچ2004ء)

☆ کالا پل تا ڈینو چوک روڈ مقررہ تاریخ سے قبل کم لاگت میں مکمل، سڑک کی لمبائی ساڑھے سات کلومیٹر ہے۔ 91.923 ملین روپے میں مکمل کی گئی جبکہ تخمینہ 108.672 روپے کا لگایا گیا تھا۔ (جنگ۔19اپریل2004ء)

☆ سفاری پارک کا بند ایریا عوام کے لیے کھول دیا جائے گا۔ بند ایریا 250ایکڑ پر مشتمل ہے۔ (جنگ۔11مئی2004ء)

☆ کراچی میں سہراب گوٹھ تا ٹاور لائٹ ٹرین چلانے کا منصوبہ۔ 56 کروڑ 80لاکھ ڈالر خرچ ہوں گے۔ منصوبہ چار سال میں مکمل ہوگا۔ 14اسٹیشن ہوں گے۔ CDGK اور چائنا مشینری اینڈ ایکوپمنٹ گروپ کے درمیان معاہدے پر دستخط۔

(جنگ۔15مئی2004ء)

☆ سٹی ناظم نعمت اللہ خان نے تعمیر کراچی پروگرام کے تحت راشد منہاس روڈ کی تعمیر و ترقی، کشادگی و درستی کے لیے تعمیر کا سنگِ بنیاد رکھا، منصوبے پر 60ملین روپے کی لاگت آئے گی۔ (جنگ۔28مئی2004ء)

The City District Government Karachi has decided to prepare a traffic managment plan for I.I Chundrigar Road, one of the busiest of th city. ("Dawn". May 30th 2004)

فہرست پر جائیے

☆ صبغت اللہ شہید روڈ کا تعمیراتی کام رواں ماہ میں مکمل ہوجائے گا۔ دو کلومیٹر حصے کی کارپیٹنگ مکمل، ساڑھے پانچ کروڑ روپے کی لاگت آئے گی۔ (جنگ۔14 جون 2004ء)

☆ پاکستان کا پہلا سفاری پارک، سفاری ایریا 34 سال بعد عوام کے لیے کھول دیا گیا، علاقہ 250 ایکڑ رقبے پر مشتمل ہے۔ دو قدرتی پہاڑیاں، 60 فٹ گہری جھیل اور 700 جانور ہیں، سٹی ناظم نعمت اللہ خان نے افتتاح کیا۔ (جنگ۔16 جون 2004ء)

Safari area opens for public. The City District Government Karachi will soon induct various species of mamals and birds, which would be brought from several countries, especially from Africa and Srilanka. (Dawn, June 16th, 2004)

☆ گرومندر سے تین ہٹی، جہانگیر روڈ تعمیراتی کام کا آغاز، تین کروڑ 52 لاکھ لاگت کا تخمینہ، سڑک 6 ماہ میں مکمل کی جائے۔ سٹی ناظم نے افتتاح کیا۔

(جنگ۔24 جون 2004ء)

☆ ہاکس بے میں گریکس ولیج سے ساحل سمندر تک سڑک کی تعمیر کا آغاز، سڑک کی تعمیر پر 15 کروڑ روپے لاگت آئے گی۔ 8.5 کلومیٹر طویل ہوگی۔ (جنگ۔26 جون 2004ء)

The City Nazim Naimatullah Khan has urged the Sinth Government to lift the ban on fresh recruitment in government institutions (Dawn, Jun 26th, 2004)

32.67 billions on City Govt, budget approved.

(Dawn, June 27th, 2004)

Nazim seeks devolution of Kutchi Abadis department.

(Dawn, June 28th 2004)

☆ سفاری پارک میں ویٹرنرین کا آغاز، چیئرلفٹ لگانے کا جائزہ۔

(جنگ۔28 جون 2004ء)

☆ سفاری پارک شہریوں کی دلچسپی، بڑی تعداد میں آمد، کوچز ایئر کنڈیشنڈ کرنے کا فیصلہ، 23 دنوں میں 2 لاکھ 32 ہزار افراد نے سفاری کوچ کے ذریعے سفاری ایریا کا دورہ کیا۔ (جنگ 28 جون 2004ء)

The City Government has decided to drastically reduced charges for granting lease in Kutchi Abadis in the metropolis. (Dawn, June 28th, 2004)

☆ گیارہ ٹاؤنز میں ساڑھے سات کروڑ کی لاگت سے ڈھائی ماہ کی قلیل مدت میں ماڈل پارکس تیار، تزئین و آرائش آخری مراحل میں ہے۔ (جنگ 7 اگست 2004ء)

National Park planned for clifton, The City Nazim Naimatullah Khan in a meeting on wednesday decided that Bin Qasim Bagh in Clifton will be developed into a National Park provided with modern facilities. (Dawn, August 19th, 2004)

☆ کراچی کے ہر ٹاؤن میں ماڈل پارک تعمیر کریں گے، میٹروول میں ماڈل پارک کی افتتاحی تقریب سے ناظم کراچی کا خطاب۔ (جنگ اگست 2004ء)

☆ فیڈرل بی ایریا بلاک 14 میں شہر کے دوسرے ماڈل پارک کا افتتاح، رقبہ 82 ہزار 705 مربع فٹ ہے۔ سٹی ناظم نعمت اللہ خان نے افتتاح کیا۔

(جنگ 21 اگست 2004ء)

☆ چارجڈ پارکنگ فوری ختم کی جائے، سٹی کونسل کا مطالبہ۔ (جنگ 22 اگست 2004ء)

City Council seeks ban on charged parking

(Dawn, August 22nd 2004)

About a dozen of model parks are being developed in various town of the city and karachiites will get a model park every week. This was announced by City Nazim

Naimatullah Khan while inaugurating the model park, Bagh-e-Rizwan in Block-14 of Federal B. Area on Friday night. (Dawn, August 22nd, 2004)

☆ شہر میں چارجڈ پارکنگ ختم، ٹھیکیداروں سے معاہدہ منسوخ، پارکنگ فیس وصول کرنے والوں کو گرفتار کیا جائے گا۔ سٹی ناظم (جنگ 27 اگست 2004ء)

☆ ہیراڈائز پوائنٹ پر 70 کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کا کویتی منصوبہ۔ شہریوں کو سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ شجرکاری، ریستوران، سوئمنگ پول، رہائشی کاٹیجز، امیوزمنٹ پارک منصوبے میں شامل ہیں۔ (جنگ یکم ستمبر 2004ء)

☆ کئی سال سے بند کلفٹن مچھلی گھر سٹی حکومت تعمیر کرے گی۔ (جنگ 7 ستمبر 2004ء)

☆ کچی آبادیوں کو مالکانہ حقوق دینے کا فیصلہ۔ (جنگ 8 ستمبر 2004ء)

☆ ناظم آباد میں ماڈل پارک کا افتتاح۔ (جنگ 13 ستمبر 2004ء)

☆ سمندری پانی کو میٹھا کرنے کے لیے امریکی کمپنی ڈی سیلی نیشن پلانٹ لگائے گی۔ منصوبہ بی او ٹی کی بنیاد پر مکمل کیا جائے گا۔ امریکن کمپنی اور سٹی گورنمنٹ آج معاہدے پر دستخط کریں گے۔ (جنگ 12 اکتوبر 2004ء)

☆ ایف ٹی سی فلائی اوور کا افتتاح۔ دسمبر تک 20 نئی سڑکوں کی تعمیر کا آغاز ہوگا، سٹی ناظم۔ (جنگ 13 اکتوبر 2004ء)

☆ 278 کچی آبادیوں کی لیز کا کام شروع۔ فارم کی تقسیم کا آغاز۔

(جنگ 18 اکتوبر 2004)

☆ کچی آبادیوں کا وعدہ پورا کردیا، اورنگی ٹاؤن میں لیز کیمپ کا افتتاح، سٹی ناظم کا خطاب۔ (جنگ 21 اکتوبر 2004)

☆ ماس ٹرانزٹ پروگرام 6 ماہ میں مکمل ہوگا۔ 7 پارٹیوں کی دلچسپی۔ 87 کلومیٹر طویل ریل کی پٹری بچھانے کا منصوبہ۔ (جنگ 25 اکتوبر 2004ء)

☆ نعمت اللہ خان کی کوششوں سے کراچی چڑیا گھر میں 28 جانوروں اور پرندوں کا اضافہ۔ (جنگ 14 نومبر 2004ء)

☆ کراچی کے پہلے انٹر سٹی بس ٹرمینل کا سنگ بنیاد سٹی ناظم نے رکھا۔ منصوبے پر 39.40 ملین روپے کی لاگت آئے گی۔ (جنگ 14 نومبر 2004ء)

☆ غیر ملکی دوروں پر شہری یا صوبائی حکومت کا ایک روپیہ خرچ نہیں کیا۔ سٹی ناظم

(جنگ 19 نومبر 2004ء)

☆ سٹی گورنمنٹ کے تحت کورنگی میں ساتویں ماڈل پارک کا افتتاح۔ (جنگ 27 نومبر 2004ء)

☆ گرومندر تا ناظم آباد روڈ کا افتتاح۔ (جنگ 2 دسمبر 2004ء)

☆ نیشنل ہائی وے پر دوسرے انٹر سٹی بس ٹرمینل کا سنگ بنیاد (جنگ 3 دسمبر 2004ء)

☆ نعمت اللہ خان نے غریب آباد انڈر پاس کا سنگ بنیاد رکھ دیا۔ (جسارت 8 دسمبر 2004ء)

☆ لانڈھی ٹاؤن میں آٹھویں ماڈل پارک کا افتتاح۔ (جنگ 9 دسمبر 2004ء)

☆ گلشن اقبال میں پیڈسٹرین برج کا افتتاح۔ (جنگ 17 دسمبر 2004ء)

☆ کراچی کے لیے نعمت اللہ خان کا کردار قابل تعریف ہے۔ صدر پرویز مشرف

(جنگ 18 دسمبر 2004ء)

☆ ملیر میں نویں ماڈل پارک کا افتتاح۔ (جنگ 20 دسمبر 2004ء)

☆ ناظم آباد میں دسویں ماڈل پارک کا افتتاح۔ (جنگ 10 جنوری 2005)

☆ سرجانی ٹاؤن میں بس ٹرمینل کا سنگ بنیاد۔ (جنگ 14 جنوری 2005ء)

☆ امریکی وفد سے ملاقات، کچرے سے بجلی بنانے کے منصوبے پر گفتگو۔

(جنگ 2 فروری 2005ء)

☆ کراچی کے پہلے انڈر پاس کی تعمیر پر پیر سے کام شروع ہوگا۔6 ماہ میں مکمل کرنے کا ہدف۔(جنگ 5 مارچ 2005ء)

☆ شہری حکومت کا KMC مارکیٹوں کی حالت بہتر بنانے کا فیصلہ۔(جنگ 6 مارچ 2005ء)

☆ سٹی ناظم کے اصرار پر سرکلر ریلوے بحال کی جارہی ہے، شمیم حیدر، وفاقی وزیر ریلوے کی پریس کانفرنس۔(جنگ 8 مارچ 2005ء)

☆ اصل چیلنج سرکلر ریلوے کی مکمل بحالی ہے، سٹی ناظم (جنگ 10 مارچ 2005ء)

☆ مثالی ترقیاتی کاموں سے کراچی کا نقشہ بدل رہا ہے، طارق حسن

(جنگ 30 مارچ 2005ء)

☆ سمندری پانی کو میٹھا بنانے کے لیے مزید پلانٹ لگائے جائیں گے، سٹی ناظم۔

(جنگ 2 اپریل 2005ء)

☆ شہری حکومت نے ریکارڈ ترقیاتی کام کر کے مثال قائم کی ہے۔نعمت اللہ خان کی کارکردگی شاندار ہے، منفی رویہ ترک کیا جائے، معین حیدر (جسارت 21 مئی 2005ء)

☆ عزیز بھٹی پارک کی از سر نو تعمیر کا سنگ بنیاد (جنگ 24 مئی 2005ء)

☆ ادارہ امراض قلب کراچی کا افتتاح، نوے لاکھ شہریوں کو فائدہ پہنچے گا، صرف 60 روپے کی پرچی سے مریض اپنا معائنہ کرا سکے گا۔سٹی ناظم (جنگ 5 جون 2005ء)

☆ مقامی حکومتوں کے نمائندوں کی کوششوں سے شہر کا نقشہ تبدیل ہوگیا، ملیر ندی پل کے افتتاح پر سٹی ناظم کا خطاب۔(جنگ 6 جون 2005ء)

اس کتاب میں جو بھی مواد شامل کیا گیا ہے، وہ نعمت اللہ خان صاحب کے کچھ انٹرویوز سے منتخب کیا گیا ہے اس لیے ممکن ہے کہ قارئین کو مضامین کی ترتیب عام ڈگر سے ہٹ کر محسوس ہو۔ پوری کوشش کی گئی ہے کہ مستند اور مصدقہ معلومات و واقعات ہی کو کتاب کا حصہ بنایا جائے، اس کے باوجود انسانی کاوش میں غلطی کا احتمال ہو سکتا ہے۔ اگر دورانِ مطالعہ کسی جگہ آپ کو کوئی غلطی نظر آئے تو براہ کرم ای میل کے ذریعے رابطہ کر کے ضرور نشاندہی کیجیے۔ اگر نعمت اللہ خان صاحب یا جماعت اسلامی کے حوالے سے کوئی یادگار تصویر آپ کے پاس ہو تو وہ بھی اسکین کر کے ای میل کیجیے۔ ہم ویب سائٹ میں اس تصویر کو شامل کریں گے۔ جزاک اللہ

ڈاکٹر فیاض عالم

drfaiyaz66@yahoo.com